

سیدک

مختار معنی



سیدک مختار معنی



# لبیک

ممتاز مفتی

مشاق بگ کارنر

الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور



سید کا

تعمیرات

۱۹۹۸ء

مشاق احمدی نے  
اسلم عصمت پرنٹرز  
سے چھپوا کر شائع کی  
قیمت / 250

انڈیا کی سب سے بڑی  
www.rahulbooks.com



ترتیب

15

18

ساتھ لے جانے والے

ڈاکٹر عفت

اور

قدرت اللہ شہاب

کے نام

32



میں وی جانل ڈھوک را بنھن دی نل میرے کوئی چلے

شاہ حسین رحمہ اللہ



## ترتیب

15	معذرت	کے اور بے
18	بن مانگے	نیت قارن
	فوراہ چوک کامست	وی آئی پی لاؤنج
45	خواب ہی خواب	<u>جدہ</u>
	میاں صاحب	زائرین اور طیارہ
	ریچول	ہائی جیک
	بھس میں آگ	سالک اور مجذوب
	آیات ہی آیات	جدہ ایئر پورٹ
	پہلاج	سامان سلمان سامان
	ایسگن روڈ کامست	جدہ حاجی کیمپ
	اللہ اور عبد	معلم
32	<u>مانگے ملے نہ بھیک</u>	ہنی مون کمرہ
	شنا	خلی صحن
	قدرت کا تباہ	بازار
	حج کی غرض	کوئلہ سنٹروالابا
	امید و بیم	<u>مکہ روڈ</u>
	فائل لسٹ	56
	ایڈووکیٹ صاحب	ڈبے ہی ڈبے
	ایس اور ونڈر لینڈ	آخری دن
	تیاری	لک اور سی
	پروگرام	کتے اور قافلے
		روانگی



مہمان ذائر

خاور

سرراہ ہوٹل

انہیں کتنا دکھ ہوتا

چور اور گھنڑی

موت

ایٹم بم

مطاف

98

سنگ اسود

دل چھوٹا

رکلوٹیں

پراسرار بندے

عظیم

بدلو

اپنا اپنا مقام

انوکھی کرم نوازی

حرم

بے نیاز فقیر

اسلام کو خطرہ

اللہ اور بندے

میزاب رحمت

ذائر سوداگر

توہم پرستی

تاجری تاجر

ذائرین اور حج

114

توحید پرست اور بت پرست

کھڑکیاں اور درتپے

پالتو شکایات

68

مکہ معظمہ

قصبہ

فندق الکلی

انگریزی کی بو

حرم

خانہ خدا

طواف

مسجد الحرام

کالا کوٹھا

قبولیت کا خطرہ

اب بولو

اذان

نماز

عبدہ

صرف حضوری

انوکھا پیسوی

الیس کے دانت

گنگا جمنی

انجائینا

ڈاکٹر عفت



بند کمر

کردہ اور ناکردہ گناہ

شکوہ و شبہات

نمناک حیرت

ہاتھ اور سلیم کی ماں

ابوالاثر اور بیت

خارجی اور داخلی

نورانی بڑھا

صدر ایوب

ہائی لیول کانفرنس

منی

انوکھا سفر

الف لیوی شہر

خیمہ ہونٹل

بے نام آزدگی

عظیم بیگانگی

پتھر اور چور چور

پراسرار شخصیت

لاٹھی لور اندھا

”میں میں“

خیمے

لڑائی جھگڑے

بڑے میاں

دوسو سو کا شہر

رستہ بھول

## میدانِ عرفات

143

طلب اور یافت

جوار بھانا

خلی قیام

پھول چتریاں

جان کین

پرہیزت انبوه

رنگ رنگ

روپ. سروپ

زار و کانداز

جبل الرحمت

سفید پتھر

بجدہ سو

امر کی زبیر

وقوف

سیاہ و سفید

## جمرة الباطنیہ

156

وقوف اور خروج

تعبیل

مزولفہ

کنکریاں

رجعت

چھوٹی اور چھوٹی

جان محمدت



واپسی

دعا

باقی تو جانے

شیخ سعدی

صح فری کو نسی

انتقامی غیظ و غضب

جرمۃ العقب

میری طرف دیکھو

## بال جنجال

کیرا اور دل

لنگوٹی

اہتمام

سائیں حلوہ

بند و بستی قافلے

تلذز کا اڑدہا

بلے بلے بلے

شبلی بی کام

سوچ اور کیفیت

دہکا کوئلہ

تواتر

سیون

”پاگل ای اوئے“

## طواف و وداع

احساس مفارقت

173

جب اور اب

افرقی قافلہ

لت پت

مکان اور مکین

عکس مفتی اور پراگ

فالتو ہستی

مناقت منافت منافت

ثواب کی گٹھڑیاں

میں کون ہوں؟

رخ

حاجی صاحب

بیعت

رکلوئیں، رحمتیں

محاصرہ

## مدینہ روڈ

اللہ اور محمدؐ

عظیم ترین انسان

بشیر خالد

پاکستان

اونے غلام

بھیڑوں کار کھوالا

عالم

حمیدہ کور

ترخیص ہی ترخیص

سکر اور صحو

185

198



جنات کا مسکن

شمساری

شہداء بدر

سچا منگتا  
دھنکی

سب سے بڑا انسان اور سول اللہ

بے نیازی اور شور اشوری

سنہراموقع

شی

آداب عالیہ

210

تبرکات مدینہ

مدینہ

بازار

ایٹنی آنکھیں

چیزیں ہی چیزیں

خریداری ہی خریدار

تبرکات مدینہ

سبز جنگلے کی سلاخیں

خاک پاک

جذبہ انتقام

روشن منگے

مسجد نبوی

باادب با ملاحظہ ہوشیار

مرد قدیم

مخافظین حرم

قانون اور رحمت

پاپوش بابا

عرب سردار

آزردگی

کرم ہی کرم

نچڑتارس گلا

رد عمل

مناسب نامناسب

آداب حاضری

خوشبو

مراقبہ

مینار عظیم

جنسبے دی بوٹی

219

حجرہ مبارک

باب جبرئیل

جذبہ جنون

مٹی کا پہلوان

بدھ اور نروان

اجلے اور میلے

وہ سلام

دعا

مانگنے والادینے والا

غلام دین وانی

235

252



سفارت پاکستان  
علما کا وفد

عام حاضری خاص حاضری  
”تل مرے کوئی چلے“

قدرت کی واپسی

درویشوں کا شہر

ان دیکھا شہر

مانگنا، قبول کرنا

واپسی

اکیلا

طلب اور منزل

خوشنودی

چالیس نمازیں

اجازت رخصت

ریورس گیر

اشیاء کا بیچ

لذت خریداری

نماز

آوارگی

سفارت پاکستان

وداع

سفارش خروج

بگوڑا

جناب عالی جناب عالی

صحرانوردی

فون نمبر

سفیر صاحب

میری طرف دیکھو!!

281

مسافر خانہ

کارواں سرائے

کھانا

پاکستانی زائرین

فرد واحد

لوٹ کامل

ستر لاکھ نمازیں

یا حاجی یا حاجی

مستند حاجی

خروج

ہٹ جاؤ

290

خروج

سندھیاں ہی سندھیاں

گلیوں اور باشتیہ۔۔۔

گوریاں

عرب میم

خیر اور شر

وہ خاموشی یہ خاموشی

منوجی مہاراج

دھند لکا

263

273



روشنی کی کرن

سوتا جاتا

سونا ہی سونا

بیشٹ

300

جستھوں وی کھوتی

کوے اور ہنس راج

منکر

حاجی سیشل

جذبے کی راب

جیسے گئے ویسے لوٹے

وہی ممتاز مفتی

نہیں نہیں

تعارف

306

نزیر احمد

306

ذوالفقار احمد تابش

313



## معذرت

یہ رپورٹ تاڑ سیارہ ڈائجسٹ میں سولہ قسطوں میں چھپ چکا ہے۔ اب میں اسے ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں نے ۱۹۶۸ء کے حج میں حاضری دی تھی۔ حج سے واپسی کے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ حج بیت اللہ پر کچھ لکھوں لیکن جرات نہ پڑی۔ خیال آیا کہ اس مقدس موضوع پر میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ قلب میں گرمی نہیں، دل میں روشنی نہیں، دین سے واقفیت نہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ نہ لکھوں گا لیکن ہونی ہو کر رہی۔

قاسم محمود سے وعدہ ایفا کرنے کے لیے اور کوئی موضوع ذہن میں نہ آیا اور میں نے سوچے سمجھے بغیر بیت اللہ پر لکھنا شروع کر دیا۔ خیال تھا، سرسری طور پر دو تین قسطیں لکھ دوں گا ادھر ادھر کی فروری باتیں کروں گا جنہیں اللہ اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو اور پھر ختم کر دوں گا۔ لیکن جب رپورٹ تاڑ خانہ خدا کے حضور پہنچا تو میرے اللہ نے مجھے پکڑ لیا۔ ”اب ہمارے حضور پہنچ کر تو جاتا کہاں ہے۔“ پھر مجھے پتہ نہیں کیا ہوا۔ لکھتا گیا، لکھتا گیا، لکھتا ہی چلا گیا۔

وہ تو شکر ہے اسلام کے اجارہ داروں نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ ”ابے او، ہم سے پوچھے بغیر اس مقدس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے۔ تیری یہ جرات!“ اس پر میں نے



اپنا ہاتھ روک لیا۔ ورنہ شاید سولہ کی بجائے بیس قسطیں لکھ جاتا۔  
حیرت کی بات ہے کہ اس رپورٹ تاڑ کو اتنے سارے لوگوں نے پسند کیا ہے۔  
میرا خیال تھا کہ میں ذات کے جیسے سے دیکھ رہا ہوں اور میری ذات اس قدر کثیف ہے  
کہ قاری بور ہوں گے۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اتنے سارے لوگ میرے  
نقطہ نظر سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ یہ بھی میرے اللہ کا کرم ہے کہ اس نے میری تحریر کو  
تاڑ بخشا۔

میرے اللہ مجھ پر ہمیشہ کرم فرمائی کرتے رہے ہیں۔ ان دنوں بھی جب میں ان  
کے وجود سے منکر تھا۔ ان دنوں بھی جب میں انہیں شک و شبہات کی نظر سے دیکھتا تھا۔  
ان دنوں بھی جب میں سمجھتا تھا کہ اگر خدا کا وجود نہ ہوتا تو بھی ہم اپنی آسائش کے لیے  
ایک خدا تخلیق کر لیتے۔ اور اب بھی جب میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے لیے جیتے  
ہیں، میرے فکر میں گھلے جا رہے ہیں، مجھے تکلیف نہ ہو۔ میری ضروریات پوری ہوتی  
رہیں، میرا رخ سیدھا رہے، میری بد اعمالیاں میری ذہنیت کو داغدار نہ کریں۔ میرے  
دل کا سوتا سوکھ نہ جائے۔

جب آقا اس قدر مہربان ہو تو بندہ فرط محبت سے سرشار ہو کر لاڈ کرنے لگتا  
ہے۔ اس رپورٹ تاڑ میں میں نے بھی جگہ جگہ لاڈ کیے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی کی دل  
آزاہی ہوئی ہو تو میں معافی کا خواستگار ہوں۔

کچھ لوگوں کو شکایت ہے کہ اس مضمون میں میں نے قدرت اللہ شہاب کو بڑھا  
چڑھا کر پیش کیا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ رپورٹ تاڑ لکھتے ہوئے میری سب سے بڑی  
مشکل قدرت کے متعلق حقائق کو حذف کرنا تھا۔ اگر یہ مشکل میری راہ کی دیوار نہ  
ہوتی تو عرصہ دراز سے ”علی پور کا ایلی“ کا دوسرا حصہ ”ایلی اور الکھ نگری“ شائع ہو  
چکی ہوتی۔

نعمانہ سہیل اور نیر باب کی فرمائش پر میں نے اس رپورٹ تاڑ میں چند باب کا  
اضافہ کر دیا ہے۔ ابتداء میں میں نے دو تعارف شامل کیے ہیں۔ نذیر احمد کا جو مغزی  
مغزی ہیں، تابش کا جو دل ہی دل ہیں۔

آخر میں سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر اعلیٰ سید قاسم محمود کا مضمون شامل ہے جس  
میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ رپورٹ تاڑ چھپنے کے دوران ان پر کیا جاتی، کیسے کیسے خط



موصول ہوئے۔ کیا کیا رد عمل ہوئے کتنے کانٹے چبے، کتنے پھول برسے۔  
 اس رپورٹ تاڑ کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں۔ نہ ہی دینی مسائل پر بحث  
 کرنا ہے۔ نہ دینی مسائل پر کوئی نیا نظریہ پیش کرنا ہے۔ یہ رپورٹ تاڑ تو ایک انجان  
 جاہل مگر قلم زائر کی آپ جتی ہے۔

ممتاز مفتی

۵۱۳۔ ایف ۱/۲۔ اسلام آباد

۸ فروری ۱۹۷۸ء



## بن مانگے

میرے دل میں حج کرنے کی خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ پھر عجیب حالات رونما ہوئے۔

### فوارہ چوک کامست

ایک شام میں پنڈی فوارہ چوک سے گزر رہا تھا۔ اس وقت بجلی فیل ہونے کی وجہ سے چوک میں خاصہ اندھیرا تھا۔ حسب دستور آنے جانے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں بیچ کر ایک طرف چل رہا تھا کہ دفعتاً "ایک سیاہ قام جسم میرے سامنے ابھرا" چہرہ بھیانک تھا، بال بکھرے ہوئے، آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، پھر خوشی سے چلا کر بولا "توج پر جائے گا۔ توج پر جائے گا۔ سنا تو نے۔"

وہ مست تھا، میں سمجھا فقیر ہے۔ میں نے جیب سے چوٹی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی اور چل پڑا۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا، ہاتھ کھولا۔ چوٹی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی وہ ریزگاری سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے ساری ریزگاری مجھے تھما دی۔ "رکھ لے رکھ لے" وہ بولا "تجھے حج پر جو جانا ہے، تجھے پیسے چاہیں، رکھ لے رکھ لے۔"

اس روز گھر پہنچ کر میں سوچتا رہا۔

اگر وہ چوٹی واپس نہ کرتا اور اتنی ساری ریزگاری میرے ہاتھ میں نہ تھما دیتا تو اس واقعہ کو میں چنداں اہمیت نہ دیتا۔ لیکن ان کوائف نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔



چار ایک دن میں سوچتا رہا۔ وہ کون تھا؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے مجھے پیسے کیوں دیے، حج کی بات کی طرف میری توجہ منعطف نہ ہوئی۔ اس کی حیثیت ضمنی رہی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اتنی بھیڑ میں اس نے مجھے کیوں روکا۔ خیرات کیوں نہ لی۔ مجھے پیسے کیوں دیے چار ایک دن میں سوچتا رہا، پھر بات ذہن سے نکل گئی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پنڈی میں پبلک ریلیشنز کے دفتر میں ملازم تھا ذہنی طور پر میں ایمان اور شکوک کے درمیان میں لٹکا ہوا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ماننے کے لیے جاننا ضروری ہے۔

زندگی کے پچاس سال میں نے جاننے کے چکر میں گنوا دیے تھے۔ ان دنوں میں پکا دانشور تھا نہ خدا کو ماننا تھا نہ اسلام کو۔ اپنے مذہب پر شرمندہ تھا۔

۱۹۵۵ء میں مری کے خواجہ جان محمد بٹ نے مجھ پر رقت طاری کر دی۔ دس دن میں دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ حیران تھا کہ یہ کیا ہوا۔

عقل پر بھروسہ ٹوٹ گیا۔ نہ گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا دو مہینے گزر گئے۔

## خواب ہی خواب

پھر۔۔۔۔۔ ایک رات مجھے حج کا خواب آیا۔ میں اپنے خواب لکھ لیا کرتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے یہ گمان ہے کہ خواب پیغامات کے حامل ہوتے ہیں یا مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ میں نفس لاشعور میں دلچسپی رکھتا ہوں۔

خواب میں میں نے دیکھا کہ میرے چچا مرحوم تشریف لائے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں دو سوٹ کیس ہیں۔ بغل میں ایک لمبا لٹافہ دبا رکھا ہے۔ بولے ”یہ لویہ رہا تمہارا سامان۔“ اور پھر لٹافہ کھول کر اس میں سے ایک سلپ نکالی۔ ”اور یہ رہی تمہاری نکت۔“

”کیسی نکت؟“ میں نے پوچھا۔

بولے ”بھئی تم حج پر جو جا رہے ہو۔“

یہ خواب اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھا تھا۔

نوجوانی میں مجھے خواب نہیں آتے تھے۔ آتے بھی تو بے ربط اور ڈراؤنے جو صبح کو یاد نہ رہتے۔ ان دنوں صرف ایک بار ربط خواب آیا تھا جس سے میں اچھی طرح



مانوس تھا۔ جسے انگریزی میں Night Mare کہتے ہیں۔ ڈراؤنی بڑھیا میرے پیچھے بھاگتی، مجھے پکڑ لیتی، پھر وہ میری چھاتی پر چڑھ کر بیٹھ جاتی، ڈر کے مارے میں چیخا۔۔۔۔۔ اور میری آنکھ کھل جاتی۔

۔ اوجیز عمر میں بڑھیا سے تو پھٹکارا مل گیا۔ لیکن خوابوں میں بے ریلٹی، افزائی تفری، دوڑ دھوپ، خوف و ہراس قائم رہے۔ اس خواب سے متعلق تین باتیں عجیب تھیں۔ پہلی یہ کہ ایسا بار بار اور صاف خواب میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دوسری یہ کہ حج کی بات کبھی میرے نفس شاعر یا غیر شاعر میں نہ آئی تھی۔ پھر اس کے متعلق خواب دیکھنا حیران کن بات تھی۔

تیسری یہ کہ حج کی بات اور چچا کی زبانی۔ دونوں باتیں ہی ناقابل یقین تھیں۔ چونکہ میری طرح چچا مرحوم بھی اللہ تعالیٰ کو صرف منہ زبانی مانتے تھے اور ارکان اسلام سے ناواقف تھے۔

یہ خواب دیکھ کر اب کی بار میری تمام تر توجہ حج پر مرکوز ہو گئی۔ کئی ایک دن میں سوچتا رہا۔ مجھے حج کی خبر کیوں سنائی جا رہی ہے۔ حج کے متعلق مجھے کچھ علم نہ تھا۔ نہ ہی میں اسے اہمیت دیتا تھا۔

ان دنوں میری زندگی میں دو غیر از معمول واقعات ہو رہے تھے۔ ایک تو مسلسل صبح کے خواب آرہے تھے۔ دوسری میری بائیں آنکھ مسلسل پھڑک رہی تھی۔ اس پھڑک میں ایک تو تسلسل تھا، دوسرے شدت تھی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ میری بیوی کہنے لگی: سیانے کہتے ہیں بائیں آنکھ پھڑکے تو یہ خوش بختی کا نشان ہے۔ ضرور کوئی اچھی بات ہونے والی ہے۔

لیکن اس پھڑکن میں روز بروز شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی جو خاصی پریشان کن تھی۔ میں نے ڈاکٹر کی دوا استعمال کی، حکیم کی دوا کھائی۔ لوک دوا آزمائی۔ آنکھ پر سیندھو رکھا لیکن آفاقہ نہ ہوا۔

گھبرا کر میں نے خواجہ جان محمد بٹ سے پوچھا۔ ہم سب انہیں بھائی جان کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ چونکہ نقش بند یہ سلسلے میں ہی مروج ہے میں نے کہا بھائی جان یہ کیا مصیبت ہے۔

وہ مسکرائے بولے: مصیبت نہیں، آپ کو آنے والی خوش نصیبی کا پیغام



دیا جا رہا ہے۔“

”یہ اچھا خوش نصیبی کا پیغام ہے۔“ میں نے سوچا۔ ”میں تو اس پھڑکن کی وجہ سے ”نہرا“ ہوا جا رہا ہوں۔

پھر میرا ہاتھ لہ کراچی ہو گیا۔

کراچی میں دو ایک مہینے میں آوارہ گھومتا رہا اس دوران وہ خواب بھی آتا بند ہو گئے اور آنکھ کی پھڑکن بھی جاری نہ رہی۔

اس دوران میں چار ایک بار قدرت اللہ شہاب سے ملا۔ ان دنوں قدرت اللہ شہاب صدر پاکستان کے سیکرٹری تھے۔ قدرت اللہ شہاب احمد کا دوست تھا۔ اشفاق نے مجھے بار بار تاکید کی قدرت اللہ سے ملنے رہنا۔ میں نے کہا ”بھائی میرے! وہ ایک بڑا آدمی ہے میرا بڑے آدمی سے کیا واسطہ۔“

اس کے باوجود اشفاق احمد کی وجہ سے مجھے چار ایک بار اس سے ملنا پڑا۔ اس دوران میں نے جانا کہ قدرت اللہ ایک گونگا آدمی ہے۔ بہت کم بولتا ہے لیکن اس میں بلا کا لہر ہے۔

اس کے باوجود قدرت اللہ نے از خود میری پیفکیشن میں مدد کرنا شروع کر دی۔ دو ایک افسروں سے میری سفارش بھی کی۔ یوں ہمارے مراسم پیدا ہو گئے۔

میاں صاحب

پھر ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ میرے دل میں حج کے مفہوم کی آگاہی حاصل کرنے کے لیے جنس پیدا ہو گیا۔

ایک روز قدرت اللہ نے مجھے فون کیا۔ بولے ”جب آپ دفتر آئیں تو راتے میں AI۔ کارڈن ایسٹ (Garden East) ہوتے آئیں۔ وہاں ایک صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں ”میاں صاحب۔ ان سے ملیں کہیں میں نے بھیجا ہے۔ پوچھیں“ فرمائیے آپ چاہتے کیا ہیں؟

بسیار تلاش کے بعد مجھے کارڈن ایسٹ کا وہ مکان ملا جس میں میاں صاحب مقیم تھے۔



میں نے صاحب خانہ سے میاں صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے  
لمحہ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ایک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا جس میں ایک طرف چارپائی پھٹی ہوئی تھی۔  
دوسری طرف جاء نماز پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی عبادت میں مصروف تھا۔  
میں نے جھک کر سلام کیا۔

میاں صاحب بڑے اخلاق سے ملے۔ میں نے اپنا مقصد بیان کیا۔ میں نے کہا  
مجھے قدرت اللہ شہاب نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ آپ چاہتے  
کیا ہیں؟

کچھ دیر کے لیے میاں صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ ان کے بشرے سے  
سنجیدگی اور وقار کا اظہار ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود انداز میں شدت کا اضطراب تھا  
جسے وہ دبانی کی شدید کوشش کر رہے تھے۔

میری بات سن کر وہ یوں پھوٹ بے جیسے کچا انڈا اٹھو کر لگنے سے پھوٹ بہتا  
ہے۔

”کچھ نہیں چاہیے۔“ میاں صاحب نے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں چاہیے۔ اللہ  
کا دیا سب کچھ ہے، کون سی نعمت ہے جس سے انہوں نے اپنے غلام کو نہیں نوازا۔ ان  
سے کہتے کہ بس اتنی گزارش ہے کہ ہمیں حج پر بھجوادیں۔“

حج کی بات کرتے ہی ان کا پروقار چہرہ مسخ ہو گیا۔ بزرگی اور وقار پارہ پارہ  
ہو کر رہ گئے۔ ان پر منت سماجت، بے بسی اور بے چارگی طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے  
آنسو جاری ہو گئے۔ روتے روتے وہ چلائے ”وقت بیت نہ جائے۔ ہمارے پاس پیسہ  
ہے، کرایہ ہے اللہ کا دیا سبھی کچھ ہے۔ صرف وقت نہیں۔ بس ہمیں حج پر بھجوا  
دیں۔“

وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ روتے روتے ان کی گھٹکی بندھ  
گئی۔

ان دنوں بہت قلیل تعداد میں لوگوں کو حج پر جانے کے اجازت نامے جاری  
ہوتے تھے۔

اس لیے صدر پاکستان کے نام بہت سی درخواستیں موصول ہوتی تھیں کہ



ہمیں حج پر جانے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ یہ درخواستیں بڑی جذباتی ہوتی تھیں۔ منتوں، سماجوں اور لجاجتوں سے بھری ہوتی تھیں، صدر پاکستان بڑی سنجیدہ اور عقلمند طبیعت کے مالک تھے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ حج کے لیے اس قدر جذباتی کیوں ہو رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ قوم کو جذباتی ہونے سے احتراز کرنا چاہیے۔

میاں صاحب سے ملنے کے بعد میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”یہ حج کیا چیز ہے؟“ میں نے قدرت اللہ سے پوچھا۔

انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: حج اسلام کا ایک رکن ہے۔ ”رکن تو ہے پر یہ کیسا رکن ہے جس کے لیے ایک معزز باوقار بزرگ یوں بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا“ جیسے حج چوسنے والی مٹھائی ہو۔“

ریچول

”حج ایک Ritual ہے“ قدرت نے سنجیدگی سے کہا۔

تقسیم کے فوراً بعد مشہور ڈائریکٹر مسعود پرویز نے مجھ سے کہا ”مفتی صاحب اگر آپ ایک ایسی فلمی کہانی لکھ دیں جس میں دور جہالت کے قدیم عرب قبیلوں کی زندگی کی تصویر ہو۔ عربوں کی بت پرستی، شراب نوشی، زنا کاری، بے حیائی اور عیاشی دکھانے کے بعد وفتنا“ جہالت کے بادل چھٹ جائیں اور سورج نکل آئے اور محمدؐ کی عظیم شخصیت کے اثرات عربوں کی کایا پلٹ دیں۔“

مسعود پرویز کے خیال نے مجھے مسحور کر دیا۔ فلم لکھنے کے لیے میں نے مکے کی تاریخ کا مطالعہ شروع کر دیا۔

تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ حج کے کوائف بالکل وہی ہیں جو زمانہ جہالت میں مکے کے بنگلے میں سالانہ اجتماع پر ادا کیے جاتے تھے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ جب لات منات کا طواف ہوتا تھا تو زائرین ننگے ہوتے تھے۔ ہاتھوں میں شراب کے پیالے ہوتے تھے اور بظلوں میں محبوبائیں ہوتی تھیں۔ لیکن اب زائرین کے جسم ملبوس ہوتے ہیں۔ دلوں میں پاکیزہ جذبات کی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ ہونٹوں پر اللہ کی حمد و ثناء کے جام ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ مسجد الحرام میں عورتوں اور مردوں دونوں کی بھیڑ ہوتی ہے لیکن وہاں



نہ کوئی عورت ہوتی ہے نہ مرد ہوتا ہے۔

”کیا یہ حج ہے؟“ میں نے قدرت اللہ سے پوچھا۔

”ہاں“ وہ بولے ”تقریباً“

اگر حج وہی پر Ritual تو پھر میاں صاحب مجھے معزز لوگ اس کے لیے

کیوں منہ پھاڑ پھاڑ کر روتے ہیں۔

”پتہ نہیں“ قدرت اللہ نے کہا۔

قدرت اللہ ایک ایسے ننگ منہ کا مرجان ہے اور اس نے الزاماً اپنے علم

اور مشاہدے کے پانی کی سطح اتنی نیچی رکھی ہوئی ہے کہ اس سے استفادہ کے لیے مرجان

میں بہت سے پتھر پھینکنے پڑتے ہیں جب کہیں جا کر طالب کی چونچ ہری ہوتی ہے۔ اس

قدر ہری نہیں کہ پیاس مٹ جائے بلکہ اس قدر ہری کی شکل اور بوہ جائے۔

قدرت کا روکھا جواب سن کر مجھ میں مزید پتھر مارنے کی ہمت نہ ہوئی۔ میں

نے سوچا اتنی ہمت کون کرے اور اگر حج کے کوائف کے حلق پتہ چل بھی جائے تو کیا

فرق پڑے گا۔

اس کے بعد پاکستان کا دار الخلافہ کراچی سے پنڈی نخل ہو گیا۔ قدرت اللہ

راولپنڈی آگیا اور میں اکیلا کراچی رہ گیا۔

ابھی میں اسی نخل و بیچ میں پڑا تھا کہ ایک روز دفتر میں وقتی وزیر اطلاعات آ

گئے، میری طبیعت ہو گئی۔ حاضر ہوا تو انہوں نے کہا آپ فوراً راولپنڈی چلے جائیں اور

صدر گھر میں، سیکرٹری لوپ پینڈنٹ کو رپورٹ کریں۔ پنڈی پہنچا تو قدرت اللہ نے کہا

آپ اپنی جائینگ رپورٹ دے دیں آپ یہاں او ایس ڈی کی حیثیت سے کام کریں

گے۔

یوں میں قدرت اللہ شہاب کا ماتحت بن گیا۔

بھس میں آگ

پھر چند ایک ماہ کے بعد گویا بھس میں آگ لگ گئی۔ پھر سے حج کے خوابوں کا

تانتا بندہ گیا۔

میں کہیں جانے کے لیے سامان ہاندہ رہا ہوں، کوئی پوچھتا ہے کہاں جا رہے



ہو؟ پھر اس کے کہ میں جواب دوں 'آواز آتی ہے' یہ حج پر جا رہے ہیں۔  
 میں بس میں بیٹھ جاتا ہوں۔ بس چل پڑتی ہے۔ کنڈیکٹر گلٹ دینے آتا ہے۔  
 "میں ملتان جاؤں گا۔" میں اس سے کہتا ہوں۔ کبھی مسافر حیرانی سے میری طرف دیکھتے  
 ہیں اور یک زبان ہو کر چلاتے ہیں: "یہ بس تو صبح کو جا رہی ہے۔" "مگر میں تو  
 ملتان۔۔۔۔۔ روکو روکو میں چلاتا ہوں" کنڈیکٹر نفی میں سر ہلاتا ہے۔ یہ بس رکے گی  
 نہیں۔

ایک بڑھیا آتی ہے، میرے ہاتھ پر اٹھنی رکھ دیتی ہے۔ کہتی ہے: "اس کا  
 گیوں خریدنا اور کبوتروں کو ڈالنا میری طرف سے۔"  
 "کون سے کبوتر" میں پوچھتا ہوں۔  
 "اے روضہ پاک کے اور کون سے۔"  
 یہ خوابوں کا سلسلہ تین مہینے تک جاری رہا۔ حتیٰ کہ میں بو کھلا گیا۔

### آیات ہی آیات

پھر ایک روز راولپنڈی صدر میں بک سٹور سے گزر رہا تھا کہ سامنے ایک  
 کتاب نظر پڑی، جس پر جلی قلم سے لکھا تھا: "حج بیت اللہ۔"  
 میں نے وہ کتاب خرید لی اور گھر جا کر اسے پڑھنے لگا۔ کتاب پڑھ کر میں بے  
 حد مایوس ہوا۔

کتاب کا لب لباب یہ تھا کہ حج کی نیت کرتے وقت فلاں آیت پڑھو۔ احرام  
 باندھنے وقت فلاں آیت پڑھو۔ روانہ ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔ سر زمین پاک کو  
 پہلی بار دیکھو فلاں آیت پڑھو۔ مکہ شریف میں داخل ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔  
 مسجد الحرام میں داخل ہوتے وقت فلاں آیت پڑھو۔ خانہ خدا پر نگاہ پڑے تو فلاں آیت  
 پڑھو۔

ارے تو حج مسلسل آیتیں پڑھنے کا نام ہے لیکن اتنی ساری آیات زبانی تو یاد  
 نہیں رہ سکتیں، میں نے سوچا۔ زائرین ساتھ چھپی ہوئی آیات کی کتابیں اٹھائے پھرتے  
 ہوں گے۔

پھر جو دیکھتا ہوں تو لاکھوں زائرین کتابیں آنکھوں کے سامنے رکھے فریضہ حج







قدرار سٹو کا ہوتا تھا۔

ایک دہقان ار سٹو کا فین (Fan) تھا۔ وہ گاؤں سے چل کر بڑے شوق سے ار سٹو سے ملنے آیا۔ شہر آکر پوچھتے پوچھتے وہ ار سٹو کے گھر پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت ار سٹو حکیم کی دکان پر جانے کے لیے گھر سے باہر نکل رہا تھا۔

دہقان نے پوچھا ”یہ ار سٹو کا گھر ہے؟“

”جی ہاں۔“ ار سٹو نے جواب دیا۔

”ار سٹو اندر ہے کیا؟“

”نہیں۔“

”وہ کہاں ملے گا۔“

”حکیم صاحب کی دکان پر۔“

”حکیم صاحب کی دوکان کہاں ہے۔“

ار سٹو نے اتنا پتا بتایا۔

کچھ دیر کے بعد دہقان حکیم کی دکان پر پہنچا۔ حکیم سے کہا مجھے ار سٹو سے ملنا ہے۔ حکیم نے ار سٹو کی طرف اشارہ کیا ”یہ رہے ار سٹو۔“

”اچھا تو تو ار سٹو ہے؟“ دہقان نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں“ ار سٹو بولا۔ ”میں ار سٹو ہوں۔“

دہقان کو غصہ آگیا بولا۔ ”تو نے مجھے وہاں کیوں نہ بتایا کہ تو ار سٹو ہے؟“

ار سٹو نے جواب دیا۔ ”تو نے وہاں یہ نہیں پوچھا تھا کیا تو ار سٹو ہے۔ پوچھتا

تو بتا دیتا۔“

جواب دینے میں قدرت اللہ بھی سمجھ لیجئے ار سٹو ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ سوال پوچھنے میں میں اس دہقان کا چھوٹا بھائی ہوں۔ جواب لینے کے لیے مجھے مناسب سوال کرنا نہیں آتا۔

میں نے پوچھا ”مکہ شریف میں ٹھہرے کہاں تھے؟“

”ایک نالے کے کنارے۔“

میں نے پوچھا۔ نالے کے کنارے ہوٹل تھا کیا؟“

”نہیں۔“



"مکان تھا؟"

"نہیں۔"

"ٹالے کے کنارے کیا تھا۔"

"ٹالے کے کنارے ٹالے کا کنارہ تھا۔" قدرت نے جواب دیا۔

"اتنے دن ٹالے کے کنارے پر پڑے رہے۔ زمین پر؟"

"نہیں میں نے وہاں ایک دری بچھالی تھی۔"

"وہاں دری پر پڑے رہتے تھے؟"

"ہاں۔"

"پاس پیسے نہیں تھے کیا؟"

"نہیں۔"

"گھر سے پیسے نہیں لے کے گئے تھے؟"

"لے کر گیا تھا۔"

"تھوڑے ہوں گے؟"

"نہیں کافی تھے۔"

"ان دنوں عمدہ کیا تھا؟"

"صدر کا شیر تھا۔"

"تو پیسے چوری ہو گئے تھے؟"

"نہیں۔"

"کسی کو دے دیے تھے؟"

"ہاں۔"

"پاس کچھ نہ رکھا؟"

"رکھا تھا۔"

"کتنا رکھا تھا؟"

"بچنے میں روز دو روٹیاں خریدی جا سکیں۔"

"باقی خیرات کر دیے تھے؟"

"ہاں۔"



”روٹی کے ساتھ کیا کھاتے تھے؟“

”وال۔“

”وال کہاں سے ملتی تھی؟“

”سمدور والا دیتا تھا۔“

”مفت؟“

”ہاں مفت۔“

تو بہ ہے قدرت سے کون سر کھپائے۔ ساری کنکریاں ختم ہو گئیں لیکن بوتل میں ایک قطرہ پانی پر پڑا۔ میں نے سوچا چلو گھر چلو۔ حج سے متعلق معلومات حاصل کیے بغیر کیا میری زندگی ادھوری رہ جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

۱۔ بلکن روڈ کامست

عین اس وقت باہر سے شور کی آواز بلند ہوئی۔ بہت سے لوگ حج چلا رہے تھے۔ ہم باہر نکلے۔ کوٹھی کے صحن میں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ ان کے درمیان ایک نو عمر شخص تھا۔ وہ دیوانوں کی سی باتیں کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چلایا: ”وہ آگے آگے آگے۔“ اور پھر ہماری طرف بھاگا۔

کمرے میں لے جا کر قدرت نے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔

کرسی پر بیٹھ کر وہ غصے میں قدرت سے کہنے لگا: ”تو اسے بتاتا کیوں نہیں؟“

”کیا؟“ قدرت نے پوچھا۔

”جو یہ پوچھ رہا ہے۔“ اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا اور قدرت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”اس نے پانچ حج کرنے ہیں۔ ابھی چار باقی ہیں۔“

”تو بھی جائے گا۔ تو بھی جائے گا۔“ وہ بولا ”تیری فائل بنی ہوئی ہے“ ابھی

دستخط نہیں ہوئے۔“

جب وہ چلا گیا تو میں نے قدرت سے کہا ”اللہ میاں کے ہاں بھی کیا فائلیں چلتی

ہیں؟“

”ہاں کہتے ہیں۔“



”اسی طرح جس طرح ہمارے سکرٹریٹ میں چلتی ہیں؟“

”ہاں۔“

”کیا وہاں کے دفاتروں میں بھی ایسی ہی دھاندلی ہوتی ہے؟“

قدرت ہنس پڑا ”پتہ نہیں۔“

”قرائن سے تو ایسے ہی لگتا ہے یا نہیں؟“

”ہاں۔“ وہ بولا ”لگتا ہے ایسا ہی ہے۔“

”اچھا مجھ سے ایک وعدہ کرو۔“

”کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”جب بھی آپ حج پر جائیں مجھے ساتھ لے جائیے۔“

”اچھا۔“ وہ بولا ”لے جاؤں گا۔ اگر گیا تو۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہاں مجھے کون جانتا ہے۔ وہاں میری کیا حیثیت ہوگی؟“

”وہاں کسی کی حیثیت نہیں ہوتی۔“ وہ بولا ”وہاں سب ایک ہوتے ہیں۔ سب برابر ہوتے ہیں، وہاں صرف ایک رتہ ہوتا ہے۔“

”کون سا؟“ میں نے پوچھا۔

اللہ اور عبد

”مکہ شریف میں اللہ اور عبد ہوتے ہیں۔ مدینے شریف میں رسول اللہ ﷺ اور امتی ہوتے ہیں۔“

”وہاں بزرگ نہیں جاتے کیا؟“

”جاتے ہیں۔“

”تو پھر؟“

مسجد میں داخل ہونے سے پہلے سب کو جو تون کے ساتھ مرتبہ اور بزرگی کے عمامے اتار دینے پڑتے ہیں۔ اور کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ واپسی پر اس کا عمامہ اسے مل جائے گا۔

”پھر تو مرتبہ والے بزرگ فکر مند رہتے ہوں گے۔ عام بندے مزے میں



ہوں گے۔ اس فکر سے آزاد۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔

”تمہیں کیسے پتہ ہے؟“

”اقبال نے جو بھانڈا پھوڑ دیا ہے، تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔“

”اقبال کو پتہ تھا کیا؟“

”ہاں۔“

”کیسے پتہ تھا؟“

”وہ صاحب نظر تھے۔“

”کیا وہ اللہ اور عبد کے تعلق سے واقف تھے؟“

”ہاں۔“

دفترا میں نے محسوس کیا جیسے اللہ اور اس کے رسولؐ کا مجھ سے گہرا تعلق ہے۔ میرے دل سے منہ زبانی مسلمان ہونے کا کائنات نکل گیا۔ میرے بند بند میں ایک نیا رشتہ ابھرا۔ میں عبد ہوں، عبد ہوں۔ میرا خالق مجھے بلا رہا ہے۔ میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ حج کرنے نہیں اپنے اللہ کو سلام کرنے کے لیے۔ اپنے خالق کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے کہ اس نے مجھے بنایا۔ ایسا بنایا جیسا کہ میں ہوں۔ میں جاؤں گا اپنے اللہ کو منانے کے لیے جاؤں گا۔ یہی عبدیت کی غایت ہے کہ بنانے والے کو منائے۔

کمرے پر خاموشی طاری تھی۔ اس سنسان کوٹھی کے درختوں کی شاخیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ دور کوئی چکی چلا رہی تھی۔

”عبد ہو، رسول ہو، عبد ہو، رسول ہو۔“



# مانگے ملے نہ بھیک

سناٹا

کہتے ہیں 'بن مانگے موتی ملیں نہ بھیک۔ سچ کہتے ہیں۔ جب تک طلب نہ تھی راہ چلتے مست اور فقیر مجھے حج پر جانے کی خوش خبری سناتے تھے۔ میرے خواب حج کی نوید سے بھرے ہوئے تھے۔ پھر جب طلب بیدار ہوئی تو سب چپ ہو گئے۔ خواب بند ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا جیسے ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ گہرا عظیم سناٹا۔

میرے دوست اشفاق احمد 'بانو قدسیہ' احمد بشیر 'ابن انشاء' قیصر سب سکھ بدن دانشور ہیں۔ میری بات سن لیتے ہیں وقتی طور پر متاثر بھی ہو جاتے ہیں۔ لیکن التزاماً اسے پلے باندھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دانشور کا مسلک شک کرنا ہے 'پلے باندھنا نہیں۔

میرے دوست محمد طفیل بذات خود ٹیلی پتھک شخصیت ہیں۔ ان میں ایک ریسور لگا ہوا ہے۔ ان کی اپنی زندگی میں جو تھی سمت کے مشاہدات و احساسات موجود ہیں۔ لیکن وہ محمد نقوش کے رعب کی وجہ سے اپنے ان مشاہدات کا تذکرہ نہیں کرتے 'محمد نقوش سے دبتے ہیں اسی وجہ سے ان کی شخصیت دو حصوں میں عٹی ہوئی ہے۔ محمد نقوش سوچتا ہے 'لکھتا ہے۔ محمد طفیل صرف دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے۔ ہچکچاتا ہے اور منہ تکتا ہے۔

میرے دوست غلام دین دانی نور محمد اور راجہ شفیع میری باتوں کو قابل یقین سمجھتے ہیں 'لیکن ان میں توازن کا فقدان ہے۔ ایمان کے اتنے انہار لگے ہوئے ہیں کہ شک کی گنجائش ہی نہیں۔ ادھر جینے کی پابندی ادھر مرنے کی پابندی۔

پتہ نہیں توازن کی کیفیت اتنی کیاب کیوں ہے کہ افراد میں یا تو عقلی شکوک



کے ڈھیر لگ جاتے ہیں اور یا ایمان کے دھارے بنے لگتے ہیں۔ توازن کی کیفیت میں نے صرف قدرت اللہ میں پائی ہے۔ قدرت اللہ کے شکوک اور ایمان میں عجیب سی ہم آہنگی ہے۔ ایمان شکوک کی کاٹ نہیں کرتا۔ اور شکوک ایمان کے راستے میں حائل نہیں ہوتے بلکہ اسے تقویت دیتے ہیں۔

میرے دل کی تڑپ یا طلب قدرت کی وجہ سے تھی، اس لیے میرے لیے وہ وسیلہ بن گئے تھے۔

انہی دنوں قدرت اللہ پر ایک ایسی افتاد آپڑی کہ میری توجہ حج سے ہٹ کر قدرت اللہ پر مرکوز ہو گئی۔

### قدرت کا تبادلہ

پتہ نہیں کیوں بیرونی طاقتیں ہمیشہ سے قدرت اللہ کو اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتی رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ صدر کے سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے قدرت اللہ کا صدر پاکستان پر ایسا اثر ہے جو بیرونی طاقتوں کے مفاد میں رکاوٹ بنا رہتا ہے۔

عرصہ دراز کی کوششوں کے بعد وہ کامیاب ہو گئے اور قدرت اللہ کو سیکرٹری صدر کے عہدے سے سبکدوش کر کے اطلاعات کا سیکرٹری لگا دیا گیا۔

اس تبادلے کے بعد بیرونی طاقتوں پر انکشاف ہوا کہ بات تو وہیں کی وہیں رہی اور قدرت عملی طور پر جوں کے توں اثر انداز ہیں۔ لہذا بیرونی طاقتوں نے شدید دباؤ ڈالا۔ نتیجہ یہ ہے کہ قدرت کو مرکزی حکومت سے الگ کر کے صوبائی حکومت میں فائز کر دیا گیا۔

اس تبادلے کی وجہ سے ہماری توجہ حج سے ہٹ کر دوسرے معاملات پر مرکوز ہو گئی۔

پتہ نہیں کیوں اس تبادلے پر قدرت اللہ نے اپنا استعفیٰ صدر کی خدمت میں پیش کر لیا۔ یہ استعفیٰ احتجاج کا مظہر نہ تھا۔ عرصہ دراز سے قدرت کی خواہش تھی کہ نوکری چھوڑ کر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام کریں۔

صدر ایوب نہیں چاہتے تھے کہ قدرت اللہ کا استعفیٰ منظور کریں۔ قدرت اللہ ضد کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس بات پر ایک مہینہ صدر اور قدرت کے



درمیان مذاکرات ہوتے رہے۔ صدر متحمل مزاج تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وقت جذبات کمزور کرنے اور حالات سنوارنے کی واحد کنجی ہے۔ اس لیے وہ معاملے کو طول دیتے رہے۔ انہوں نے قدرت اللہ کو یہ پیش کش بھی کر دی کہ اپنے لیے کوئی ساعہ دہ پسند کر لیں۔ آپ کی وہاں تعیناتی کر دی جائے گی لیکن قدرت نوکری چھوڑنے پر مصر تھے۔

انہیں دنوں اتفاق سے ایک درویش آگئے۔ انہوں نے قدرت کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ آپ سفیر بن کر کچھ عرصہ کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں۔ قدرت اللہ کو یہ بات قابل قبول نظر آئی۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی دور کی جگہ ہو چھوٹا سا ملک ہو۔ اتفاق سے ہالینڈ کی سفارت خالی تھی۔

لہذا صدر نے انہیں ہالینڈ کا سفیر بنا کر بھیج دیا۔

قدرت کے جانے کے بعد میرے نزدیک حج کا سارا منصوبہ ہی ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ایک سناٹا چھا گیا۔ خواب آنے بند ہو گئے۔ مستوں نے مجھے سر راہ روکنا چھوڑ دیا۔ فقیر خاموش ہو گئے اور میں گویا ایک خلا میں ٹانگ دیا گیا۔

## حج کی عرضی

مہینے گزر گئے پھر ہالینڈ سے قدرت کا خط موصول ہوا لکھا تھا 'مایوس نہ ہوں۔ اللہ کے در پر ناامیدی گناہ ہے۔ انشاء اللہ ہم ضرور حج پر حاضری دیں گے۔ آپ حج کے لیے عرضی گزار دیں۔'

قدرت اللہ کے اس خط نے از سر نو امید کا دیا روشن کر دیا۔ میں سمجھا کہ خوابوں کی تعبیر کا وقت آ گیا ہے۔

میں نے عرضی کا فارم منگوا دیا۔ کوائف درج کیے۔ رقم جمع کروائی اور پھر تیاری میں مصروف ہو گیا۔

عرضی دیتے وقت میرا ایمان تھا کہ جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ قرعہ اندازی کریں گے تو اللہ میاں خود آکر ان کے پاس بیٹھ جائیں گے اور کہیں گے میاں ممتاز مفتی کا نام ضرور نکالو۔ اسے ہم نے خود بلایا ہے۔ بڑی مشکل سے حج پر آنے کے لیے رضامند کیا ہے۔ کہیں پھر سے منکر نہ ہو جائے اور قرعہ میں میرا نام نکلوانے کے بعد وہ قافٹ مکہ



معظمہ پہنچیں گے، تاکہ بروقت مجھے Receive کرنے کے بندوبست کر لیں۔  
 جب مجھے علم ہوا کہ قرعہ میں میرا نام نہیں نکلا تو میں ہکا بکا رہ گیا۔  
 مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ میرا نام نہیں نکلا۔ کئی ایک روز تو میرا ذہن  
 ماؤف رہا۔ پھر میں نے قدرت اللہ کو اطلاع دی کہ میرا نام قرعہ اندازی میں نہیں نکلا۔  
 جواب میں انہوں نے لکھا کہ نہیں نکلا تو کوئی بات نہیں۔ آپ اگلے سال پھر  
 عرض گزاریں۔ اگلے سال پھر میرا نام نہ نکلا تو پھر دھچکا لگا۔

### امید و بیم

پھر دو مہینے ایک جمود سا طاری رہا۔ طلب ہچکیاں لے لے کر ساکت ہو گئی۔  
 جب تیسرے سال بھی قرعہ اندازی میں میرا نام نہ نکلا تو میں مایوس ہو گیا۔  
 حج کے خواب پھر سے شروع ہو گئے۔ اب ان خوابوں میں کوئی خوشخبری نہ  
 ہوتی تھی بلکہ رکاوٹیں پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی۔ کبھی راستے میں سانپ آکھڑا ہوتا۔  
 کبھی راستے کا پل بیٹھ جاتا۔ کبھی کوئی خوف ناک مست راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا۔  
 میں نے قدرت کو لکھا کہ خوابوں سے ظاہر ہے کہ حج کی بات فسق ہو گئی۔ میں  
 مایوس ہو چکا ہوں۔

قدرت نے جواب دیا، آپ کے مایوس ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔  
 اللہ تعالیٰ بندے سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔  
 ان طفل تسلیوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا ہٹاؤ، وہاں جا کر کرنا ہی  
 کیا ہے۔

ایک سال گزر گیا۔

پھر ایک روز قدرت کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا انشاء اللہ اس سال بیت اللہ  
 میں حاضری دیں گے۔ آپ تیار رہیں۔ درخواست دے دیں۔ اگر قرعہ اندازی میں  
 نام نہ نکلا تو بیروت پہنچ جائیں۔ میں بھی بیروت پہنچ جاؤں گا۔ وہاں کوئی نہ کوئی انتظام ہو  
 جائے گا۔ انشاء اللہ ہم منزل مقصود پر پہنچ سکیں گے۔

اس خط کی آمد کے بعد حج پر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ سب سے  
 پہلے میں نے حج پر سات آٹھ کتابیں خریدیں۔ ان سب کو بار بار پڑھا۔ نقشے حاصل



کیے۔ جدہ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات سب مقامات کو پن پوائنٹ کیا۔

حج کے ارکان کی فہرست بتائی۔

منوعات کو الگ قلم بند کیا۔

بھولی ہوئی نماز از سر نو رٹا۔

پھر میں نے حج کے ارکان کو سلسلہ وار لکھا۔ اور آخر میں ان آیات کے معنی

یاد کرنے لگا جو حج کے دوران مختلف مقامات پر پڑھنی ضروری تھیں۔

### فائنل لسٹ

انہی دنوں جب میں حج کی تیاری کرنے میں شدت سے مصروف تھا۔ قدرت

کے ایک جاننے والے بزرگ ایڈووکیٹ صاحب پنڈی تشریف لے آئے۔

میں نے کہا ”ایڈووکیٹ آپ یہاں کیسے۔“

”کننے لگے ”پنڈی ایک کام سے آیا تھا۔ سوچا آپ کو اطلاع دیتا جاؤں تاکہ

ناحق کی کوفت سے بچ جائیں۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”قدرت اللہ صاحب کا خط موصول ہوا ہے جس میں تحریر کیا ہے کہ وہ اس

سال حج پر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”جی ہاں“ میں نے جواب دیا ”مجھے علم ہے۔“

”میں نے انہیں مطلع کر دیا ہے کہ اس سال آپ حج پر نہیں جا رہے۔“

”لیکن وہ تو جا رہے ہیں۔“ میں نے ان کی بات کاٹی۔ انہوں نے پروگرام

بتا لیا ہے۔ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نہیں جا رہے۔“

”میں نے وہ لسٹ دیکھی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”کون سی لسٹ؟“

”زائرین کی لسٹ۔“

”زائرین کی لسٹ؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”ابھی تو قرعہ اندازی نہیں

ہوئی۔“



ایڈووکیٹ نے پراسرار انداز سے میری طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیے۔ ”وہ لسٹ نہیں۔“ وہ بولے۔

”تو پھر کون سی لسٹ؟“ میں نے پوچھا۔

”جو زائرین اس سال حج پر حاضری دیں گے۔“ وہ پھر مسکرائے ”مدینہ منورہ سے جن کی منظوری مل چکی ہے۔ وہ لسٹ۔ اس لسٹ میں نہ تو شہاب کا نام ہے نہ آپ کا۔“

حیرت سے میں ہکا بکا ایڈووکیٹ صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ مسکرائے پھر بولے۔ ”بھائی میں نے تو متعدد بار آپ کی فائل دستخط کے لیے پیش کی لیکن ہر بار اسے دستخط کے بغیر لوٹا دیا گیا۔“

میں نے حیرت سے ایڈووکیٹ صاحب کی طرف دیکھا۔

”خیر کوئی نہیں“ وہ بولے۔ ”ویر آید درست آید۔ شہاب صاحب کو ان تفصیلات کا علم ہے وہ جلد آپ کو اطلاع دیں گے۔“

ایڈووکیٹ صاحب کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ انہیں بھلا کیسے پتہ چلا کہ اس سال کون حج کرے کون نہیں کرے گا۔ اور یہ لسٹ کیا چیز ہے؟ کیا حج کرنے والوں کی لسٹ قرعہ اندازی سے پہلے ہی تیار ہو جاتی ہے؟ ایڈووکیٹ صاحب کی ساری بات ہی مہمل تھی۔

ایڈووکیٹ صاحب ہمیشہ عجیب باتیں کیا کرتے تھے۔

## ایڈووکیٹ صاحب

ہم ۱۹۶۱ء میں ایڈووکیٹ صاحب سے متعارف ہوئے تھے۔ ایک روز شہاب کے نام ان کا خط موصول ہوا تھا۔ لکھا تھا ”میں خوشاب کا ایڈووکیٹ ہوں۔ مجھے کئی ایک ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ آپ اچھے آدمی ہیں۔ اس لیے میرے دل میں آپ کے لیے خیر خواہی کا جذبہ بیدار ہوا۔ پھر میں نے سنا کہ آپ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی اس پر مجھے بہت قلق ہوا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے کبھی تہجد قضا نہیں کی۔ اس سے میں نے معمول بنالیا کہ بلا ناغہ تہجد میں اللہ پاک کے حضور میں التجا کرنا کہ آپ کو بچے سے نوازے۔“



اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میری گزارش کو شرف قبولیت بخشا ہے۔  
کل رات مجھے یہ خوش خبری دی گئی ہے کہ آپ کے ہاں بچہ تولد ہو گا۔ ہونے والا  
نومولود چند ساعت کے لیے میری گود میں ڈال دیا گیا اور حکم ہوا کہ آپ کو خبر دے  
دوں کہ ایک سال کے بعد آپ کے گھر فرزند ہو گا۔

آپ کو مبارک ہو۔

فرزند کی ولادت پر مجھے مطلع فرمائیں۔

عین ایک سال کے بعد قدرت کے گھر فرزند ہوا حالانکہ میڈیکل رائے کے  
مطابق پیدائش کا امکان نہ تھا۔

بچہ ایک سال کا ہو گیا تو ایک بزرگ صورت آدمی تشریف لائے۔ انہوں نے  
اپنا تعارف کرایا۔ کہنے لگے میں وہی شخص ہوں جس نے دو سال پہلے آپ کو بچے کی  
ولادت کی خبر دی تھی۔ آپ نے مجھے ولادت کی اطلاع بھی نہ دی۔

اس روز سے ایڈووکیٹ صاحب کے شہاب سے مراسم پیدا ہو گئے۔

بہر حال وہ تو محض اتفاق تھا کہ بچہ ہو گیا۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ  
ایڈووکیٹ صاحب کی ایسی اوٹ پٹانگ بات کو مان لیا جائے۔

لہذا میں نے اپنی تیاری جاری رکھی اگرچہ اس میں وہ شدت نہ رہی۔ پھر دو  
دن کے بعد قدرت کا خط موصول ہوا لکھا تھا۔ بوجہ اس سال ہم حج پر نہیں جا رہے۔  
یہ خط میری عقل سلیم کے کفن میں آخری میخ تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ  
یہ کیسی دنیا ہے۔

تم حج پر جاؤ گے۔

تمہاری فائل بنی ہوئی ہے۔

ابھی دستخط نہیں ہوئے۔

تمہارا نام فرست میں نہیں اس لیے تم نہیں جا رہے۔

آخر کیوں خواہ مخواہ مجھے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ میں کب چاہتا ہوں کہ حج

پر جاؤں۔

اس بات پر میں کئی ایک دن غصے میں بل کھاتا رہا۔

اسی سال کے اختتام پر قدرت اللہ تین سال کا بن باس کاٹ کر وطن واپس آ



گئے۔

میں نے جان بوجھ کر قدرت اللہ سے حج کی بات نہ کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر سے کسی طوطا میںا کہانی میں الجھ کر رہ جاؤں۔

ایس اور ونڈر لینڈ

ایک دن قدرت اللہ نے مجھے فون کیا بولے ”آپ کے پاس کچھ پیسے ہیں؟“  
میں نے کہا ”ہیں۔“

کننے لگے ”ڈھائی ہزار کے قریب ہوں گے؟“  
میں نے کہا ”ہاں ہیں۔“

”کیا آپ آسانی سے انہیں خرچ کر سکتے ہیں؟“  
”میرا مطلب ہے کہ آپ کو دقت تو نہیں ہوگی۔“  
میں نے کہا ”نہیں۔“

بولے ”تو آپ ڈھائی ہزار کا چیک سلف کے نام کاٹ کر لے آئیں میرے پاس۔ ساتھ اپنا پاسپورٹ بھی لے آئیں۔“

جب میں قدرت اللہ کے پاس پہنچا تو وہ بولے :  
”ہم حج پر جا رہے ہیں اس سال انشاء اللہ۔“

میں نے کہا ”قرعہ اندازی تو ہو چکی۔ ہم نے تو عرضی نہیں گزارا تھی۔“  
بولے ”کوئی بات نہیں۔“

”پھر ہم کیسے جائیں گے؟“  
”انشاء اللہ“ وہ بولے۔

”آپ نے فرسٹ دیکھ لی ہے کیا؟“ میں نے طنزاً کہا۔  
”کون سی فرسٹ؟“

قدرت نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیے۔

”پچھلے سال آپ کو ایڈووکیٹ صاحب نے اطلاع دی تھی تاکہ آپ کا نام لسٹ میں شامل نہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں انہوں نے اطلاع دی تھی۔“



”کیا اب انہوں نے آپ کو اطلاع دی ہے کہ آپ کا نام فہرست میں شامل ہے؟“ میں نے طنزاً کہا۔

”ایڈووکیٹ صاحب تو فوت ہو گئے۔“ قدرت اللہ نے کہا ”بہت عابد آدمی تھے۔ عمر بھر انہوں نے کبھی تہجد قضا نہ کی تھی۔“

بات بدلنے میں قدرت اللہ کا جواب نہیں۔ جب بات ایسے موڑ پر آجائے کہ پکڑے جانے کا امکان ہو تو وہ موضوع بدل دیتے ہیں۔ میں نے کہا ”میں تو جب مانوں گا کہ ہم حج پر جا رہے ہیں، جب میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”یہ تو بڑا اچھا ہے آپ پہنچ کر مان جائیں۔ کئی لوگ تو پہنچ کر بھی نہیں مانتے۔“ وہ مسکرائے۔

گذشتہ تین سال سے ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے کہ میری عقل سلیم ماؤف ہو کر رہ گئی تھی۔ میں ایک ایسی ایلیس بن کر رہ گیا تھا جو ونڈر لینڈ میں کھو گئی ہو۔

## تیاری

حج پر جانے کے سارے انتظامات یوں گھر بیٹھے بیٹھے ہو گئے۔ ویزا حاصل کر لیا گیا۔ فارن ایکسچینج مل گیا۔ ٹیکے لگوائے گئے بنگلہ ہو گئی کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ہم واقعی جا رہے ہیں۔ جب تک دوڑ دھوپ نہ ہو، تنگ و دونہ ہو، امید بیم نہ ہو۔ کیسے یقین آئے بھلا۔

ادھر قدرت تھے وہ یوں اطمینان اور سکون سے بیٹھے تھے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ تیاری کے عالم میں نہ ہوں بلکہ اس کے برعکس بڑے درخت کے تلے نروان حاصل کیے بیٹھے ہوں۔

کوئی ملنے والا آکر پوچھتا کہ آپ حج کے لیے جا رہے ہیں کیا تو وہ کہتے دعا کیجئے۔ اس بات پر مجھے شک پڑنے لگا کہ شاید ہمارا جانا یقینی نہیں ہے۔ چونکہ دعا کیجئے تو ان باتوں کے متعلق کہا جاتا ہے جو طے شدہ نہ ہوں۔

میں حیرت سے قدرت کی طرف دیکھتا۔ اس وقت مجھے توقع ہوتی کہ قدرت چپکے سے مجھے آنکھ مار کر یقین دلائیں گے کہ ہم جا تو رہے ہیں۔ یقینی طور پر جا رہے ہیں۔ ایسی بات کہہ کر میں اسے ٹر خا رہا ہوں۔ میری استفسارانہ نگاہ کو دیکھ کر بھی



قدرت کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آتی۔ نہ وہ آنکھ مارتے نہ اشارہ کرتے نہ ہی آنکھ چمکاتے۔

اس وقت میری کیفیت عجیب سی تھی 'جی چاہتا تھا کہ خوشی میں ناچوں کو دوں۔ جی چاہتا تھا کہ شہر کے ہر مکان کی کنڈی بجاؤں اور جب کوئی باہر آئے تو کہوں 'جی آپ کو نہیں پتہ کیا۔ میں حج پر جا رہا ہوں۔ اس کے برعکس کہہ رہے تھے 'دعا فرمائیں۔

### پروگرام

قدرت نے روانگی کا پروگرام ایسا بنایا کہ روانگی کا سارا مزہ کر کر اہو گیا۔ انہوں نے کہا مجھے لاہور اور کراچی میں ایسے سرکاری کام ہیں جنہیں روانگی سے پہلے انجام دینا ضروری ہیں۔ لہذا ہم راولپنڈی سے روانہ ہوئے تو احباب نے سمجھا کہ دورے پر جا رہے ہیں۔

لاہور پہنچ کر قدرت نے سرکاری کام کرنے شروع کر دیے اور اپنے ارد گرد دفتر لگا لیا جیسے حج پر روانگی ایک جملہ معترضہ ہو۔

قدرت کے اس رویے نے میرے ذوق شوق پر گیلابوریہ ڈال دیا۔ لاہور میں اشفاق اور بانو قدسیہ کا رویہ بھی عجیب سا تھا۔ یا تو اشفاق میں جذبے کی شدت سرے سے ہی مفقود ہے یا اس میں شدت اجساں پیدا ہو جائے تو اس کے جسمانی اعضا شل ہو کر رہ جاتے ہیں اور شدت کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ اشفاق ہم سے ملا تو قدرت سے کہنے لگا "یار کیا واقعی توجج پر جا رہا ہے" صورت شکل سے معلوم تو نہیں پڑتا۔

اشفاق قدرت کا پرانا دوست ہے اور ان محدودے چند لوگوں میں سے ہے جو بے تکلفی سے بات کرتے ہیں۔

البتہ بانو قدسیہ اور ان کی والدہ بار بار میری طرف حیرت اور حسرت سے دیکھتیں "اچھا تو کیا واقعی آپ جا رہے ہیں؟"

دو دن لاہور قیام کرنے کے بعد ہم کراچی پہنچے۔ وہاں بھی قدرت اپنے ارد گرد دفتر لگا کر بیٹھ گئے اور میں قیصر اور ابن انشا کے پاس چلا گیا۔ ابن انشا اظہار میں بچے



کے مصداق ہے۔ وہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔  
ابن انشا پہلا شخص تھا جس نے مجھے یہ احساس دیا کہ میں حج پر جا رہا ہوں اور  
حج پر جانا ایک عظیم واقعہ ہے اور مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں حج پر جانے کی سعادت  
نصیب ہوتی ہے۔

کے اور بے

کاش کہ اس روز میں کچھ دیر کے لیے ابن انشا کے پاس رکنا لیکن قیصر نے مجھے  
رکنے نہ دیا۔ وہ مجھے گھر لے گیا۔ قیصر مجھے یوں ملا جیسے میں کراچی میں شاپنگ کی غرض  
سے آیا تھا۔ کتنے لگا ہاں بھی کیا پروگرام ہے۔ چلو فلاں ہوٹل میں جا کر چائے پیئیں۔  
فلاں مقام پر ٹھہریں۔ ہاں یار بڑی عمدہ قلم لگی ہوئی ہے۔ سچے معنوں میں فار ایڈ لٹس قسم  
کی کہتے ہیں سنسنے چوتھائی قلم کاٹ دی ہے پھر بھی کچھ مقامات رہ گئے ہیں۔ آج  
رات پکچر رہے گی۔ میں نے کہا بھی عقل کی بات کرو ہم یہاں سے حج کو جانے کے لیے  
آئے ہیں۔ قیصر مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں شیطانیت کی جھلک ہوتی ہے۔

قیصر میرا پرانا ساتھی ہے۔ وہ ایک سکہ بند دانشور ہے۔ وہ مذہبی اور روحانی  
باتوں کو طوطا مینا کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس سے کوئی روحانی بات کی جائے  
تو اس کا رد عمل Amused Disbelief کا منظر ہوتا ہے۔

دو روز قیصر کے ساتھ رہنے کے بعد میں یہ بات قطعی طور پر بھول گیا کہ میں  
حج پر جا رہا تھا۔ پھر دو نمٹا "آخری دن قدرت نے مجھے فون کیا کہ آج شام کو فلاں وقت  
حاجی کیمپ میں پہنچ جائیں تاکہ ہم وہاں سے حج سے متعلقہ ضروریات خرید لیں۔

شام کو ہم حاجی کیمپ پہنچے۔ قدرت اور ڈاکٹر عفت منتظر تھے۔ ہم نے احرام  
خریدے۔ جوتے اور حاجی بیگ خریدے۔ اس کے باوجود مجھے کوئی احساس نہ ہوا کہ  
میں حج پر جا رہا ہوں۔ ایسے لگتا تھا جیسے میرا ذہن سن ہو چکا ہو اور خون رگوں میں  
دوڑنے کی بجائے رینگ رہا ہو۔

خرید و فروخت کے بعد قدرت نے کہا "ہم رات کے ایک ڈیڑھ بجے  
ایئرپورٹ پر پہنچ جائیں گے چونکہ ہمارا طیارہ رات کے تین بجے روانہ ہو گا اور آپ کا  
طیارہ صبح پانچ بجے روانہ ہو گا" آپ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں تو مناسب ہو گا۔"



اس روز قدرت کی بات سن کر مجھے پہلی مرتبہ علم ہوا کہ الگ الگ طیاروں میں جدہ جا رہے تھے۔ اس پر حیران تو ہوا لیکن یہ پوچھنے کا موقع نہ تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اسی رات قیصر مجھے زبردستی وہ فلم دیکھنے لے گیا جو یقیناً ”فاراڈ لٹس“ تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ہم فلم دیکھنے نہ جائیں لیکن قیصر کا کہنا تھا کہ فلم دیکھنا ضروری ہے۔ چونکہ دوسری صورت میں اگر ہمیں نیند آگئی اور ہم سو گئے تو ایئر پورٹ پر کیسے پہنچیں گے۔

اس فلم کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے میں قطعاً ”بھول گیا کہ اسی رات مجھے حج پر راوند ہونا ہے۔ فلم دیکھ کر باہر نکلے تو جب ارم اور جے نے مجھے یاد دلایا تو ایک ساعت کے لیے میں حیران رہ گیا۔

### نیت قارن

گھر پہنچ کر میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ غسل کیا، اس سے پہلے میں صرف نہایا کرتا تھا۔ غسل کے بعد جب میں نے احرام پہنا تو قیصر ققمہ مار کر ہنسنے لگا۔ جے نے قیصر کو ڈانٹا لیکن قیصر کب کسی کی ماننے والا ہے۔ اس کے ققمے کو سن کر میں نے دوڑ کر آئینہ دیکھا۔ سچی بات یہ ہے کہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر میرا بھی جی چاہا کہ ققمہ مار کر ہنسون، میرے روبرو گویا ایک بہرہ پیا کھڑا تھا۔ چہرے پر نہ پاکیزگی تھی، نہ خلوص تھا، نہ خوشی تھی۔

حج پر جانے والے احرام پوشوں کو میں نے کئی بار دیکھا ہے۔ ان کے چہروں پر عقیدت، اشتیاق اور مسرت کا نور ہوتا ہے۔ انہیں دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ حاضری دینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ زرد شریف کا ورد کرنے پر دل مچل جاتا ہے۔ لیکن آئینہ میں میرے روبرو جو احرام پوش کھڑا تھا اسے دیکھ کر ققمہ لگانے کو جی چاہتا تھا۔

احرام پہن کر میں نے پہلے نماز کی وہ چھوٹی سی کتاب کھولی جو جانے سے کئی دن پہلے پنڈی سے خریدی تھی۔ نماز کا از سر نو مطالعہ کیا۔ معافی پڑھے اور پھر ڈی ایف پی کے حج سے متعلق چھپے ہوئے کتابچے میں سے نیت حج کے متعلق ہدایات از سر نو پڑھیں پھر شدید کوشش سے احرام اور خلوص طاری کر کے قارن کی نیت باندھی۔



## وی آئی پی لونج

نماز سے فارغ ہو کر قیصر، اس کی بیگم بے اور ان کی اکلوتی بیٹی ارم اور میں ہم سب ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ارم اس بات پر مصر تھی کہ وہ ہمیں وداع کرنے ضرور جائے گی۔ ہم میں سے ارم واحد ہستی تھی جو حج کی خوشی سے چھلک رہی تھی اور ہمارے روانگی کے واقعہ کو ایک عظیم واقعہ سمجھ رہی تھی۔

ایئرپورٹ پر قدرت اور ڈاکٹر عفت پہلے ہی موجود تھے۔ وہ دونوں یوں بیٹھے تھے جیسے وہ وی آئی پی لونج نہ ہو بلکہ مدینے منورہ کی کوئی مسجد ہو۔ ہم اس لونج میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔

تین بجے کے قریب قدرت کا پی اے داخل ہوا۔ کہنے لگا آپ کا طیارہ لیٹ چلے گا۔ میں اطلاع دوں گا۔ پی اے کے جانے کے بعد پھر سکوت طاری ہو گیا۔ پھر صدیاں بیت گئیں۔ نجر کی سفیدی جھلکنے لگی۔

دفعتا "آواز آئی پی آئی اے کا طیارہ روانگی کے لیے تیار ہے۔ وہ میرا طیارہ تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ارم خوشی سے چلانے لگی، بابا مبارک ہو۔ قدرت اور ڈاکٹر عفت کو وہیں چھوڑ کر میں لونج سے باہر نکل گیا۔ سامنے میرا طیارہ روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔



## جدہ

وہ ایک عام سا چھوٹا طیارہ تھا جیسے اندرون ملک اڑنے والے طیارے ہوتے ہیں۔ اس طیارے میں دو درجے تھے۔ فرسٹ کلاس آگے تھا۔ عمومی پیچھے۔ درمیان میں پی آئی اے کا کیمین تھا۔ فرسٹ کلاس میں پاکستان کی ہاکی ٹیم میچ کھیلنے کے لیے جا رہی تھی۔ عمومی حصے میں صرف زائرین تھے۔ انہوں نے احرام پہن رکھے تھے۔ ادھر ادھر بوتلوں، تھیلوں اور نوکریوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔

### زائرین اور طیارہ

زائرین کے ہاتھوں میں تسمبیس تھیں جو دانہ دانہ ریگ رہی تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ طیارے کی فضا اداس تھی۔ زائرین جذبے سے بھیکے ہوئے تھے۔ لیکن اس جذبے سے چھینٹے نہیں اڑ رہے تھے۔ غالباً اس لیے کہ جذبہ خالص خوشی کا جذبہ نہ تھا۔ احترام ادب اور تشکر نے خوشی کے پر کاٹ رکھے تھے۔ یا شاید اس لیے کہ خوشی کا والہانہ جذبہ ادب کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

طیارے میں تقدس بھری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں تقدس میں اداسی کیوں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اتنی بوجھل کیوں ہوتی ہے۔

جوں جوں طیارہ اڑتا جا رہا تھا توں توں تقدس گمراہوتا جاتا تھا۔ اداسی دبیز ہوتی جا رہی تھی، دل پر بے نام سا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

زائرین کے چہروں پر کوئی ولولہ نہ تھا۔ آنکھوں میں کوئی ستارہ نہیں چمک رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہم سرزمین حجاز کو نہیں جا رہے تھے بلکہ ہمارا طیارہ ہائی جیک ہو چکا تھا ہائی جیکرز ہمیں کسی نامعلوم منزل کی طرف لیے جا رہے تھے اور مسافر اللہ کے حضور دعائیں کر رہے تھے کہ یا اللہ ہمیں اس مصیبت سے بچا۔



کبھی کبھار فٹ کلاس سے قہقہے کی آواز سنائی دیتی۔ وہ اس قدر اجنبی لگتی، اس قدر بیگانہ محسوس ہوتی، لیکن وہ آواز جلد ہی معدوم ہو جاتی، جیسے پانی کا ایک قطرہ زیت میں گر گیا ہو۔

## ہائی جیک

فٹ کلاس کے قہقہے کی آواز پر میں چونک پڑتا، مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہاں ہائی جیک زچھے ہوئے ہوں اور اپنے کارنامے کی کامیابی پر ہنس رہے ہوں۔ دراصل سارا قصور میرے قلب کا ہے۔ میرے قلب میں مجذوبیت کا عنصر غالب ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عالم خوشی میں ناچتے گاتے ہیں، حال کھیلتے ہیں جن کے اظہار میں والہانہ پن ہوتا ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ زائرین اٹھ کر ناچیں۔ نعرے لگائیں۔

”لبیک اللہم لبیک“

یا اللہ میں حاضر ہوں۔ یا اللہ میں تیرے حضور حاضری دینے کے لیے جا رہا ہوں۔ یا اللہ میں کتنا خوش نصیب ہوں، یا اللہ تو کتنا رحیم و کریم ہے کہ تو نے مجھے حاضری کی سعادت بخشی۔

میرا جی چاہتا تھا کہ حج حج کر اپنے ہمراہیوں کو بتاؤں کہ بھائیوں ہم ہائی جیک نہیں ہو رہے بلکہ اللہ کے حضور حاضری دینے کے لیے جا رہے ہیں۔ لیکن میرے حلق میں آواز نہیں تھی۔ شاید میں ڈرتا تھا کہ میرا والہانہ پن بے ادبی نہ ہو۔

ہمراہیوں سے مایوس ہو کر میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکنا شروع کر دیا۔ جب سورج طلوع ہو گیا تو نیچے زمین کالی سی لیکر کی صورت میں نظر آنے لگی۔

معا” مجھے حج کی ایک کتاب میں سے جس کا میں نے مطالعہ کیا تھا متعلقہ حصہ یاد

آگیا:

”اللہ اللہ“ یہ وہ ارض مقدس ہے، وہ سر زمین ہے یہاں جو گیا اس کو امان مل گیا۔ یہاں کا ذرہ ذرہ نورانی ہے، چپہ چپہ متبرک ہے اور گوشہ گوشہ رحمت سے بھرا ہوا ہے۔“

میں نے بار بار شدت سے کوشش کی کہ مجھ میں بھی ایسے تقدیس بھرے



جذبات جاگیں بدن میں سوئیاں چھیں، دل میں مدوجزرا نہیں۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا، وہ کالی لکیر کالی لکیر ہی رہی۔

### سالک اور مجذوب

کیوں کیوں۔ آخر میرے قلب میں کیوں حرکت پیدا نہیں ہو رہی۔ میرے دل میں تقدیس بھرے جذبات کیوں نہیں ابھر رہے۔ کیا میرا ایمان خام ہے؟ کیا میرا قلب مردہ ہے۔ میرے دل میں کئی ایک سوال، کیوں، کس لیے، کیسے، چیونٹیوں کی طرح ریگننے لگے۔ مجھے اپنے آپ پر شکوک پیدا ہونے لگے۔

مجھے علم ہے کہ میرا ایمان خام ہے لیکن میرا جذبہ تو خام نہیں۔ میرے جذبے میں جان ہے، شدت ہے، دیوانگی ہے۔ مجھ میں جذبے کے سوا اور ہے ہی کیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے ہمراہیوں کا جائزہ لیا۔ وہ سب اللہ کے کلام سے بھگتے ہوئے تھے۔ وہ سب سالک تھے۔ صرف میں ایک مجذوب تھا اور میرا جذبہ بھی خام تھا۔ ورنہ میں اکیلا نعرہ لگا سکتا تھا۔ میں اس کھڑے پانی میں اللہ اکبر کا نکر پھینک کر حرکت پیدا کر سکتا تھا۔

لیکن میں بھی چپ بیٹھا رہا۔

طیارہ پر وہی خاموشی، متفکر، اداس تقدس بھری کیفیت طاری رہی۔ ہونٹ ہلتے رہے، سسکین ریگتی رہیں۔ دلوں پر بوجھ بڑھتا رہا۔ اداسی دبیز تر ہوتی گئی۔ طیارہ ہائی جیک ہوتا رہا۔

صدیاں بیت گئیں۔

پھر دفعتاً "پکتان کی آواز سن کر سب چونک پڑے۔ پیشیاں باندھ لیجئے، سگریٹ بجھا دیجئے، تھوڑی دیر میں ہم جدہ ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں۔ جہاز رک گیا۔۔۔۔۔

### جدہ ایئر پورٹ

ہم سب باری باری طیارے سے باہر نکلے۔ سامنے ایک عام سامیڈان تھا۔ ویسی ہی زمین جیسی ہمارے ہاں ہوتی ہے۔ ویسی ہی مٹی۔ دور ویسی ہی چھوٹی پہاڑیاں جیسے کہ ایئر پورٹوں کے پس منظر میں ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں میں سمجھتا تھا وہاں کی مٹی







متواتر شیڈ میں نفسا نفسی کا عالم رہا۔ دو گھنٹے مسلسل سامان 'سامان' سامان کی آوازیں گونجتی رہیں۔ "سامان کدھر گیا؟" "سامان سنبھالو۔" "سامان چیک کر لو۔" "سامان پکڑو۔" "سامان دے دو۔" "میرا سامان؟"

"ہائے میرا سامان"

وہ ہونٹ جو طیارے میں مل رہے تھے 'شیڈ میں ساکت ہو گئے۔ تیسبھین جو سفر کے دوران انگلیوں میں ریختی رہی تھیں 'رک کر کلائیوں پر چڑھ گئیں۔ چہرے جو تقدیس بھری امیدوں سے منور تھے 'سامان کی لگن میں متفکر ہو کر بجھ گئے۔

اس وقت ایسے لگتا تھا جیسے ہم سب نے اتنا لمبا سفر صرف اس لیے اختیار کیا تھا کہ جدہ ایئر پورٹ کے اس شیڈ سے اپنا سامان حاصل کر سکیں 'اس وقت سامان کے سوا کائنات میں کچھ بھی نہ تھا۔ سامان ہماری منزل تھا۔ سامان ہمارا مقصود تھا۔ سامان ہمارا مطمح نظر تھا۔ کسی کو یاد نہ رہا تھا کہ ہم زائرین ہیں کہ ہم وہاں حج کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔ کسی کو شعور نہ تھا کہ یہ وہ سر زمین ہے جہاں بے سرو سامانی سامان بن جاتی ہے۔ وہ سب چلا رہے تھے: "اے سامان میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، اے سامان! میں حاضر ہوں۔"

آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹ گئی۔ باری باری سب اپنا اپنا سامان سینے سے لگائے شیڈ سے باہر نکل گئے۔ جب میں باہر نکلنے لگا تو دروازے پر کھڑے افسر نے میرا پاسپورٹ دیکھ کر کہا۔

"آپ ایئر پورٹ سے باہر نہیں جاسکتے۔"

"کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"کیوں کہ آپ نے ابھی تک معلم نامزد نہیں کیا اور واجبات ادا نہیں کیے۔"

"معلم کہاں ملیں گے؟" میں نے پوچھا۔

ادھر حاجی کیپ میں۔"

جدہ حاجی کیپ

حاجی کیپ ایک وسیع و عریض سہ منزلہ عمارت تھی۔ صحن کچھ کھج بھرا ہوا تھا جبکہ جگہ سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ سوٹ کیس، ٹرنک، بستر، ٹوکریاں، بیگ،



تھیلے۔ سامان کے ارد گرد اور اوپر ٹک ٹک کے زائرین بیٹھے تھے۔ کھوئے ہوئے، متکثر، پریشان حال۔ ان کے ارد گرد کھلے برآمدوں میں بنے ہوئے شالوں میں سعودی حکومت کے مختلف محکموں کے کارندے معروف کار تھے۔ شالوں پر بورڈ آویزاں تھے۔ ”وزارت حج۔“ ”وزارت صحت۔“ ”شعبہ انتظامیہ۔“

”معلم! معلم!“ میں نے چلا چلا کر چار ایک راہ گیروں سے پوچھا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ ہر کوئی شدت سے مصروف تھا، اپنے آپ میں گم تھا۔ ”معلم!“ اطلاعات کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر میں چلایا۔ کاؤنٹر پر کھڑے کارکن نے جواب میں قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ دی اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔

پہلی بار میں نے محسوس کیا میں اکیلا ہوں، اتنی بھیڑ میں اکیلا ہوں۔ اس سر زمین پر اکیلا ہوں، اجنبی ہوں، جس کا نام لیتے وقت میں گذشتہ پچاس برس اپنی انگلیاں چوم کر آنکھوں پر لگاتا رہا ہوں، اس گھر کی دہلیز پر اکیلا ہوں، جس کے نام سے زندگی بھر میرے جسم پر روٹنے کھڑے ہوتے رہے ہیں۔

دیر تک میں حاجی کیمپ کے وسیع و عریض صحن میں تن تنہا آوارہ پھرتا رہا۔ پھر دو عرب جھگڑتے ہوئے میرے پاس سے گزرے، وہ بار بار معلم معلم کی تکرار کر رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ اس امید پر کہ شاید کسی معلم تک پہنچ جاؤں۔ حاجی کیمپ کے ایک کونے میں وہ دونوں زینہ چڑھنے لگے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے لگا رہا، اوپر برآمدے میں پہنچا تو ایسا ریلا آیا کہ وہ دونوں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں پھر اکیلا رہ گیا، دیر تک اس بھیڑ میں اپنے کندھے چھیلتا رہا۔

ناگاہ میری نظر کمروں کے دروازوں پر جا پڑی۔ دروازوں پر جگہ جگہ معلموں کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ معلم ہی معلم، معلم ہی معلم، اب سوال یہ تھا کہ کون سے معلم کے پاس جاؤں، کوئی ایسا معلم ہو جو پاکستانی زائرین سے متعلق ہو۔

معلم

حج کیمپ کے اس برآمدے میں گھومتے پھرتے میں نے محسوس کیا۔ جیسے میں کسی پاکستانی پکھری کی اس جانب آ پہنچا ہوں جہاں وکیلوں کے فنی بڑے بڑے تختوں پر ڈیک رکھے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں۔



برآمدے میں لوگوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ ان میں زائرین بھی تھے اور دوسرے بھی، بسکی اپنے اپنے کام میں کھوئے ہوئے تھے۔ بحث مباحثے میں معروف تھے جیسے پکھڑوں میں موکل اپنے اپنے مقدمے کی تفصیلات پر تبصرے کرتے ہوئے ادھر ادھر گھومتے پھرتے ہیں۔

کروں کے اندر موکلوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وکیل اور معلم اپنے اپنے ڈیسک پر بیٹھے کاغذات کی پڑتال کر رہے تھے۔ لوگوں کو سمجھا بھجا رہے تھے۔ رقیں وصول کر رہے تھے۔ کاغذات پر مہرس ثبت کر رہے تھے۔ آدھ گھنٹہ گھومنے پھرنے کے بعد میں محسوس کرنے لگا جیسے مجھ پر کسی نے مقدمہ کر رکھا ہو۔ اور میں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے لاہور کی کسی چھوٹی پکھری میں وکیل کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ حج کا خیال تو ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔

”اسلام علیکم۔“ ایک پاکستانی صاحب میرے پاس آکھڑے ہوئے۔ ”آپ کا نام ممتاز مفتی ہے کیا؟“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا ”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہاں میں ممتاز مفتی ہوں۔“

میں نے اپنی یادداشت کو للکارا، لیکن لا حاصل، وہ میرے لیے اجنبی تھے۔  
کنے لگے، ”آپ کو معلم نامزد کرنا ہے نا؟“  
”جی“ میں نے کہا۔

”تو آئیے“ وہ بولے ”میں ضروری کارروائی کرادوں۔“  
وہ صاحب مجھے ایک کمرے میں لے گئے۔ دیر تک وہ معلم سے عربی میں بات کرتے رہے پھر مجھ سے رقم لے کر ادائیگی کی۔ کاغذات پر مہرس لگوائیں اور آخر میں اطمینان کا سانس لے کر کہنے لگے ”لیجئے صاحب یہ کام تو طے ہو گیا۔“ انہوں نے کاغذات میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ ”لیکن آپ ہیں کون؟“ میں نے ان سے پوچھا ”معاف کیجئے میں نے آپ کو پہچانا نہیں“ وہ مسکرا دیے ”آپ نے مجھے اس لیے نہیں پہچانا کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے، میں سفارت پاکستان کا ایک رکن ہوں۔“ انہوں نے جواب دیا ”دراصل مجھے ایئر پورٹ پر جلد پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں شہاب صاحب کو ریسیو کرنے آیا ہوں۔ مجھے پہلے سے ہی علم تھا کہ آپ شہاب صاحب کے ساتھ آرہے ہیں۔ یہ سب ”فار میٹیر“ سرانجام دینا میں نے اپنے ذمہ لیا تھا۔“



”لیکن قدرت اللہ شہاب کہاں ہیں؟“ میں نے ان سے پوچھا۔  
 ”دراصل ان کو آپ سے پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن ان کا جہاز لیٹ  
 ہو گیا ہے۔ وہ بعد از دوپہر یہاں پہنچیں گے۔ آئیے اب میں آپ کو وہاں پہنچا دوں جہاں  
 آپ کو ان کا انتظار کرنا ہے۔“

### ہنی مون کمرہ

سفارت کا وہ کارکن مجھے ایک کوچھی میں لے گیا جس کا وسیع و عریض بیرونی  
 صحن خوبصورت ٹائلوں سے بنا ہوا تھا۔ کوچھی سے باہر صحن کے ایک جانب ایک چھوٹا  
 سا کمرہ تھا، ان صاحب نے اس ملحقہ کمرے میں میرا سامان رکھوا دیا پھر کہنے لگے: ”آپ  
 یہاں آرام کیجئے میں اب ایئرپورٹ پر جاتا ہوں تاکہ شہاب کو ریسیو کر لوں۔ کسی چیز کی  
 ضرورت ہو تو یہ مٹن دبا دیجئے۔ ملازم حاضر ہو جائے گا۔ خدا حافظ۔“

میں نے کمرے کا جائزہ لیا ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ”ہنی مون“ کمرہ ہو۔ فوم  
 ڈبل بیڈ، قد آدم آئینے، ٹالیچے، فوم صوفہ سیٹ اور ایک اکساتی ہوئی ایئر کنڈیشن  
 مشین۔ کمرہ تمام ساز و سامان سے لیس تھا، صرف ایک کسریاتی تھی۔ میں محسوس کرنے  
 لگا کہ ابھی ایک لمبے کھلے بالوں والی لڑکی اندر داخل ہو کر کہے گی ”ہائی“ اور پھر فوم بیڈ

خوف سے میرا گلا خشک ہو گیا۔ میرے لیے کمرے میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔  
 ایسے محسوس ہونے لگا جیسے منزل میری نگاہ سے اوچھل ہو چکی ہو۔ جیسے میری آمد کا  
 مقصد فوت ہو چکا ہو۔ دل میں کئی ایک سوالات ابھرے آخر میں یہاں کیوں آیا ہوں۔  
 کیوں۔ کیا اس لیے کہ اس ہنی مون کمرے میں کوئی آکر مجھے کہے ”ہائی“ میں نے ایک  
 جست بھری اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

### خالی صحن

برآمدے کے فرش پر بیٹھ کر میں نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ سامنے ٹائلوں  
 سے بنا ہوا وسیع صحن تھا۔ دیر تک میں اس صحن کو دیکھتا رہا۔ ظاہر تھا کہ وہ کوچھی  
 سفارت پاکستان سے متعلق تھی۔ دفتر یا شاید گھر، یا مہمان خانہ، پتہ نہیں کیا۔ لیکن وہ  
 صحن خالی کیوں تھا حج کے دنوں میں پاکستانی سفارت کا اتنا وسیع و عریض ٹائلوں سے بنا ہوا



محن خالی کیوں ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس محن کی ایک ایک ٹائل پاکستانی زائرین کے لیے رو رہی ہو، چلا رہی ہو، بین کر رہی ہو۔

پھر آہستہ آہستہ وہ بین سسکیوں میں بدل گئے جیسے کوئی سسکیاں لے لے کر آہ و زاری کر رہا ہو۔ ”اے اللہ کیا میرا وجود اتنا ہی بے معرف ہے کہ ان متبرک دنوں میں بھی مجھ سے کوئی کام نہیں لیا جاسکتا؟“

دفعتا ”ایک دھماکے سے صدر دروازہ کھل گیا۔ زائرین کا ایک ریلا اندر گھس آیا، پھر ان کا تانا بندا بندھ گیا۔ اپنا سامان اٹھائے وہ محن میں گھستے چلے آئے۔ حتیٰ کہ وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔“

گروہوں کی صورت میں سارے محن پر پھیل گئے۔ کچھ لوگ بستر کھولنے میں مصروف ہو گئے، کچھ چائے بنانے کے لیے چولہے جلانے لگے۔ کئی ایک نے مصلے بچھا کر نماز پڑھنا شروع کر دی۔ محن میں عجیب سی گھما گھمی پیدا ہو گئی۔ اس گھما گھمی کو دیکھ کر پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میں حج کرنے کے لیے آیا ہوں۔ پہلی مرتبہ میرے دل کی گہرائیوں سے آواز اٹھی۔ ”اے اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں اے اللہ۔“

پھر ایک خوف ناک کتا کوٹھی سے نکلا اور بھونکتا ہوا زائرین کی طرف لپکا۔ اس خوفناک کتے کو دیکھ کر زائرین خوف سے اٹھ کر صدر دروازے کی طرف بھاگے۔ دیکھتے دیکھتے محن زائرین سے خالی ہو گیا۔ دیر تک کتا صدر دروازے میں کھڑا ہو کر بھاگتے ہوئے زائرین کو بھونکتا رہا۔ پھر وہ مڑا۔ میری طرف دیکھا۔ رک گیا۔ پھر مجھے بھونکنے لگا لیکن یہ بھونک اور رنگ کی تھی اس میں دھمکی نہ تھی، تمسخر تھا جیسے طعنے دے رہا ہو۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے، تیرا یہاں کیا کام جا چلا جا۔“ میں نے لپک کر اپنا تھیلا اٹھایا اور بھاگ کر صدر دروازے سے باہر نکل گیا۔ گلی میں کچھ دور تک میں بھاگتا رہا پھر چلنے لگا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز دور تک سنائی دیتی رہی حتیٰ کہ موڑ مڑ کر میں بازار میں داخل ہو گیا۔

بازار

بازار میں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ راہ گیر اپنی اپنی دھن



میں چلے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر مصروفیت کی کھیاں بھننا رہی تھیں، انداز میں خشک کاروباری چستی تھی۔ ان کی آنکھوں میں خوابوں کے دیے روشن نہ تھے بلکہ ان پر حقائق پسندی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ انداز سے ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے انہیں خبر ہی نہ ہو کہ ان کی سر زمین پر ایک عظیم واقعہ ہونے والا ہے۔ ایسا عظیم واقعہ جس کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ وہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔

جدے کے بازاروں میں زائرین احرام باندھے ہوئے گھوم پھر رہے تھے لیکن دکانداروں کے سوا کسی کو ان کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ وہاں کوئی زائر نہیں تھا، صرف خریدار، گاہک۔ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ شاید میں غلطی سے کسی اور جگہ آ گیا ہوں۔ نہیں نہیں یہ وہ سر زمین نہیں ہے۔ پی آئی اے والے غلطی سے مجھے یہاں لے آئے ہیں۔ یہ مکہ شریف کی دہلیز نہیں بلکہ کوئی اور شہر ہے ورنہ انہیں خبر ہوتی، احساس ہوتا۔

لوگوں سے مایوس ہو کر میری نظر سڑک کے دو روئیہ کھڑی عمارتوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ کتنی عالی شان عمارتیں ہیں۔ جب میں ان خوبصورت عالی شان عمارتوں کو دیکھ رہا تھا تو مجھے کسی نے کہنی ماری اور زیر لب کہا۔ اونہوں یہ وہ جگہ نہیں۔ پھر مجھے راولپنڈی کے کوئلہ سنٹر والے بابا کا کمرہ یاد آ گیا۔

### کوئلہ سنٹر والے بابا

۱۹۶۲ء کی ایک شام کو راولپنڈی صدر میں گھومتے ہوئے میرا ایک بہت پرانا دوست مل گیا۔ دیر تک ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بازار میں کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر میں نے اس سے کہا ”چلو کہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔ ہوٹل میں چلتے ہیں۔“

”ہوٹل کیوں؟“ وہ بولا ”بابا کی کوٹھڑی جو ہے۔ وہاں چائے بھی ملے گی۔ عمدہ چائے اور پھر مفت، تم کوئلہ سنٹر کے بابا کو نہیں جانتے کیا؟ حیرت ہے۔“

چند ایک قدم چلنے کے بعد ہم بابا کی کوٹھڑی میں جا داخل ہوئے۔

وہ ایک اندھیری کوٹھڑی تھی۔ چند ساعت کے لیے تو نگاہ دھندلائی رہی۔ پھر شکلیں ابھریں۔ سامنے کھدر کا جبہ پہنے بابا براجمان تھے۔ ان کے روبرو پتھر کے طبخ میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ دیئے کی دھندلی روشنی میں دیواروں کے ساتھ ساتھ دو روئیہ



بیٹھے ہوئے لوگ نیم دروں، نیم بروں، یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے ہستی اور نیستی کے درمیان جھول رہے ہوں۔

ہم دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد اس دھندلی روشنی نے منظر کو ایک بے نام تاثر سے بھگو دیا۔ ہم پر ایک عجب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ کچی دیواریں کھدر میں ملبوس بابا، چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے سب لوگ عجز کی اس بے نام کیفیت سے سرشار تھے جو طاری ہو جائے تو ساری کائنات سرسبز ہو جاتی ہے۔

کئی ایک مہینوں کے بعد ہمیں پھر اسی بازار سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا: ”چلو یار کچھ دیر کے لیے بابا کی کوٹھڑی میں جا کر بیٹھیں۔“ بابا کے کمرے میں داخل ہو کر میں بھونچکا رہ گیا۔ ”نہیں نہیں یہ وہ کمرہ نہیں ہم غلطی سے کسی اور جگہ آ گئے ہیں۔ وہاں تو سماں ہی اور تھا کچی کوٹھڑی کی جگہ چمکتی ہوئی ٹائلوں کا بنا ہوا کمرہ جو دو دھیا ٹوبوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ سامنے تخت پر بابا سبز چغہ پننے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مغلیہ شہنشاہ اپنے نورتنوں کے ساتھ محفل سجائے بیٹھا ہو۔ میرے دوست نے جھٹھے کہنی ماری۔ زیر لب کہا: ”چلو چلیں اب یہاں وہ بات نہیں رہی۔“

جدہ کی عالی شان عمارتوں، کارپٹ سڑکوں اور کاروباری بے اعتنائی کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے میں بابا کے منور کمرے میں آ گیا ہوں۔ پھر مجھے کسی نے کہنی مار دی، زیر لب آواز آئی۔ چلو یار چلیں یہاں وہ بات نہیں۔

سچ جاننے میں ایک خاصا لکھا پڑھا فرد ہوں اور آج کی دنیا کے متعلق خاصی بنیادی معلومات رکھتا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ جب سے سرزمین حجاز پر تیل نے دھاوا بولا ہے تاریخ کے سوا وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ اس کے باوجود پتہ نہیں کس اصول کے تحت میں سمجھتا تھا کہ جب میں سرزمین جدہ پر قدم رکھوں گا تو ٹائم مشین پیچھے گھوم جائے گی۔ جدہ وہی پرانا جدہ ہو گا جس کا نقشہ برٹن صاحب اور کین صاحب نے کھینچا ہے۔ عرب وہی عرب ہوں، شہر وہی شہر ہوں گے۔ سڑکوں پر اونٹوں کے قافلے چل رہے ہوں گے اور شہر سے باہر چاروں طرف تاحد نظر ریت ہی ریت ہی ریت۔



## مکہ روڈ

### ڈبے ہی ڈبے

جدہ کے بازار میں چلتے چلتے مجھے ٹھوکر لگی۔ رک گیا۔ سامنے فٹ پاتھ پر ایک بہت بڑی پیٹی رکھی ہوئی تھی۔ ایسا صندوق جس میں ہم گھر میں رضائیاں اور لحاف رکھتے ہیں۔ پیٹی پر ڈھکنا نہیں تھا۔ میں نے پیٹی کے اندر جھانکا۔ ڈبے ہی ڈبے ہی ڈبے۔ ساری پیٹی رنگا رنگ کے ڈبوں سے بھری ہوئی تھی۔ گلاسوں جتنے بڑے تین کے ڈبے جن پر خوبصورت رنگوں میں لیبل چسپے ہوئے تھے اور ان ڈبوں کے ارد گرد برف کے ٹکڑے پڑے تھے۔

ایک راہ گیر رک گیا اس نے پیٹی میں ہاتھ ڈالا ایک ڈبہ نکالا۔ اٹلی کا ہٹا ہوا جوس۔ دوسرا نکالا میڈان پیرس 'ہالینڈ' سپین۔ اس نے ایک ڈبے میں چھید کیا۔ غٹا غٹ جوس پیا، پیسے صندوق پر رکھے اور چل پڑا۔

ارے یہاں تو پانی کی بالٹی دو روپے میں ملا کرتی تھی لیکن یہ ملک ملک کے بنے ہوئے جوس کے اتنے سارے ڈبے۔ میں نے حیرت سے ایک بار پھر ڈبوں کی طرف دیکھا۔ ڈبوں میں حرکت ہوئی پھر باری باری سارے ڈبے پیٹی سے باہر نکل آئے اور فٹ پاتھ پر دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔

### آخری دن

"دیکھا" اسے کہتے ہیں افراط۔ "اوپر کے ڈبے میں چھپی ہوئی شکل چلائی۔

پھر ییلوں کی تمام اشکال قہقہے مار کر نہیں "افراط" افراط۔"

دفعتا "میرے ذہن کی گراری نے بیک ماری۔ فلیش بیک۔۔۔۔۔ اس



روز قدرت اور میں باتیں کر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیسے افراط کا ذکر چھڑ گیا تھا۔  
 ”افراط باعث برکت نہیں ہوتی۔“ وہ بولے۔

”افراط تو خود برکت کا دوسرا نام ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”نہیں“ وہ مسکرائے ”پہلے میرا بھی یہی خیال تھا“ پھر بدل گیا۔

”کب بدلا؟“ میں نے پوچھا۔

”جب میں پہلی مرتبہ حج پر گیا تھا۔“

”جہاں نالے کے کنارے نالے کا کنارہ تھا“ جہاں آپ نے درمی بچھا کر قیام کیا تھا۔“

”ہاں“ وہ بولے ”وہاں میں نے پہلی بار کبڑے کی دوکان پر افراط کا عالم دیکھا۔ ایک چھابے میں آلو پڑے تھے، دوسرے میں پیاز، تیسرے میں سویٹرز لینڈ کی بنی ہوئی رسٹ واچز تھیں۔“

”ہاں ہاں“ وہ بولے ”ایک چھابہ رسٹ واچز سے بھرا ہوا تھا۔ ایک جدید ترین کل دار کھلونوں سے۔ ایک طرف ریڈیو سیٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور پیچھے چار فرج کھڑے تھے۔“

”کبڑے کی دوکان پر فرج؟“

”ہاں ہاں فرج۔“ وہ بولے۔

”اور وہ بکاؤ تھے؟“

”ہاں بکاؤ تھے۔ اس وقت میں اس افراط کو دیکھ کر حیران بھی ہوا تھا اور خوش بھی۔“

عین اس وقت پیچھے سے آواز آئی۔ ”اس افراط کے متعلق حضور اعلیٰ نے خود نشاندہی کی تھی۔“ میں نے مڑ کر دیکھا۔ نورانی شکل و صورت کے ایک بزرگ کھڑے تھے۔ ”کیا نشان دہی کی تھی حضور نے؟“ میں نے پوچھا۔ بزرگ نے جواب دیا کہ حضور نے فرمایا تھا: ایک ایسا دن بھی آئے گا جب اس سرزمین پر اشیاء اور زر کی افراط ہو جائے گی۔۔۔۔۔۔ وہ آخری دن ہوں گے۔

”آخری دن۔“ آخری دن۔ جوس کے ڈبوں پر چھپی ہوئی شکلیں تھمتے مارنے لگیں۔







”دکھتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”دکھتا ہے تو پڑا دکھے۔“ وہ بولے ”اسے اہمیت کیوں دیتے ہیں آپ؟“

”میرے اہمیت دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اہمیت دینے سے ہی تو فرق پڑتا ہے۔“ قدرت اللہ نے کہا۔ ”بہت فرق پڑتا

ہے۔ مولانا ارشد علی تھانوی روز ریل میں اپنے گاؤں سے شہر جایا کرتے تھے۔ ڈبے

میں بیٹھ کر وہ کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے چڑھا دیا کرتے۔ ایک روز ایک معتقد نے پوچھا:

”حضرت آپ اتنے اہتمام سے کھڑکیوں سے تختے کیوں چڑھا دیتے ہیں؟“ فرمایا ”ناک

توجہ منزل پر مرکوز رہے۔ راستے کے مناظر میں بھٹکتی نہ پھرے۔ راستے کے مناظر میں

نہ الجھو تو منزل پر پہنچنے پر آنکھیں تھکی ہوئی نہیں بلکہ تازہ دم ہوں گی۔“

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ حتی الوسع قدرت اللہ جیسوں کی باتوں میں نہ آنا

اور سکھی رہنا چاہتے ہو تو مولانا ارشد علی تھانوی سے برزگوں کے ارشادات کو پلے نہ

باندھنا۔

قدرت اللہ کی باتیں ایک وقت مجھے ایسے لگتی ہیں جیسے زبانی ہو۔ خالی باتیں

کتابوں سے چنے ہوئے چمکدار جملے۔ دوسرے لمحے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان

کے ایک جملے میں ایک دنیا آباد ہو۔ جیسے ہر جملہ حرف آخر ہو، پھر میرے دل پر ایک

آرا چلتا ہے حرف آخر، بے معنی حرف آخر، حرف آخر، حرف بے معنی۔

شخصیت کے تحفظ کے بارے میں زرتشت کہتا ہے ”دیکھ اپنی میں۔ میں آرا

چلنے نہ دیجو ورنہ۔ نہ میں رہے گی نہ تو تک پہنچ پائے گا۔“

جدہ پبلش پر موٹر رک گئی۔ جدہ پبلش جدے کاسب سے بڑا ہو ٹل ہے جہاں

قدرت اور ان کی بیگم کے لیے کرا پہلے سے ریزرو تھا۔ وہ کمرانچی چھت کا بیٹا سجا کو تر

خانہ تھا۔ سارا جدہ پبلش، کمرے، برآمدے، باتھ، تیز اور شدید ایئر کنڈیشن میں ٹھنڈ

رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں ایئر کنڈیشن موسم کارو عمل نہیں کرتا۔ بلکہ برفانی کیفیت پیدا

کرتا ہے۔ گرمیوں میں اس کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ کینوں کے دانت بجیں۔

دانتوں کے علاوہ میرا گلابھی بننے لگتا ہے، دم گھٹتا ہے نہ جانے کیوں؟

کتے اور قافلے



میں نے قدرت سے کہا ”میں اب چلتا ہوں۔“  
 ”اچھا“ وہ بولے۔ ”کل صبح تیار رہیے ہم سویرے ہی مکہ شریف کو روانہ ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ۔“

”ابھی کیوں نہ روانہ ہو جائیں؟“ میں نے کہا۔  
 ”کیوں“

”میرے لیے یہاں رات بسر کرنا بہت مشکل ہے۔“  
 ”کیوں۔ کیا جگہ تکلیف دہ ہے؟“  
 ”ہاں“ میں نے کہا۔ ”بہت تکلیف دہ۔“  
 ”کیا تکلیف ہے؟“

”میرے کمرے کے سامنے ٹائلوں کا بنا ہوا وسیع و عریض صحن ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اس میں تکلیف کی کیا بات ہے؟“ وہ مسکرائے۔

”وہ وسیع و عریض صحن خالی پڑا ہے۔ حج کے دنوں میں خالی پڑا ہے۔“  
 وہ مسکرائے۔ ”تو اسے زائرین سے آباد کر لیجئے۔“

”لیکن کوٹھی کا خوفناک کتا وہ بھونک کر زائرین کو بھگا دیتا ہے۔“  
 ”کتے کی آواز نہ سنئے۔“ قدرت نے سنجیدگی سے کہا۔

”کتے بھونکتے رہتے ہیں، قافلے چلتے رہتے ہیں۔“ وہ بولے۔  
 ”میرا قافلہ نہیں چلتا۔“

قدرت نے میری بات ان سنی کر دی۔ بولے ”دنیا میں بھونکنے والے کتے بہت ہیں۔ جینا چاہتے ہیں تو ان کی آواز نہ سننے کی صلاحیت پیدا کریں۔“  
 پچھلی رات تک کتا و قفوں سے بھونکتا رہا۔ زائرین کے قافلے آتے رہے جاتے رہے۔ صحن آباد ہوتا رہا۔ ویران ہوتا رہا۔ میں برآمدے کے فرش پر دیوار سے سرٹیکے بیٹھا رہا۔ کمرے میں جاتا تو وحشت سی سوار ہو جاتی۔ اپنے احرام کو دیکھتا تو ایسے لگتا جیسے فقیر محل میں آگھسا ہو کئی بار جی چاہا کہ احرام کو اتار کر سیلینگ سوٹ پہن لوں اور ڈبل بیڈ پر لیٹ کر لمبے بالوں والی لڑکی کا انتظار کروں جو آکر مجھے ہائی کمنے۔ پھر احرام پر نظر پڑ جاتی۔ شرمندہ ہو جاتا۔



احرام سمیت بیڈ پر لیٹا تو کمرے میں لگا ہوا ایئر کنڈیشن با آواز بلند طعنے دیتا:  
اے اللہ میں حاضر ہوں۔" پھر قہقہے لگاتا۔

اس روز جدے میں تو میں بالکل غیر حاضر تھا۔ اس کی نسبت تو اپنے گھر میں  
چٹائی پر بیٹھے ہوئے میں کہیں زیادہ حاضر رہا کرتا تھا۔ ان جانے میں حاضر ہو جاتا۔ اپنی  
طبعی ناشکری کے باوجود شکرگزاری کی ایک لہر اٹھتی۔ "اے اللہ تو نے مجھے اتنا کچھ دے  
رکھا ہے اتنا کچھ۔ پھر تو مجھے قدم قدم پر سنبھالتا ہے۔ سہارا دیتا ہے۔"  
شکرگزاری کی یہ لہر مجھے حضوری میں لے جاتی۔

لیکن جدے میں تو اللہ تعالیٰ میری زندگی سے بالکل خارج ہو چکے تھے۔ میری  
زندگی سے ہی نہیں بلکہ یوں لگتا تھا جیسے ساری کائنات سے خارج ہو چکے ہوں۔  
ایئر کنڈیشن مجھے اللہ کی یاد نہیں دلا رہا تھا، وہ تو مجھے احرام پہننے پر طعنے دے رہا  
تھا۔ میرا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں، صدر دروازے سے باہر نکل جاؤں اور کسی بد  
رو کے کنارے دری بچھا کر سو جاؤں۔

میں لپک کر باہر نکلا صحن میں زائرین کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ وہ سب اپنی اپنی  
دزیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میں نے اپنی دری برآمدے میں فرش پر بچھالی اور  
اونگھنے لگا۔

## روایتی

اگلے روز نوبے کے قریب ایک کالی سیاہ اتنی لمبی مرٹیز صدر دروازے پر  
آرکی۔ اس میں سے ایک خوش شکل بانکا عرب جوان نکلا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا  
سلام علیکم۔ "وہ بولا" چلئے آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ ہمیں فوراً" مکہ معظمہ کی طرف  
روانہ ہو جانا چاہیے۔"

"آپ کی تعریف؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام غنی ہے۔ سعودی حکومت نے مجھے شہاب صاحب کا رابطہ افسر مقرر  
کیا ہے۔"

"تو کیا شہاب صاحب سیکرٹری تعلیم کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں؟" میں نے

پوچھا۔







جائے گا۔ توجہ پہ جائے گا۔

۱۔ لیکن روڈ کے نوجوان فقیر نے کھڑکی سے جھانکا۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ تیری فائل بنی ہوئی ہے۔

پھر مرینڈیز کی ہر کھڑکی کے فریم پر میرے گذشتہ خوابوں کے مناظروں روشن ہو گئے جیسے وہ فریم نہیں بلکہ ٹی وی کے متعدد سکرین ہوں۔

قدرت اللہ کی باتوں میں اثر ہے یا نہیں مجھے نہیں پتہ۔ البتہ ان کی باتیں عجیب و غریب قسم کے Hallucinations قائم کر دیتی ہیں۔ بالکل ویسے Hallucinations جیسے خاور صاحب کے سامنے قائم کر دیے گئے تھے۔

### خاور

خاور فیشن زدہ، رومان پسند، آوارہ مزاج نوجوان تھا۔ اسے صرف دو باتوں سے دلچسپی تھی: خود بننا سنورنا اور خوش شکل عورتوں کو پھنسانا۔

ایک روز لاہور کی ایک ویران سڑک پر اس نے ایک خوش شکل رنگ رنگیلی عورت کو دیکھا جو بار بار مڑ کر خاور کی طرف دیکھتی اور مسکاتی تھی۔ ایسی جاذب توجہ العز کو مائل بہ کرم دیکھ کر خاور اپنی تمام مصروفیات بھول گیا اور اس نازنین کا پیچھا کرنے لگا۔

جب سڑک سنسان ہو گئی تو اس نے چار ایک لمبے ڈگ بھرے اور نازنین کے مقابل جا کر اس کی بانہ پکڑ لی۔ نازنین نے مسکرا کر خاور کی طرف دیکھا۔

ارے۔ نازنین کے چہرے پر تو اتنی لمبی داڑھی تھی۔ خاور گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ نازنین نما بزرگ بولے، 'نہیں نہیں کوئی فرق نہیں۔ غور سے دیکھو میاں تو کوئی فرق نہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے خاور کی بانہ پکڑ لی۔ خاور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور آج وہ خود چھاج سی لمبی داڑھی لمبے واپڈا کے ایک اکاونٹ آفس میں بیٹھا ہے۔

قدرت اللہ کی بھی وہی مصداق ہے۔ کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ایک شوخ مزاج رنگیلے دانشور ہوں اور کبھی وہ منہ موڑ کر دیکھتے ہیں تو ان کے چہرے پر لمبی داڑھی دیکھ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔



## سرراہ ہوٹل

ایک دھچکا لگا۔ موٹر رک گئی۔

سڑک کی ایک جانب ایک بھدی سی عمارت بنی ہوئی تھی، دوسری جانب ایک لباچوڑا شیڈ تھا۔ شیڈ میں بے ڈھب سی میزیں پڑی تھیں جن کے ارد گرد کھجور سے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چارپائیاں تھیں۔ جنہیں مسافر کرسیوں کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

شیڈ کے ایک طرف چائے کی دکان تھی۔ دھوئیں سے کالی کیتلیاں چولھوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ میل سے اٹے موٹے ڈبے پاس دھرے تھے۔ دوسرے کونے پر ایک عارضی چولہے پر بہت بڑی کالی سیاہ کڑاہی چڑھی ہوئی تھی جس میں روغن تھا۔ پاس ہی میلی چکٹ چادر میں نمک اور ہلدی لگی ہوئی کئی ایک چھوٹی بڑی مچھلیاں لپی ہوئی تھیں۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے ہم صوبہ سرحد کے کسی قبائلی علاقے کی سڑک پر بنے ہوئے ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔

غنی کے کہنے پر ہمیں ایک الگ کرا کھلوا دیا گیا، جس میں چٹائی پھسی ہوئی تھی۔ وہاں ہم ایک ڈیڑھ گھنٹہ رکے۔ نان مچھلی کھائی، چائے پی، ظہر کی نماز پڑھی اور پھر سے مکہ معظمہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

میں نے قدرت سے کہا ”یہ ماحول جانا پہنچانا سا لگتا ہے۔“  
ڈاکٹر عفت ہنسنے لگی، بولی ”کیوں نہ ہو جانا پہنچانا، ہمارے تمدن کا مخرج و منبع جو ہوا۔ ہمارے آباء ہی ماحول لے کر برصغیر میں آئے تھے۔“

”ہاں جیسی۔“ میں نے کہا اور پھر سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔  
کالی سڑک مسلسل دوڑ رہی تھی۔ اس پھیلے ہوئے ویرانے میں وہ کالی سڑک عجیب سی معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی گاؤں کی گنوار نے سر پر ناکون کاربن باندھ رکھا ہو۔

سڑک دوڑ رہی تھی۔ منظر ساکت تھا۔  
کبھی کبھار دور چھوٹے ٹیلے دکھائی دیتے تھے۔ ویران نگر ٹیلے۔ بے آب و



گیاہ ہمارے ہاں کے بجر ٹیلوں میں بھی زندگی کی رمتق ہوتی ہے لیکن ان ٹیلوں کے پتھروں پر عجیب سی مرونی چھائی ہوئی تھی۔ چاروں طرف مرونی اور اداسی کے انبار لگے ہوئے تھے۔

”انشاء اللہ ہم ایک گھنٹے تک مکہ معظمہ میں ہوں گے۔“ قدرت اللہ نے کہا۔

”مجھے تو مدینہ منورہ سے دلچسپی ہے“ میں نے جواب دیا۔

”اور مکہ معظمہ؟“ ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

”کہاں میں کہاں اللہ میاں۔ میں انہیں نہیں جانتا۔“ میرے منہ سے نکل گیا۔

موٹر میں ایک گہری خاموشی طاری ہو گئی جیسے کنوئیں میں پتھر گرنے کی آواز کے بعد پراسرار عمیق و بسیط خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔

انہیں کتنا دکھ ہوتا

میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

جیسے چوٹ لگنے سے شیشہ چور چور ہو جاتا ہے۔

دفعتا ”مجھے یاد آیا یہ تو وہی چہرہ ہے۔ وہی چہرہ۔ حیرت سے میں بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

پاکستان سے روانگی کے سات آٹھ دن پہلے میں سکوتر پر اسلام آباد سے پنڈی آ رہا تھا۔ راستے میں ایک دوست مل گئے۔ میں رک گیا۔ سڑک سے ہٹ کر ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ قریب ہی ایک سفید ریش بزرگ نماز پڑھنے میں مصروف تھے۔

”سنا ہے تم بیت اللہ جا رہے ہو؟“ میرے دوست نے پوچھا۔

”یار“ میں نے حسب عادت بے سوچے سمجھے جواب دیا۔ ”مجھے اللہ سے کیا

لینا دینا ہے“ البتہ جی چاہتا ہے کہ مدینہ منورہ میں حاضری دوں۔ حضور اعلیٰ کو سلام کروں۔“

سفید ریش بزرگ نے سلام پھیر کر دیکھا۔ ان کا چہرہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ جیسے

چوٹ لگنے سے شیشہ چور چور ہو جاتا ہے۔



دفعتا" میں نے محسوس کیا۔ جیسے وہ چہرہ بہت مانوس ہو، جیسے میں نے اسے بارہا دیکھا ہو۔ کہاں، کب، یہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔  
 "آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں" بزرگ بولے۔

"جی فرمائیے۔"

"آپ کو رسول اللہ سے اتنا لگاؤ لیکن اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کلمات آپ نے کہے ہیں۔ اگر حضورؐ سن لیتے تو انہیں کتنا دکھ ہوتا۔ کیا آپ کو اس بات کا اندازہ ہے؟"

بزرگ کی بات سن کر میں بہت شرمسار ہوا، لیکن میں نے کوشش کر کے ان جذبات کو دبا دیا۔ اگر میں غلطی کر بیٹھوں تو احساس ندامت کو دبا دیا کرتا ہوں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔

دوست کو خدا حافظہ کہہ کر میں سکوٹر پر سوار ہو کر چل پڑا۔

"انہیں کتنا دکھ ہوتا۔" میرے دل سے آواز ابھری۔ میں نے کوشش کر کے اسے دبا دیا لیکن وہ پھر ابھری۔ پھر ابھری۔ حتیٰ کہ سڑک پر چلتی ہوئی موٹروں کے ہارن چلا چلا کر کہنے لگے۔ "انہیں کتنا دکھ ہوتا، انہیں کتنا دکھ ہوتا۔" پھر ساری فضا اس آواز سے گونجنے لگی۔

کالی سڑک دوڑ رہی تھی۔ موٹر میں گہری خاموشی طاری تھی۔ ڈاکٹر عفت بت بنی بیٹھی تھی۔ قدرت اللہ کا چہرہ ریزہ ریزہ تھا۔ اس پر عجز و انکساری اور التجا کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر اتنا تاسف، اتنی ندامت تھی جیسے اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ کلمات میں نے نہیں بلکہ انہوں نے خود کہے ہوں۔ ان کے چہرے کا ریزہ ریزہ کہہ رہا تھا۔ "انہیں کتنا دکھ ہوا ہو گا۔" انہیں کتنا دکھ ہوا ہو گا۔  
 پھر دفعتا" مجھے یہ بات یاد آگئی۔

ایک روز میں نے قدرت سے پوچھا تھا "آپ کے نزدیک افضل ترین عبادت کون سی ہے؟"

بولے "افضل ترین عبادت ہم آہنگی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"جسے آپ Indetification کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی کسی صفت کو



اپنے پر طاری کر لیتا۔“

”انہوں“ میں نے جواب دیا ”باری تعالیٰ کو میں نہیں سمجھ سکتا۔ جو پانچ حواسوں میں مقید ہو وہ ایک غیر مرئی عظیم اور لامحدود طاقت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ پھر ہم آہنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔“

”حضور اعلیٰ“ جو ہیں۔ ان کے ساتھ تو Identification ہو سکتی ہے

تا۔“ قدرت نے جواب دیا۔

میں نے پھر سے قدرت کے ریزہ ریزہ چہرے کی طرف دیکھا۔ انہیں اتنا دکھ ہو رہا ہے۔ کیا قدرت افضل ترین عبادت میں مصروف ہیں۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر عفت نے سر اٹھا کر غور سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور پھر ایک لمبی آہ بھر کر آنکھیں جھکالیں۔ کیا یہ اپنے شوہر کے دکھ کو محسوس کر رہی ہیں؟ میں نے سوچا۔

ندامت سے میری پیشانی بھیگ گئی۔

دیر تک میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

قدرت اور عفت دونوں خاموش تھے۔

رابطہ افسر غنی پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

عرب ڈرائیور چپ چاپ گاڑی چلا رہا تھا۔

پتہ نہیں ہم سب کتنی دیریوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر دفعتاً ”غنی کی آواز

نے ہمیں چونکا دیا: ”ہم مکہ معظمہ میں داخل ہونے والے ہیں۔“



## مکہ معظمہ

موٹر ایک پرانی وضع کے قصبے میں داخل ہو گئی۔ تنگ کھڑکیوں والی بھدی بو جھل دیواریں۔ بے ڈھب حویلیاں، چنگلے، کوٹھڑیاں، خم کھاتی ہوئی تنگ گلیاں۔

قصبہ

قصبے کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ شہر خود ایک اونچے ٹپے پر واقع تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے غلطی سے مکے کی بجائے ہم سیالکوٹ جا پہنچے ہوں۔ میں نے شدت سے کوشش کی کہ جذبہ احترام سے میرا بند بند بھیگ جائے لیکن بے سود۔

میں نے سوچا حضورؐ ان گلی کوچوں میں گھوما پھرا کرتے تھے۔ ان ٹیلوں پر ان کے قدموں کے نشانات اب بھی موجود ہوں گے۔ اس فضا میں آپؐ کی آواز کی لہریں ابھی تک رواں دواں ہوں گی۔

ایسی پاکیزہ سوچیں دل میں لانے کی میں نے شدید کوششیں کیں لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ میری نگاہ میں وہ قصبہ عام سا قصبہ ہی رہا۔ ان سڑکوں، دیواروں، مکانوں میں کوئی تقدس پیدا نہ ہو سکا۔

موٹر رک گئی۔ ”ایک منٹ۔“ غنی نے موٹر سے اتر کر کہا۔ اور پھر وہ ایک بارک میں داخل ہو گیا۔

”آپ تو مہمان خانے میں رہیں گے۔“ میں نے قدرت سے کہا۔

”پتہ نہیں۔“ وہ بولے۔

”مجھے اپنے معلم کا ڈیرا تلاش کرنا ہو گا۔“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”لیکن آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاء



اللہ ہم زیادہ وقت اکٹھے ہی گزاریں گے۔“  
 غنی واپس آگیا۔ موٹر پھر چل پڑی۔  
 دیر تک ہم اس قصبے میں گھومتے رہے۔  
 پھر غنی چلایا ”ذرا روکو“ عرب ڈرائیور نے موٹر روک لی۔ ”ایک منٹ“  
 کہہ کر غنی پھر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔  
 گھنٹہ بھر ہم اس قصبے میں چکر لگاتے رہے۔ غنی کئی ایک بار مختلف عمارتوں  
 میں گیا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے غنی سے پوچھا۔  
 ”پہلے شہاب صاحب کی آمد کی رپورٹ کی تھی۔ اب مہمانداری کے دیگر  
 انتظامات کر رہا ہوں۔“ غنی نے جواب دیا۔

### فندق الکلی

آخر موٹر ایک بھدی سی پرانی مگر جدید وضع کی عمارت کے سامنے جا رکی۔  
 صدر دروازے پر جلی قلم سے لکھا تھا۔ ”فندق الکلی۔“  
 ”آئیے تشریف لائیے۔“ غنی نے کہا ”اس ہوٹل میں آپ کے قیام کا  
 بندوبست کیا گیا ہے۔“

”وہ ایک پرانی وضع کا ہوٹل تھا۔ جیسے کمپنی بہادر کے دور میں سکھ بند  
 انگریزوں کے ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ ضخیم دیواریں، بھاری بھارے ستون، اونچی چھتیں،  
 فراخ زینے۔“

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک بڑا سا برآمدہ تھا۔ سامنے اندرونی  
 صحن میں پرانی وضع کا باغیچہ تھا جس میں بڑے بڑے اور بھدے صوفے رکھے ہوئے  
 تھے۔ ان صوفوں پر دوہرے بدن کی میسیں اور صاحب بیٹھے تھے۔ اگرچہ صاحب احرام  
 باندھے ہوئے تھے لیکن انداز سے یوں لگتا تھا جیسے سوٹ میں ملبوس ہوں۔ قریب جا کر  
 پتہ چلا کہ وہ انگریز نہیں بلکہ مصری اور ترک ہیں۔

ڈائنگ ہال کے قریب وردی میں ملبوس ”چاق و چوبند“ بیرے سٹولوں پر  
 بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ سارے ہوٹل میں خواب آلود کیفیت طاری تھی۔



ایک پرانی اور بھدی لفٹ کے ذریعے ہم فنٹ فلور پر پہنچے۔ غنی ہمیں کونے کے کمرے میں لے گیا۔ ایک جہازی ڈبل بیڈ روم میں اس نے سامان رکھوا دیا اور قدرت سے کہنے لگا: ”یہ آپ کا اور بیگم صاحب کا کمرہ ہے۔“ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا ”اور اس سے ملحقہ سنگل روم آپ کا ہے۔“

”میرا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی آپ کا۔“ وہ بولا۔

”پتہ نہیں کیسے لیکن وزرات کو پہلے سے ہی علم ہو چکا تھا کہ آپ شہاب صاحب کے ساتھ آئے ہیں اس لیے انہوں نے آپ کے لیے بھی ایک کمرہ ایک کروایا ہے۔“

”لیکن مجھے تو اپنے معلم کے پاس ٹھہرنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کی مرضی ہے۔“ غنی نے جواب دیا۔ ”یہ کمرہ بہر حال خالی پڑا رہے گا چونکہ آپ کے نام پر ہے۔“

وہ پھر شہاب سے مخاطب ہوا بولا ”ایک موٹر اور ڈرائیور چوبیس گھنٹے آپ کی ڈسپوزل پر رہیں گے اور میں خود آتا جاتا رہوں گا۔ خدا حافظ۔“

غنی کے جانے کے بعد میں نے بڑی بے بسی اور لاچارگی بھری نگاہ سے قدرت کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولے ”جو آپ کا جی چاہے وہی کریں۔ جیسا بھی آپ چاہیں، لیکن فی الحال کچھ دیر کے لیے یہیں آرام کر لیں پھر حرم شریف میں حاضری دیں گے۔“

”آرام؟“ میں چلایا۔ ”کیا ہم یہاں آرام کرنے کے لیے آئے ہیں؟“ میں نے دل میں کہا۔

قدرت نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

اپنے کمرے میں جا کر میں دھڑام سے پٹنگ پڑ گیا۔

انگریز کی بو

کمرے کی ہر چیز سے انگریز کی بو آ رہی تھی۔ ہر چیز پر اس کی چھاپ لگی ہوئی







”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔“

”پتہ نہیں ان کی طبیعت کب ٹھیک ہو۔“

”جب بھی ہو۔ میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔“ میں اٹھ کر بٹنگ پر بیٹھ گیا۔

”انہیں کیا تکلیف ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اس قابل نہیں کہ مسجد الحرام تک چل کر جا سکیں۔“

”کچھ سمجھ نہیں آتا۔“ وہ بولیں ”کہتے ہیں ویسے میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن

جب حرم شریف جانے کا ارادہ کرتا ہوں تو ہڈیوں کے جوڑا کڑ جاتے ہیں، حرکت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔“

”ارے۔۔ یہ کیسی بیماری ہے ڈاکٹر صاحبہ“ میں نے کہا۔

”ڈاکٹر لوگ صرف دوائیوں سے واقف ہوتے ہیں بیماریوں سے نہیں۔ میں

سمجھتی ہوں یہ Resistance ہے۔ اسے Encourage نہیں کرنا چاہیے ورنہ

پتہ نہیں کیا ہو جائے۔ کیوں نہ انہیں زبردستی حرم شریف لے چلیں۔“ ڈاکٹر عفت نے

کہا۔ ”آئیے۔“ وہ بولیں۔

قدرت کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میرے دل میں کئی ایک سوالات

ابھرے۔

Resistance؟ کسی کی Resistance؟ کسی کی Resistance؟ کسی

کے خلاف Resistance؟

”چلے اٹھیے۔“ ڈاکٹر عفت نے قدرت کو یوں ڈانٹا جیسے وہ بچہ ہوں۔

قدرت نے بے بسی سے ہماری طرف دیکھا۔ ”نہیں۔“ انہوں نے اشارے

سے التجا کی۔

”نہیں۔“ ڈاکٹر عفت نے کہا۔ ”آپ حرم شریف جا رہے ہیں ابھی ہمارے

ساتھ۔ چاہے آپ کے جوڑا کام کریں یا نہیں۔“

حرم

چند ایک منٹ کے بعد ہم تینوں حرم شریف کی طرف جا رہے تھے۔ ہم دونوں

نے قدرت اللہ کو سہارا دے رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ قدم قدم چل رہے تھے اور



ہر چار ایک قدموں کے بعد سانس لینے رک جاتے تھے۔  
 آدھ گھنٹے میں ہم نے ایک فرلانگ کی مسافت طے کی۔ حرم شریف کے قریب پہنچ کر قدرت کی حالت دہشتناک "سدھر گئی۔ وہ رو بہ صحت ہو گئے۔  
 "اگر تم مجھے زبردستی نہ لائیں تو میں کبھی نہ آسکتا۔" قدرت نے ڈاکٹر عفت سے کہا۔ ان کی آنکھیں شکر گزاری کے جذبہ سے چھلک رہی تھیں۔ "اب میں ٹھیک ہوں۔ اب میں چل سکتا ہوں۔"

"میں اس Resistance سے اچھی طرح واقف ہوں۔" ڈاکٹر نے فاتحانہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

دہشتناک "میری نگاہ سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ سامنے حرم شریف کی سلیٹی سنگ مرمر کی عظیم دیواریں کھڑی تھی جن میں اونچی اور عظیم الشان محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ دور چاروں طرف بلند پروقار مینار کھڑے تھے۔

میں نے حیرانی سے ان عظیم الشان دیواروں کی طرف دیکھا۔ سنگ مرمر کی سلوں پر رگ سنگ کے عجیب و غریب لیکن خوشنما نقش ابھرے ہوئے تھے۔

اس عظیم الشان دیواروں، ستونوں اور محرابوں کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اگرچہ میری حیرت میں خوشی کا عنصر موجود تھا۔ پھر بھی پس منظر میں مایوسی کی جھلک موجود تھی۔ میری یہ خوشی ایسی تھی جیسے فرنگی سیاح تاج محل کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے یا جیسے کوئی فنکار خوبصورت چیز کو دیکھ کر ایک بے نام فرحت محسوس کرتا ہے۔  
 اس خوشی میں عقیدت بھرے جذبے کا عنصر نہ تھا۔

ایمانداری کی بات ہے کہ میرے دل کی تہوں میں یہ گمان بھی نہ تھا کہ میرے اللہ کا گھر سنگ مرمر کی عظیم الشان دیواروں، محرابوں اور ستونوں سے سجا ہوا ہو گا۔ پتہ نہیں کیوں میرے دل میں یہ ایمان تھا کہ میرا اللہ سجاوٹ اور زیبائش سے بے نیاز ہے۔ وہ جو خود جاہ حشم ہے اسے ایسے جاہ و حشم سے کیا واسطہ؟

بچپن میں بڑے بوڑھوں نے "مولوی صاحب نے" "ماسٹر جی نے" سب نے بڑی محنت سے مجھے سمجھایا تھا کہ اللہ میاں بہت بڑے ہیں اور وہ بہت زود رنج ہیں۔ بات بات پر غصہ کھاتے ہیں۔ ان کی لائٹھی بے آواز ہے جسے گھمانے میں وہ اپنا بیشتر وقت صرف کرتے ہیں۔ وہ دوزخ کے دروازے پر بیٹھے ہیں اور ان کا واحد مشغلہ یہ ہے کہ



گنہگاروں کو پکڑ پکڑ کر دوزخ میں جھونکتے ہیں۔

سال ہا سال اللہ تعالیٰ کی یہ تصویر میرے سینے پر نقش رہی۔

ایک عمر گزرنے کے بعد میں نے جانا کہ اللہ تعالیٰ تو ایک گڈ ریا ہیں جنہیں اپنی بھینٹوں سے اتنی محبت ہے کہ ہر وقت انہی کے خیال میں محور رہتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ میرے اللہ کے گھر کے گرد مٹی یا ناکندہ پتھروں سے بنی ہوئی

دیوار ہو گئی۔

عظیم الشان دیواریں تو مقبروں کی ہوتی ہیں، میرے اللہ تو زندہ ہیں۔

عظیم الشان دیواریں تو مندروں کی ہوتی ہیں، میرے اللہ بت تو نہیں۔

بڑے غور سے ان حسین اور عظیم دیواروں کو دیکھتا ہوا میں صدر دروازے

سے حرم شریف میں داخل ہو گیا۔

اس عظیم مسجد میں چاروں طرف لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان گنت لوگ۔

ایک عظیم ہجوم۔ میں اس ہجوم کا جائزہ لینے لگا۔

خانہ خدا

قدرت نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، ان کی

آنکھوں میں ایک عجیب سی مسکراہٹ چمک رہی تھی۔ بولے۔ ”جناب خانہ خدا پر نظر

پڑے تو پوچھا کلمہ پڑھنا۔“

”پوچھا کلمہ؟“ میں نے دہرایا۔ میں تو صرف ایک کلمے سے واقف تھا۔

”خالی اللہ اکبر پڑھ لینا۔“ وہ بولے۔

میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ دفعتاً ”ترکی تعمیر کا حصہ آگے سے ہٹ گیا۔“

خانہ خدا میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

کالے پتھروں سے بنا ہوا ایک بھدا بے ڈھب کوٹھا جس پر سیاہ غلاف چڑھا

تھا۔

”پیشتر اس کے میں اللہ اکبر کہہ پاتا کوٹھے کی چھت سے کسی نے سر نکالا۔“

چہرے کی جھریوں میں محبت کا ایک طوفان ابھر سمٹ رہا تھا۔ آنکھیں ہمدردی کے بے پناہ

جذبے سے پر نم تھیں۔ پیشانی منور تھی۔ ہونٹوں پر لگاؤ بھری مسکراہٹ تھی۔ اس



سکراہٹ نے پتہ نہیں کیا کیا۔

میرے وجود کے نیتے کو گویا چنگاری دکھا دی گئی اور وہ زو۔ زو۔ زو۔ س سے راکٹ کی طرح فضا میں اڑ گیا۔ میرے بدن سرخ چیونٹے ریگنے لگے۔ ان سرخ چیونٹوں کے سروں پر جلتے دیے تھے۔ ان دیوں کے شعلے گویا انگلیاں تھیں جو سب کوٹھے کی طرف اشارے کر رہی تھیں۔ میری نس نس میں سوڈے کی بوتلیں کھل گئیں۔ ان سے بلبلے اٹھنے لگے پھر میرے قلب میں ایک دھماکہ ہوا۔ میرے وجود کی دھجیاں اڑ گئیں اور سارے حرم شریف میں بکھر گئیں۔

وہ عظیم الشان مسجد معدوم ہو گئی، زائرین کا وہ بے پناہ ہجوم چیونٹیوں میں بدل گیا۔۔۔ صرف کوٹھا۔ ابھرا۔ ابھرا گیا۔ ابھرا گیا۔ حتیٰ کہ ساری کائنات اس کی اوٹ میں آگئی۔

نہ جانے میں کہاں تھا کیا کر رہا تھا۔ ساری کائنات گویا فنا ہو چکی تھی۔ بلبلے کا ایک عظیم ڈھیر اس ڈھیر پر اللہ میاں بیٹھے تھے۔

طواف

پھر ایک نوجوان ملا جو پوچھ رہا تھا۔ ”طواف کرو گے؟“

”طواف؟“ میرے ذہن میں اس وقت اس لفظ کا کوئی مفہوم نہ تھا۔

”ہاں کریں گے۔“ قدرت اللہ کی آواز آئی۔

”گیارہ ریال ہوں گے۔“ نوجوان ملانے کہا۔

قدرت اللہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔“ ملا بولا ”جو میں پڑھوں اسے دہراتے جاؤ۔“

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

چار ایک قدم چلنے کے بعد قدرت گر پڑے۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد

ہو رہا تھا۔ چہرے پر بے بسی اور لاچارگی بھری سلوٹیں رینگ رہی تھیں۔

میں رک گیا۔

”جائیے جائیے۔“ قدرت نے اشارہ کیا۔

”لیکن آپ؟“ میں نے کہا۔







میرے اللہ میرے روبرو تھے اور میں ان کے گرد والہانہ گھوم رہا تھا۔  
 اس وقت میرے اللہ بت تھے اور میں بت پرست تھا۔ اس وقت اللہ کے  
 طواف سے بڑھ کر کوئی عیاشی نہ تھی۔ کوئی لذت نہ تھی۔ جی چاہتا تھا کہ طواف جاری  
 رہے۔ جاری رہے۔ جاری رہے۔

جاری رہے گا۔ کوٹھے کی چھت سے آواز آئی۔ پھر منی مزدلفہ 'عرفات' مدینہ  
 منورہ سب اس کوٹھے کی اوٹ میں آگئے۔ اور طواف جاری رہا۔



## مسجد الحرام

کہ معظمہ کے قیام کے دوران زائرین کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت حرم شریف میں گزاریں اس لیے حرم شریف ہر وقت زائرین سے کچا کھج بھرا رہتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر لوگ نوافل پڑھتے رہتے ہیں یا تسبیح کرتے ہیں یا قرآن خوانی میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو وہاں بیٹھ کر مطاف زائرین یا خانہ خدا کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر آپ وہاں بغیر کسی رسمی مصروفیت کے چوبیس گھنٹے خالی دیکھتے ہی ہیں تو بھی آپ کا دل اکتاتا نہیں۔

حرم میں سب سے بڑی کشش خانہ خدا ہے۔ جانے ان جانے میں زائرین کی نگاہیں اس کالے بے ڈھب کوٹھے پر مرکوز رہتی ہیں۔ پتہ نہیں خانہ خدا میں کیا کشش ہے کہ آپ کا جی چاہتا ہے اسے دیکھتے ہی چلے جائیں۔ پھر مطاف ہے۔ مطاف میں چوبیس گھنٹے طواف جاری رہتا ہے۔ طواف کرنے والوں پر ایک عجیب کیفیت طاری رہتی ہے۔ ایک ایسی کیفیت جسے دور بیٹھ کر دیکھنے سے ہی انسان شرابور ہو جاتا ہے۔ مطاف سے ہر وقت عقیدت، محبت اور عشق کے چھینٹے اڑتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ حرم کے صحن میں بیٹھے ہوئے زائرین میں بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ زائرین لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ عورتیں، مرد، بچے، نوجوان، بوڑھے رنگارنگ کے لوگ، مختلف قومیتوں کے لوگ حبشی، عرب، یورپی، چینی، جاپانی، روسی، ترکی، ایرانی، دنیا کے ہر ملک کے زائروں کے گروہ جگہ جگہ بیٹھے ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ان کا جذبہ محسوس کر کے دل میں ایک عجیب تقویت محسوس ہوتی ہے ایک بے نام فرحت۔

بیشتر زائرین حرم میں بیٹھ کر ذکر یا عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میں بھی اس مشغل کو اپناؤں لیکن میرا دل نہ مانا۔ جب محبوب سامنے ہو، اس کی موجودگی کو آپ بند بند میں محسوس کریں تو پھر ذکر اور حمد و ثنا کی کیا گنجائش



رہ جاتی ہے۔

کالا کوٹھا

میری نگاہیں خانہ خدا پر مرکوز تھیں۔ میں نے قدرت سے پوچھا۔ ”میں نے کہا یہ کالا کوٹھا جو ہے اس قدر بے ڈھبانا ہوا ہے اس میں اس قدر کشش کیوں ہے۔ جی چاہتا ہے اس پر نثار ہو جائیں۔“

”ارے صاحب ادب سے بات کیجئے۔ آپ اسے کالا کوٹھا کہتے ہیں۔“ میرے پاس بیٹھے ہوئے میر صاحب نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

”میر صاحب یہ اللہ کا کوٹھا ہی تو ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں پنجابی ہوں اور پنجابی میں خانہ کا مطلب کوٹھا ہوتا ہے۔ آپ اسے خانہ خدا کہتے ہیں میں اسے اللہ کا کوٹھا کہتا ہوں۔“

میر صاحب مصرحتے کہ کوٹھے کے لفظ میں تحقیر کا عنصر ہے دراصل وہ اہل زبان تھے اور انہیں پنجابی کے ہر لفظ سے تحقیر کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے برعکس مجھے کوٹھے کا لفظ پیارا لگتا تھا۔ اس میں اپنائیت محسوس کر رہا تھا۔

میں نے زندگی میں بہت سے کوٹھے دیکھے ہیں لیکن خانہ خدا جیسا کوٹھا کبھی نہیں دیکھا۔ وہ کوٹھا انوکھی ساخت کا ہے۔ اس کے طول و عرض اور بلندی کا تناسب اس قدر منفرد اور انوکھا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ یہ تناسب مروجہ اصولوں اور معیاروں سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔

اس کوٹھے میں کوئی درپچہ نہیں، کھڑکی نہیں، روشندان نہیں۔ صرف ایک دروازہ کھلتا ہے اور یہ دروازہ زمین سے ایک چوتھائی منزل اونچا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کی اونچائی عجیب معلوم پڑتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی دیواروں کے رخ مسجد کی دیواروں کے رخوں سے ہم آہنگ نہیں۔

رہ رہ کر میرے دل میں خیال آتا کہ میرے اللہ کی شان نزالی ہے کہ اس نے اپنے کوٹھے کی تعمیر اس قدر منفرد کروائی ہے جس میں نہ کوئی ڈھب ہے نہ ڈھنگ ہے۔ اور اسے بے ڈھبے بے ڈھنگے کالے کوٹھے میں جاذبیت اس قدر کوٹ کوٹ کر بھردی ہے کہ زائر کی نگاہیں اس پر اس حد تک مرکوز ہو جاتی ہیں کہ وہ عظیم مسجد، خوبصورت







”ہاں کہیں ایسا نہ ہو کہ دعا قبول ہو جائے۔“  
میں نے حیرت سے قدرت کی طرف دیکھا۔

بولے ”اسلام آباد میں ایک ڈائریکٹر ہیں۔ عرصہ دراز ہوا انہیں روز بخار ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر، حکیم، وید، ہومیو سب کا علاج کر دیکھا۔ کچھ افاقہ نہ ہوا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ آخر چارپائی پر ڈال کر کسی درگاہ پر لے گئے۔ وہاں ایک مست سے کہا بابا دعا کر کہ انہیں بخار نہ چڑھے۔۔۔۔۔۔ انہیں آج تک پھر بخار نہیں چڑھا۔

اب چند سال سے ان کی گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی گردن ادھر ادھر نہیں ہلا سکتے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ یہ مرض صرف اسی صورت میں دور ہو سکتا ہے کہ انہیں بخار چڑھے۔ انہیں دھڑا دھڑا بخار چڑھنے کی دوائیاں کھلائی جا رہی ہیں مگر انہیں بخار نہیں چڑھتا۔“

دعاؤں کی کاپی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ میں نے اللہ کے گھر کی طرف دیکھا۔

”میرے اللہ! کیا کسی نے تیرا بھید پایا ہے۔“

اب بولو

خانہ خدا کی چھت سے ایک پر اسرار چہرہ ابھرا۔ ماتھے پر تیوری۔ آنکھوں میں بے پناہ محبت۔ ہونٹوں میں ایک بلاوا۔ اس مسکراہٹ سے بجلی سی گری۔ میں دیوانہ وار اٹھ بھاگا اور کوشے کے پھیرے لینے لگا۔

وہ طواف نہیں تھا۔ طواف میں ایک رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔ ایک وقار ہوتا ہے۔ ایک نظم و ضبط ہوتا ہے۔ دیوانگی نہیں ہوتی۔

مکہ معظمہ میں میں نے کبھی طواف نہیں کیا تھا۔ کوشش کے باوجود طواف نہیں کر سکا تھا اور اس کی وجہ وہ کوشا تھا۔ اس کی چھت سے کوئی سر نکال کر میری طرف دیکھتا۔ اس کی مسکراہٹ گویا رنگ بھری پچکاری چلا دیتی۔ میں شرابور ہو جاتا اور جو شرابور ہو جائے وہ کیا جانے کہ رکھ رکھاؤ کیا ہوتا ہے اور قرار کسے کہتے ہیں۔

لوگوں میں حاجی ممتاز مفتی ہوں۔ لیکن میں نے حج نہیں کیا۔ مجھے حج کرنے کی خواہش ضرور تھی، رسمی خواہش۔ میں نے منیٰ میں حاضری دی۔ مزدلفہ میں کنکر چنے۔



عرفات میں پہنچا۔ لیکن اس رنگ بھری پچکاری والے نے میری ہر منزل کھوٹی کر دی جہاں اور جب کبھی میں نے سراٹھا کر اوپر دیکھا سامنے اس کا کوٹھا ابھر آیا اور پھر ہر جگہ ہر مقام اس کی اوٹ میں آگئے۔ اس نے مجھے حج کرنے نہیں دیا۔ اس نے مدینہ منورہ کو بھی اپنی اوٹ میں لے لیا۔ اور پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ ”تم کہا کرتے تھے مجھے اللہ سے کیا لینا دیتا۔ میں تو صرف حضور اعلیٰ کو جانتا ہوں۔ اب بولو۔“

## اذان

سکھ لوگ اذان نہیں سنتے۔ پتہ نہیں یہ مذہبی حکم ہے یا بڑوں کی ریت ہے۔ جب بھی ان کے کانوں میں اذان کی آواز پڑتی ہے، وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور پھر بھاگ اٹھتے ہیں۔ اس لحاظ سے میں بھی سکھ ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اذان کی آواز نہ سنوں۔

اذان کیا ہے؟ ایک بلاوا، آجاؤ مسلمانو، بھائیو، ساتھیو مزدورو، آجاؤ۔ آؤ کہ ہم اکٹھے مل کر اللہ کے حضور میں سجدہ کریں۔

ہمارے مؤذن اذان کو بلاوا نہیں سمجھتے۔ پتہ نہیں کیوں وہ اسے ایک آہ سمجھتے ہیں۔ ایک کراہ، ایک لمبی سسکی، ان کی دردناک آواز میں اداسی کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ وہ اداسی دھوئیں کی طرح چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ وہ اداسی دلوں پر بوجھ بن کر گرتی ہے۔ وہ اداسی امید کی لو کو بجا کر مایوسی کے اندھیرے کو مسلط کر دیتی ہے۔ ”اللہ اکبر اللہ اکبر“ جیسے اللہ کا بڑا ہونا ایک افسوس ناک امر ہو، وہ اداسی پکار پکار کر کہتی ہے۔۔۔۔۔۔ لوگو! ہم اپنے اللہ سے مایوس ہو چکے ہیں۔

اذان سن کر مجھے وہ نظم یاد آ جاتی ہے جو پتہ نہیں کس شاعر نے لکھی ہے مگر کیا خوب لکھی ہے۔ کہتے ہیں۔

جب کھینچ کے آہ سرد

کہتا ہے کوئی بندہ

جس حال میں بھی رکھے

صد شکر ہے اللہ کا

میں سوچنے لگتا ہوں



یہ شکر کیا اس نے  
یا طعنہ دیا اس نے  
رزاق دو عالم کا

حرم میں بیٹھے ہوئے جب پہلی مرتبہ اذان ہوئی تو میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ کیا چیز ہے۔ میں چونکا۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اذان سنی ہو۔ اس اذان نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ کس نے بلایا مجھے۔ کس نے بلایا مجھے۔ حرم شریف کی اس اذان نے سوتوں کو جگا دیا۔۔۔۔۔۔ بیٹھوں کو اٹھا کر کھڑا کر دیا۔۔۔۔۔۔ کھڑوں کو دوڑا دیا۔ بھاگ جانے کے لیے نہیں بلکہ پہنچنے کے لیے۔ میں آ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں۔

وہ اذان بلاوا تھی۔ وہ اذان رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے نماز کے لیے نہیں بلکہ جہاد کے لیے بلایا جا رہا ہو۔

حرم میں جو ساؤنڈ سسٹم لگا ہوا ہے اس کے Acoustics اس نوعیت کے ہیں کہ اذان کی آواز ریڈ کے گیند کی طرح گرتی ہے اچھلتی ہے، اچھلتی ہے گرتی ہے۔ جیسے پانچ سات ریڈ کے گیند اکٹھے کر کر اچھل رہے ہوں اور ان کے ٹپ ٹپ سے ایک عجیب سا بندھ جاتا ہے۔

نماز

اس وقت حرم میں لاکھوں لوگ بیٹھے تھے۔ نئے داخل ہونے والے زائرین کا تانتا لگا ہوا تھا۔ جب زائرین نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو صفیں مکمل کرنے کے لیے لوگوں نے آگے کی طرف یورش کی۔ میرے قریب کھڑے بڑے میاں کو دھکا لگا۔ ”ارے میاں۔“ دکھتا نہیں تمہیں کہ آگے لوگ کھڑے ہیں۔ اللہ نے دیکھنے کو آنکھیں دی ہیں میاں ان سے کام لو۔“

ابھی وہ بڑبڑ کر رہے تھے کہ بھیڑ کا ایک ریلا آیا۔ بڑے میاں پھر لڑھک کر ادھر جا پڑے ”واہ صاحب واہ عجیب تماشہ ہے حرم کو اکھاڑہ بنا دیا ان لوگوں نے۔“ بڑے میاں پھر بڑبڑانے لگے۔ میں بڑے اٹھماک سے بڑے میاں کی باتیں سن رہا تھا۔



قدرت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولے ”اونہوں شیطان کے جال میں نہ پھسو۔“

”میں تو بڑے میاں کی باتیں سن رہا تھا۔“

”بڑے میاں بھی تو اسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔“

”اسی جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔“

”ہاں یہی شیطان کا جال ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا۔“

”لوگ اتنے شوق سے یہاں آتے ہیں اور پھر معمولی تفصیلات میں الجھ کر اپنی منزل کھوٹی کر لیتے ہیں۔ سارا کھیل توجہ کا ہے۔ توجہ بھٹکنے نہ دو ورنہ یہ لمحات ضائع ہو جائیں گے۔“ قدرت کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی طاری تھی۔ بولے ”یہاں کوئی تفصیل اہم نہیں۔ کچھ بھی اہم نہیں صرف ایک حاضری۔ حضوری کا احساس۔ لیکن ہم حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں۔“

”حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں۔ حاضر ہو کر بھی غیر حاضر رہتے ہیں۔“

لاؤڈ سپیکروں نے تکبیر کے بہانے شور مچا دیا۔

”اللہ اکبر۔“ نماز شروع ہو گئی۔

حرم شریف اتنا کشادہ ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے، لیکن نماز کے وقت وہ اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ جی گھبرانے لگتا ہے۔ صفوں کے درمیان کچھ فاصلہ نہیں رہتا۔

سجدہ

جب سجدے کا وقت آیا تو گھبرا گیا۔ پچھلی صف کا نمازی میری = شدہ ٹانگوں کے اندر زبردستی اپنا سر گھیڑ رہا تھا۔ اگلی صف اس قدر قریب تھی کہ سر زمین پر لیکنے کی گنجائش نہ تھی۔ سجدہ ادا کرنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

”یہ کیا مصیبت ہو گئی۔“ میرے ذہن سے آزر دگی کی ایک لہر ابھری اور

میری روح پر مسلط و محیط ہو گئی۔ ”یہاں تو نماز پڑھنا ہی ممکن نہیں۔“

پھر پتہ نہیں کیسے پرلی طرف سے ایک دھکا لگا۔ ساری صف لڑکھڑا گئی۔ پچھلی

صف کے نمازی نے پھر اپنا سر میری ٹانگوں میں ٹھونک دیا۔ مجھے گدگدی ہونے لگی۔







میری طرف دیکھ کر ہاتھ چلا کر کہا۔

میراجی چاہا کہ اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں اور گلا پھاڑ کر چلاؤں۔ ”یہاں سب تفصیلات غیر اہم ہیں۔ صرف حضوری صرف حضوری۔“

دفعتا ”میں نے محسوس کیا کہ میں خود بھی غیر حاضر تھا۔ حاضر ہو کر بھی غیر حاضر تھا۔ تسبیح کے شیدائی نے منکوں کا پردہ قائم کر رکھا تھا۔ نظم و نسق کے دیوانے نے پردے کی اوٹ کھڑی کر رکھی تھی اور میں نے حاضری کی تلقین کو غیر حاضری کا بہانہ بنا رکھا تھا۔

پھر میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔ وہ میری طرف دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے میری کیفیت کو جانتے ہوں۔ جیسے مجھ سے ہمدردی کر رہے ہوں۔

پتہ نہیں وہ کون تپسوی تھے جو سالہا سال سے دھیان لگائے بیٹھے تھے۔ ان کا دھیان توڑنے کے لیے دشمنوں نے زرتکی بھیجی۔ زرتکی نے تپسوی کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ ناچتی رہی، ناچتی رہی، حتیٰ کہ آنکھیں کھول دیں اور ان کا دھیان ٹوٹ گیا۔

### انوکھا تپسوی

قدرت اللہ ایسے تپسوی ہیں جو کھلی آنکھوں سے دھیان لگاتا ہے اور ساتھ ہی زرتکی کو کانی آنکھ سے دیکھتا بھی جاتا ہے۔ مگر اس کا دھیان نہیں ٹوٹتا۔ پتہ نہیں انہوں نے یہ گر کہاں سے سیکھا ہے۔

حرم میں قدرت مجھ سے بات بھی کر لیتے تھے۔ نظم و نسق کے دیوانے کا لکچر بھی سن لیتے تھے لیکن ایسے کہ حضوری میں فرق نہ آئے۔

قدرت کو کسی سے لاگ نہیں۔ کسی سے لگاؤ نہیں، صرف حرم کی بات نہیں عام زندگی میں اچھا دوست ہونے کے باوجود کسی کے دوست نہیں۔ ان کے رویے میں ایک بنیادی لا تعلقی ہے۔ وہ کسی تعلق کو اپنے دھیان کے دائرے کے مرکز میں آنے نہیں دیتے۔ ان کے دوست عزیز، بیوی، ان کی توجہ کے Divine Unconcern کو اپنا لیتے ہیں۔

جیمز نے اپنی کتاب کے ابتدائی صفحات میں لکھا ہے: ”سمندر کے کنارے بیٹھ کر یا تو آپ لرس گن سکتے ہیں یا اپنی ذہنی کیفیت پر غور کر سکتے ہیں۔ دونوں کام بیک



وقت نہیں کر سکتے۔“

میرے اللہ تو جو خود اصول اور نظم و ضبط کا علم بردار ہے۔ تیرے بندے اس اصول سے مستثنیٰ کیوں ہیں، کیوں۔ تیرے بندے دونوں کام بیک وقت کرتے ہیں۔ کیوں؟

میں نے قدرت کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ عجیب انداز میں بیٹھے تھے۔ میں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ اس انداز کو اپنالوں لیکن بے سود۔ وہ یوں بیٹھے تھے جیسے عجز، احساس گناہ، تاسف، ندامت سے ان کا بند بند سرشار ہو۔

مجھے ان کی طرف دیکھ کر غصہ آنے لگا۔ یہ کیا ڈھونگ رچایا ہوا ہے، انہوں نے۔ عجز بے شک ان میں ہے لیکن احساس گناہ کس بات پر۔ وہاں نیک بن کر عزت کراتے رہے، یہاں گنہگار بن کر امتیاز حاصل کر رہے ہیں۔

میں نے کوٹھے کی طرف دیکھ کر کہا: ”یا اللہ یہ شخص جو میرے دائیں ہاتھ بیٹھا ہے پاکھنڈی ہے۔ یہ گنہگار نہیں، گنہگار میں ہوں میں۔ اس نے گنہگاری کا ڈھونگ صرف اس لیے رچا رکھا ہے کہ خود کو تیری خصوصی توجہ کا مستحق ظاہر کرے۔“

کوٹھے کی چھت پر کوئی مسکرا رہا تھا۔ اشارے کر رہا تھا۔

پہلے تو میں سمجھتا رہا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے۔ پھر دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ وہ مسکان کسی اور کے لیے تھی۔ کسی اور کو اشارے کیے جا رہے تھے۔ یہ کیا تماشہ ہے میرے ہوتے ہوئے کسی اور کو اشارے کرنے کا مطلب۔ غصے سے میرا خون کھولنے لگا۔

اس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ صرف مجھ سے ہی نہیں اوروں سے بھی راز و نیاز چل رہے ہیں۔

شاید حرم میں بیٹھے ہوئے ہر زائر سے آنکھ منکا چل رہا ہو۔ ان سے جو بھی دھیان لگائے بیٹھے ہیں اور ان سے بھی جن کا دھیان کسی نرنگی نے توڑ دیا ہے اور شاید اس نرنگی سے بھی جو دھیان توڑنے کی دھن میں لگی ہے۔

ابلیس کے دانت

اسی روز حرم سے باہر نکل کر میں نے قدرت سے پوچھا۔ ”یہ گنہگار جنی توجہ کیا



”جڑ ہے؟“

گنگا جمنی؟“ انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”یہ بیک وقت دو اطراف توجہ بانٹنے کا مسئلہ کیا ہے؟“

بولے ”کون بانٹتا ہے توجہ؟“

میں نے کہا ”اللہ کے بندے۔“

”اللہ کے بندوں کا بھید کسی نے نہیں جانا۔“ قدرت نے جواب دیا۔ ”کتے

ہیں حضرت علیؓ گھوڑے پر چڑھتے چڑھتے ایک لاکھ مرتبہ درود شریف کا ورد کر لیا کرتے

تھے۔ ان پر اسرار بندوں کا بھید کوئی نہیں جان سکا۔“

”حرم شریف میں بیٹھ ہوئے زائرین کی توجہ کیوں بھٹکتی ہے؟“ میں نے

پوچھا۔

”صرف ان کی توجہ بھٹکتی ہے، جن کے بارے میں اندیشہ ہوتا ہے۔ جن کے

دھیان میں اثر ہوتا ہے۔“

”اندیشہ کسے ہوتا ہے؟“

”اسے جس کا یہ فرض ہے کہ جہاں پہنچنے کا خطرہ ہو، وہاں راہ میں رکاوٹیں

کھڑی کر دی جائیں۔“

”وہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ابلیس۔“

”ابلیس؟“ میں نے دہرایا۔

”وہ بڑا مستعد کارکن ہے۔ اللہ کا حکم بجالانے کے لیے بڑی جان مارتا ہے۔“

”یہاں تو خود ابلیس موجود ہوتا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”یہ مقام بڑا خطرے کا مقام ہے۔ یہاں ایجاب و قبول کے درواہ ہیں۔ یہاں

گذشتہ گناہ شمار میں نہیں آتے۔ یہ گنہگاروں کی جنت ہے۔ یہاں قدم اٹھانے اور پہنچنے

کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ لہذا زائرین کو ورغلا نا بے حد ضروری ہے۔“

اس وقت ہم دونوں واپس ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔

”آئیے آپ کو دوسرے راستے سے ہوٹل لے جاؤں کہ آپ خود دیکھ



لیں۔" یہ کہہ کر قدرت مڑ گئے اور میں ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔  
چند قدموں کے بعد ہم ایک بازار میں جا پہنچے۔ بازار کو دیکھ کر میری آنکھیں  
چند ہیا گئیں۔

دکانیں رنگ رنگ کی خوبصورت اشیاء سے لدی ہوئی تھیں۔ کپڑا، زیور،  
سنگار کا سامان، کھلونے، تیار بلبوسات، گھڑیاں، گیمٹ، وہاں ہر وہ امپورٹڈ چیز موجود تھی  
جسے خریدنے کی میری ہمیشہ سے خواہش رہی تھی۔

وہ تنگ بازار کچھ زائرین سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ دھڑا دھڑ چیزیں خریدنے  
میں مصروف تھے۔ اس گھاگھی اور افراط کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں  
بھول گیا کہ زائر ہوں۔ میں بھول گیا کہ میں مکہ معظمہ میں ہوں۔ میں یہ بھول گیا کہ  
کوٹھے سے جھانکنے والے نے مجھے ہرا زبنا رکھا ہے۔ میں بھول گیا کہ حرم شریف میں  
میں لوگوں پر ہنستا رہا کہ وہ حاضر ہو کر بھی غیر حاضر ہیں۔ بازار کے اوپر ابلیس بیٹھا ہوا  
تھا۔ اس کے دانت نکلے ہوئے تھے۔

تین دن ہم نے مکہ میں گزارے۔

## گنگا جمنی

وہ دن بھی عجیب دن تھے۔ زندگی گنگا جمنی تھی جیسے میں نے بیک وقت دو  
محبوبوں سے یارا نہ لگا رکھا ہو۔ ایک تو وہ پردہ نشین تھا جو کوٹھے سے جھانک جھانک کر  
میری طرف مسکرائیں پھینکا کرتا، اور دوسرے وہ انگریزی ہوٹل تھا جو بوڑھی میم کی  
طرح میرا انتظار کیا کرتا تھا اور جب میں اپنے کمرے میں پہنچتا تو وہ بوڑھی میم میری گود  
میں آ بیٹھتی تھی۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میری دنیا بدل جاتی۔ ہیرے "لیس سر" "لیس سر"  
کہہ کہہ کر مجھے کہنی بہادر بنانے پر مصر ہو جاتے۔ میز پر پڑی پلیٹیں "میڈ بائی  
جانسن۔" "میڈ بائی جانسن" کی سرگوشیاں کرتیں۔ چمچے کانٹے چھریاں "ہیلو سر"  
ہیلو سر" گنگلاتے۔

پڈنگ پوچھتا "ایٹ سر" "درے سیلیر" میرے ذہن کے ارد گرد چالے  
تنتیں۔ باہر آمدے میں بوڑھی میمیں بڑے رکھ رکھاؤ سے میری طرف دیکھتیں۔ پھر



لفٹ پر کھڑاوردی میں ملبوس سٹورڈ ٹوپی اتار کر مجھے سلام کرتا۔ حتیٰ کہ مجھے محسوس ہوتا کہ میں لندن میں کسی جگہ پک تک کرنے آیا ہوا ہوں۔ کمرے میں پہنچتا تو بڑے بڑے بیڈ موٹے موٹے پائیدار صوفے۔ شاہی وضع کی کرسیاں سب مجھے ”ویلکم“ کرتے۔ اور پھر وہ ہوٹل کی روح شوخ لیکن و فعدار میم آکر بے تکلفانہ میری گود میں بیٹھ جاتی اور کہتی Darling dont besosuperstitious پھر مجھے یاد آتا کہ قدرت کہا کرتے ہیں ”کیا فرق پڑتا ہے۔“ قدرت کس قدر بے خبر ہیں۔

صبح جب قدرت مجھے جگاتے کہ چلو فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تو مجھے بڑا غصہ آتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے سکہ بند انگریز کو غصہ آیا کرتا تھا۔ جب اردلی اسے نامناسب وقت پر جگا دیتا تھا۔ آج کا انگریز نہیں بلکہ اس زمانے کا انگریز جب ایپائر پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

ہم تینوں صبح سویرے چار بجے حرم شریف پہنچ جاتے۔ نماز کے بعد ہوٹل میں بریک فاسٹ کرتے۔ پھر ظہر کی نماز کے لیے حرم پہنچتے۔ پھر دوپہر کو ہوٹل میں آکر لंच کرتے۔ شام کو عصر کے لیے حرم جاتے اور عشاء کے بعد واپس آتے۔

ہوٹل سے نکل کر حرم کو جاتے تو ایسے لگتا جیسے فقیر بھیک مانگنے نکلے ہوں۔ حرم سے واپس آکر ہوٹل میں داخل ہوتے تو ایسے لگتا جیسے لارڈ کلا یو پک تک کر کے آئے ہوں۔

ہاں وہ زندگی عجیب زندگی تھی۔ گویا ہماری میز پر شربت صندل اور کافی کے پیالے پڑے ہوئے تھے اور ہم باری باری ایک گھونٹ شربت پیتے اور ایک گھونٹ کافی۔ اس پر بھی قدرت کہتے تھے کیا فرق پڑتا ہے۔

### انجائینا

ان تین دنوں میں قدرت کو انجائینا کے چار دورے پڑ چکے تھے۔ ان دوروں کی نوعیت عجیب تھی۔

اسلام آباد میں ایک روز رمضان کی ستائیسویں شب میں نے قدرت سے کہا: ”آج رات میں آپ کے ساتھ گزاروں گا۔“ قدرت پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ بولے ”آپ کیا کریں گے؟“ میں نے جواب دیا ”جو آپ کریں گے۔“ بولے ”میں تو



شاید نفل پڑھوں۔" میں نے کہا "میں دیکھوں گا کہ نفل کس طرح پڑھے جاتے ہیں۔" قدرت زچ ہو گئے۔ انہیں میری بات ماننی پڑی۔

رات دس بجے کے قریب انہوں نے نفل پڑھنے شروع کیے۔ ساری رات وہ نفل پڑھتے رہے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھتا رہا۔

میرا خیال تھا کہ پتہ نہیں کیا ہو گا۔ کمرافری میسنز ہال بن جائے گا اور اس میں عجیب و غریب Ritual ہوں گے یا کمرے میں آسمان سے روشنی کی ایک کون گھس آئے گی۔ قدرت کے سر پر ایک ہالہ بن جائے گا۔ پھر فرشتے اتریں گے اور پھر اللہ کی آواز آئے گی۔ "مانگ کیا مانگتا ہے؟" لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

ساری رات گزر گئی۔ قدرت نفل پڑھتے رہے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔

ہاں صرف ایک بات تھی۔

نفل پڑھتے ہوئے قدرت کے قیام اتنے لمبے تھے کہ مجھے سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کھڑے ہو کر کیا کیا کچھ پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ حیران کن بات یہ تھی کہ قدرت کا کھڑے ہونے کا انداز عجیب تھا۔ اس میں عجز، ندامت، گنہگاری اور توبہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ قدرت کو کھڑے دیکھ کر بار بار مجھے وہ پینٹنگ یاد آئی تھی۔ جس میں عالم دعا میں "جاب" کے عجز، ندامت اور توبہ بھرے ہاتھ دکھائے گئے ہیں۔ اسی وقت قدرت بنفس نفیس گویا جاب کے دعائیہ ہاتھ بنے ہوئے تھے۔

ساری رات نفل پڑھنے کے بعد جب پو پھی تو قدرت کو انجانا کا دورہ پڑ گیا اور دو ماہ کے لیے وہ صاحب فراش رہے۔

میں نے کہا "یہ اچھی عبادت ہے جس کے صلے میں دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔" "نہیں نہیں" وہ بولے "قصور میرا اپنا تھا۔ شیشے کے برتن پر اگر اتنا دباؤ ڈالو کہ سہار نہ سکے تو وہ تڑخ جاتا ہے۔"

کہ معظمہ میں قیام کے دوران قدرت چار مرتبہ تڑخے۔ میں نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا "میں نے کہا ڈاکٹر یہ بتاؤ کہ برتن کمزور ہے یا دباؤ زیادہ ہے۔"

ڈاکٹر نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔



میں نے کہا ”تم دنوں میں چار مرتبہ جو انجائینا کا دورہ پڑا ہے۔“  
 وہ ہنسی بولیں۔ ”انجائینا بے چارے کا تو مفت میں نام بد نام ہے۔“  
 ”تو پھر کیا ہے؟“

”مجھے کیا پتہ۔ کوئی بیماری ہو تو مجھے پتہ چلے۔“  
 ”تو یہ بیماری نہیں کیا؟“

”بیماری اتنی سوجھ بوجھ کی مالک نہیں ہوتی۔“  
 ”سوجھ بوجھ کی؟“

”ہاں پہلی مرتبہ انہیں اس وقت دورہ پڑا جب انہوں نے حاضری دینے کا ارادہ کیا۔ دوسرا اس وقت پڑا جب یہ پہلا طواف کرنے لگے تھے۔ تیسرا اس وقت پڑا جب انہوں نے سعی شروع کی اور چوتھا اس وقت پڑا جب حج پر روانہ ہوئے۔ ابھی پتہ نہیں کتنے دورے اور پڑیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے انجائینا میں کمپیوٹر لگا ہوا ہے۔“

میری ہنسی نکل گئی۔

”ویسے بھی“ وہ بولیں ”جب بھی ہم حرم شریف جانے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کا جسم اکڑ جاتا ہے۔ پھر میں زبردستی سونٹا مار کر اٹھاتی ہوں۔“  
 ”اچھا تو پھر یہ ہے کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”Miner resistance-resistance“

”ارے۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اندر سے کوئی کسے چل اٹھ اور پھر سے اندر سے کوئی کسے رک جا۔ معاف کرنا ڈاکٹر میں نہیں سمجھا۔“  
 ڈاکٹر غصے میں بولیں۔ ”میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ میں سمجھتی ہوں۔“

ڈاکٹر عفت

ڈاکٹر عفت کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے ڈاکٹر عفت سے طبی مشورہ پوچھا۔ میں نے کہا: ”ڈاکٹر ہائی بلڈ پریشر کے لیے کوئی دوا بتائیے“



بولیں۔ ”تار میرا کے بیج تلی بھر نماز منہ کھاؤ صرف تین دن۔“  
میں نے حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ پھر میری ہنسی نکل گئی۔ ”عفت آپ  
ڈاکٹر ہیں کہ پنساری۔“ میں نے کہا۔

ڈاکٹر عفت جب ہیک میں تھیں تو پاکستان سے تر پھلا منگوا یا کرتی تھیں۔ پانچ  
روپے کے تر پھلا پر ۳۵ روپے کرایہ لگتا تھا۔

مکہ میں وہ مجھے ساتھ لے کر اسپنول تلاش کرتی پھر میں کیوں کہ قدرت کے  
پیٹ میں خرابی تھی۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر اسپنول تو پنساری کی دکان پر ملے گا۔ آپ  
کیمسٹوں کی دکانوں پر ڈھونڈ رہی ہیں۔“

عفت بولیں۔ ”اب انہوں نے اسپنول کو بائبل کر لیا ہے۔ نام ہے اسپ  
گال۔“

حج پر آنے سے پہلے میں نے پوچھا ”ڈاکٹر! الرجی کے لیے کوئی دوا ہے کیا؟“  
بولیں ”ایلو پیٹھی میں کوئی حتمی دوا نہیں۔ عارضی آرام کی دوائیں ہیں۔ ان  
سے بیماری نہیں جاتی۔ آپ فلاں آیت کا ورد کیا کریں۔ انشاء اللہ شفا ہوگی۔ میری  
آزمودہ ہے۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر آہستہ بولے اگر میڈیکل کونسل کے کسی رکن نے سن لیا تو  
وہ آپ کا لائسنس ضبط کر لیں گے۔“ یہ کہہ کر میں قہقہہ مار کر ہنسا۔  
ڈاکٹر عفت دوسروں کے قہقہوں سے نہیں گھبراتیں۔ وہ اپنے خیالات اور  
Beliefs پر شرمسار نہیں ہوتیں۔

ایک بار لندن میں کسی انگریز نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا ”آپ مسلمان لوگ  
سور کیوں نہیں کھاتے؟“ ڈاکٹر عفت بولیں: ”یہ بتائیے آپ کتا کیوں نہیں کھاتے؟“  
انگریز یہ سن کر بوکھلا گیا۔ بولا ”میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔“  
عفت نے کہا ”میں نے بھی سور کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ میں سور اس  
لیے نہیں کھاتی کہ میرے اللہ کا حکم ہے، سور مت کھاؤ۔“

دو سال پہلے ڈاکٹر عفت ہو میو پیٹھی کا مطالعہ کر رہی تھی۔ پھر لاہور کے نور بابا  
کے طریق علاج سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ نور بابا کے طریق  
علاج کو اپنائیں گی۔ کیونکہ نور بابا کے پاس پرانی، پر اسرار بیماریوں کے ایسے مریض



آتے ہیں جنہیں ڈاکٹر Incurable قرار دے چکے ہوتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ ان میں سے چالیس فی صد صحت مند ہو جاتے ہیں حالانکہ نور بابا صرف خوراک کے ذریعے علاج کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خوراک میں جو دوا کا عنصر ہوتا ہے، وہ خالص دوا کی نسبت زیادہ پر اثر ہوتا ہے۔ نور بابا کے نظریہ نے ڈاکٹر عفت کو بہت متاثر کیا ہے۔

کہتے آپ کی سمجھ میں بات آئی؟ میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔

موٹی بات یہ ہے کہ دونوں میاں بیوی ہی بعید از فہم ہیں۔

مثلاً "شادی کے بعد آج تک دونوں میں ایک بات پر جھگڑا ہے جو شاید ہی کبھی

طے نہ ہو پائے۔

قدرت کہتے ہیں "جب میں نے پہلی مرتبہ عفت کو دیکھا تو وہ میلہ شبیے کا

سوٹ پہنے سلائی کی مشین چلا رہی تھی۔"

ڈاکٹر کہتی ہیں: "میلہ شبیے کا سوٹ میں نے زندگی بھر نہیں پہنا۔"

قدرت کہتے ہیں: "اگر تم نے میلہ شبیے کا سوٹ نہ پہنا ہوتا تو میں کبھی

شادی کے لیے تمہارا چناؤ نہ کرتا۔"

ڈاکٹر کہتی ہیں: "کاش کہ میں میلہ شبیے کا سوٹ نہ پہنتی۔"

قدرت کہتے ہیں: "نہ پہنتی تو اتنا بڑا اعزاز کیسے حاصل ہوتا۔"

ڈاکٹر کہتی ہیں: "سی ایس پی کی بیوی ہونے کے عذاب سے بچ جاتی۔"

بہر حال ڈاکٹر کی بات میری سمجھ میں نہ آئی اور میں سوچتا رہا، سوچتا رہا کہ ایسا

کیوں ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی اہم مقام آتا ہے قدرت کو دورہ پڑ جاتا ہے۔ جب بھی

حرم جانے کا وقت آتا ہے ان کے اعضاء اکڑ جاتے ہیں۔ سوچتا سوچتا میں ہوٹل سے باہر

نکل گیا۔

چور اور گٹھڑی

"اسلام علیکم۔" ایک ہندوستانی وضع کے بڑے میاں نے مجھے چوٹا دیا۔ وہ

بڑے مزے میں تھے۔ ہاتھ میں تسبیح چل رہی تھی۔ منہ میں پان چل رہا تھا۔

"آپ پان ساتھ لائے ہیں؟" میں نے پوچھا۔



”نہیں تو۔“ وہ بولے ”میاں یہاں کیا نہیں ملتا۔ وہاں کٹڑ پر پاک ہوٹل ہے۔ وہاں سے جا کر پان کھاؤ۔“

پاک ہوٹل میں داخل ہوا تو پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ ہوٹل میں آیا ہوں۔ میز لگے ہوئے تھے۔ کرسیاں کھڑی تھیں۔ چلنے کا راستہ بند تھا۔ لڑکا چلا رہا تھا۔ آلوگوش، کدوگوش، دال قیمہ، بات ہوئی نا۔ میں نے محسوس کیا جیسے مرغابی جھیل پر آگئی ہو۔

جس میز پر مجھے جگہ ملی وہاں ایک افریقی بیٹھا تھا۔ اس نے خوش آمدید کے لیے دانت نکال دیے۔

چائے کا پیالہ پیتے ہوئے مجھے پھر سے قدرت کے دورے کی بات یاد آگئی۔

”وریڈ (Worried)“ افریقی نے پوچھا۔

”نو، یس وریڈ۔“

”سم تنگ روٹنگ، یو، آئی مین و دیو۔“

”نو“ میں نے کہا۔ ”Engina - companion ہارٹ، دورہ، آئی مین

فٹ، طواف، فٹ، طواف، فٹ، طواف، فٹ۔“

افریقی ہنسنے لگا پھر سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ ”او نو وری (Wory) نو

وری۔“

”وائی ناٹ“ میں نے کہا۔

”Where There is Gold there is thief he must be gold“

افریقی نے دانت نکال کر میری طرف دیکھا۔

گٹھڑی میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا، گٹھڑی میں لاگا چور۔ ہوٹل کے ریڈیو

سے کے سی ڈے کی آواز گونجی۔

میں چونکا۔ گٹھڑی اور چور کی بات ہے۔ میں نے سوچا لیکن گٹھڑی اور چور کا

بہید کیا ہے۔ گٹھڑی کون ہے۔ چور کون ہے؟

”اللہ اکبر اللہ اکبر“ سوزن نے حرم کے مینار سے جواب دیا۔

دفترا“ مجھے خیال آیا کہ عفت اور قدرت دونوں مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے،

چونکہ نماز کے وقت ہم اکٹھے ہوٹل سے مسجد جایا کرتے تھے۔ وہ دونوں فکر مند ہوں



گے۔ یقیناً مسجد میں پہنچ چکے ہوں گے۔ میں دیوانہ وار اٹھا اور مسجد کی طرف بھاگا۔ حرم شریف میں پہنچ کر میں انہیں ڈھونڈنے لگا۔ حرم شریف میں کسی کو ڈھونڈنا آسان کام نہیں ہوتا۔

### عورت

دفعتا کسی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ”وہ دیکھو وہ“ وہ چلایا۔ ”طواف میں عورتیں اور مرد گڈ ہو رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اگر یہ لوگ درمیان میں ایک چھوٹی سی دیوار بنا دیتے تو ایک طرف عورتیں طواف کرتیں اور دوسری طرف مرد۔ کیوں صاحب میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟“

”عورت؟ عورتیں؟“ میں نے نظم و نسق صاحب کو پہچان کر کہا۔ یہ کس عورت کی بات کر رہا ہے۔ کون سی عورتیں؟ میں نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ ان پانچ لاکھ زائرین میں جو اس وقت حرم میں موجود تھے ایک بھی عورت نہ تھی۔ ہمیں مکہ شریف میں آئے ہوئے تین روز ہو چکے تھے لیکن میں نے وہاں کوئی عورت نہ دیکھی تھی۔

سعودی عرب کے چھپے ہوئے اعداد و شمار کے مطابق زائرین کی کل تعداد پانچ لاکھ تھی۔ جن میں سو لاکھ عورتیں تھی۔ وہ سو لاکھ عورتیں کہاں چھپی بیٹھی تھیں۔ عورت کے متعلق میں بہت زود حس ہوں۔ جس طرح مینڈک کو آنے والی بارش کی بو آ جاتی ہے، اسی طرح مجھے عورت کی بو آ جاتی ہے۔ لیکن جب سے میں نے مکہ معظمہ میں قدم رکھا تھا، مجھے وہاں کوئی عورت دکھائی نہیں دی تھی۔ سوال یہ ہے کہ عورت کیا ہے۔

عورت نہ حسن ہے نہ جنس ہے نہ جسم ہے۔ کئی عورتیں آپ کے پاس سے گزر جائیں گی، لیکن آپ کو خبر بھی نہ ہوگی۔ کوئی عورت آپ سے بہت دور کھڑی ہوگی اور آپ محسوس کریں گے کہ وہ عورت کھڑی ہے۔ جیسے وہ چلا چلا کر کہہ رہی ہو۔ ”میں عورت ہوں، لوگو میری طرف دیکھو میں عورت ہوں۔“

تو عورت کیا ہے۔ ایک نشرگاہ، ایک جسم۔ جس میں ایک ٹرانسمیٹر لگا ہو، جو یہ نشر کرتا رہے ”میری طرف دیکھو میں عورت ہوں۔“ ٹرانسمیٹر کے علاوہ عورت میں



ایک کمپیوٹر لگا ہوتا ہے جو مناسب موقع پر از خود ٹرانسپیر کو چلا دیتا ہے۔  
 سو لاکھ عورتیں جو حرم میں بیٹھی تھیں، ان سب کے ٹرانسپیر خراب ہو چکے  
 تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو احساس نہ تھا کہ وہ عورت ہے۔ کوئی پیغام نشر نہیں کر  
 رہی تھی ”میری طرف دیکھو میں عورت ہوں۔“ کسی مرد کا ریسیور کام نہیں کر رہا تھا۔  
 پھر پتہ نہیں لگتا کہ کونسا صاحب کیوں بار بار چلا رہے تھے: ”وہ دیکھو عورتیں اور مرد  
 اکٹھے طواف کر رہے ہیں۔“

ایٹم بم

اس وقت حرم میں صرف ایک محبوب تھا۔ صرف ایک کشش۔ صرف ایک  
 جادو جو سروں پر چڑھ کر بول رہا تھا۔ پانچ لاکھ زائرین ایک خیال ایک آرزو لیے بیٹھے  
 تھے۔

خیال اور آرزو بذات خود ایک طاقت ہے۔ یہ طاقت بجلی پیدا کرتی ہے۔  
 پانچ لاکھ جنریٹر خیال کی طاقت سے چل رہے تھے۔  
 پانچ لاکھ دل ایک جذبے سے دھڑک رہے تھے۔

پانچ لاکھ نیگیٹو پوائنٹس (Negative Points) ایک (Point Positive)  
 کی طرف یورش کر رہے تھے۔

حرم اس وقت ایک ایٹم بم تھا جس میں لاکھوں ذرات نیو کلن کے گرد گھوم  
 رہے تھے۔

میری نگاہ کوٹھے کی طرف منعطف ہو گئی۔

نیو کلن سے وہی سرا بھار۔ وہی مسکراہٹ، وہی بلاوا۔ میں بھاگا اور کوٹھے  
 کے گردیوں پھیرے لینے لگا جیسے وہ میری سہاگ رات ہو۔



## مطاف

”وہ دیکھو وہ دیکھو۔“ نظم و ضبط کا متوالا چلایا۔ اس نے خانہ کعبہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”طواف میں ہڑبونگ مچا رکھا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔“

### سنگ اسود

سنگ اسود کے قریب زائرین دھکم پیل کر رہے تھے۔ سنگ اسود کو بوسہ دینے کی خواہش ان پر بھوت بن کر سوار تھی۔ ہر کوئی دوسرے کو پیچھے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اپنا راستہ بنانے کے لیے یوں کندھے مار رہا تھا جیسے فٹ بال گراؤنڈ ہو۔

”ارے صاحب“ میر صاحب نے آہ بھری۔ ”دیکھ لو دو دن میں بیسیوں بار طواف کر چکے ہیں لیکن سنگ اسود کو بوسہ دینے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔“

”وہاں تو فٹ بالر ہی پہنچ سکتا ہے میر صاحب۔“ صاحب نظم و نسق بنے۔

”اپنے میں تو اتنی جان نہیں۔“ میر صاحب نے آہ بھری۔

”کوئی نظم و ضبط ہو۔ باری باری زائرین آگے بڑھیں تو ہات بنے۔ کیوں جناب؟“ نظم و ضبط کے دیوانے نے میرا شانہ جھنجھوڑا۔

”بھئی“ میں نے جان چھڑانے کے لیے دانت نکال دیے۔

”در اصل وقت یہ ہے کہ سنگ اسود قد آدم جتنا اونچا نہیں ہے۔ بوسہ دینے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔“ میر صاحب بولے۔

”صرف یہی نہیں صدیوں کی بوسہ بازی سے سنگ اسود اب گھس گھس کر پیالہ بن گیا ہے۔ پہلے سر جھکاؤ پھر اس پیالے میں ہونٹ ڈالو۔“

”جب تک پیچھے سے بھیڑ کا ریلا آجاتا ہے۔“ میر صاحب بولے۔

”ہاں اور سروہیں چپکا رہتا ہے اور دھڑ آگے چل پڑتا ہے۔“ جناب نظم و



نسق صاحب نے قہقہہ لگایا۔ ”میر صاحب سنگ اسود کو بوسہ دینے کا خیال چھوڑیے۔ بس اشارے پر ہی گزارہ کیجئے۔“

”ارے نہیں صاحب“ میر صاحب بولے ”اتنی دور سے آئے ہیں تو کیا یہ سعادت حاصل کیے بغیر ہی لوٹ جائیں گے۔ نہ صاحب۔“

”بنیادی غلطی پلاننگ کی ہے۔ سنگ اسود کو قد آدم جتنا اونچا لگانا چاہیے تھا اور وہ اتنا ابھرا ہوتا کہ صدیوں کی بوسہ بازی کے بعد زیادہ سے زیادہ ہموار ہو جاتا۔“  
نظم و نسق صاحب نے کہا۔

ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے عابد نے کچھ لی اور نظم و نسق کے دیوانے پر ایک خون آلود نگاہ ڈالی۔ ان کی نگاہ دیکھ کر میں کانپ گیا۔

اس وقت ہم حرم شریف میں برصغیر کے زائرین کے ایک گروہ کے درمیان میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”یہ ہم کہاں آ بیٹھے ہیں آج؟“ میں نے قدرت سے کہا۔

قدرت نے توجہ کیے بغیر کان میری طرف موڑ دیا۔

”یہ لوگ تو جزو کوکل پر مسلط کیے بیٹھے ہیں۔ چلئے کہیں اور چل کر بیٹھیں“  
میں نے قدرت سے کہا۔

قدرت نے ذرا ٹھہرو کا اشارہ کیا اور اپنی پر اسرار مصروفیت جاری رکھی۔ کچھ دیر کے لیے ہم خاموش بیٹھے رہے۔

”پتہ نہیں یہ نظم و ضبط کا دیوانہ کون ہے؟“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

دل چھوٹا

”ان کا نام سرفراز ہے۔ یہ پاکستان کے اعلیٰ افسر ہیں۔“ قدرت نے کہا۔

”ہوں۔ پلاننگ میں سقم کی تحقیق کرنے آیا ہے یہ یہاں“ میں نے طنزاً کہا  
قدرت نے میری طنز کو نظر انداز کر دیا۔

”سرفراز پلاننگ کے ماہر ہیں۔“ وہ بولے ”بڑے انجھے آدمی ہیں۔“

”بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا اچھا آدمی ہے۔“ قدرت کی زیر  
لسی حرم میں چاروں طرف گونجی۔ کوئی تمسخر اڑا رہا تھا۔ مذاق کر رہا تھا۔



قدرت اللہ شہاب کا مردم شناسی کا معیار میرے لیے ناقابل فہم ہے۔  
فلاں شخص بڑا منہ بند ہے۔ نک چڑھا ہے۔ خود پسند ہے۔ مگر بڑا اچھا آدمی  
ہے۔

فلاں شخص بڑا نکتہ چیں ہے۔ عیب گنوانے میں مزا لیتا ہے۔ پر ہے بہت اچھا  
آدمی۔

”خاک اچھا آدمی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو عقل و خرد کی تلوار چلائے جا رہا  
ہے اور پھر یہاں حرم شریف میں۔“

”اونسوں دل چھوٹا نہ کیجئے۔“ قدرت زیر لب بولے۔

دفعتا ”بات جگنو بن کر میرے ذہن میں چمکی۔“ ہوں تو قدرت مردم شناسی  
سے پہلو تھی اس لیے کر رہے ہیں کہ دل چھوٹا نہ ہو کتنا خود غرض ہے یہ شخص جو علم،  
ادراک، جذبہ راسخی سب کچھ اپنے قلب کی صفائی کے تحفظ کے لیے قربان کرنے سے  
گریز نہیں کرتا۔“

”یہاں جو چاہو کرو۔“ قدرت نے کہا ”صرف دل چھوٹا نہ کرو۔ کیا پتہ یہ  
شخص جو آپ کے دائیں ہاتھ بیٹھا نظم و نسق اور پلاننگ کی طرف ہماری توجہ مبذول کرا  
رہا ہے سی آئی ڈی کا آدمی ہو۔“

رکاوٹیں

”سی آئی ڈی کا آدمی یہاں حرم میں؟“

”شاید یہ اس بات پر مامور ہو کہ جانچے کون دل چھوٹا کرتا ہے۔“

”رکاوٹیں سی آئی ڈی ہی ہوتی ہیں۔ یہاں کئی صورتوں میں رکاوٹیں سامنے

آتی ہیں۔“

”کیوں آتی ہیں سامنے۔ یہ کیا مداری پن ہے۔ خود ہی جذبہ پیدا کرتا ہے۔

خود ہی بلاتا ہے۔ خود ہی رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔“

”ہاں۔“ قدرت مسکرائے۔ وہ مسکراہٹ اس قدر زندانہ تھی جیسے کوئی

شرابی لڑکھڑا کر بات کر رہا ہو۔ ”رکاوٹیں بڑی ضروری ہوتی ہیں۔“

”ضروری؟“



”رکاوٹ نہ ہو تو حرکت ممکن نہ ہو۔ کشش ثقل نہ ہو تو پودے نہ اگ سکیں۔ رکاوٹ اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری حرکت مثبت ہے۔ رکاوٹ یہ ثابت کرتی ہے کہ ہمیں اہمیت دی جا رہی ہے۔ وہ دیکھو وہ۔“ قدرت نے ایک اونگھتے ہوئے زائر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ زائر عبادت کرتے کرتے سو گیا ہے۔ تخریبی طاقت نکل ہو تو۔۔۔۔۔“

”بات ٹوٹ جاتی ہے۔“ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

”اونہوں ٹوٹی نہیں۔ بلکہ بات چل نکلنے کی خبر لاتی ہے۔ عبادت میں نیند آ جائے تو سمجھ عبادت کاٹ رہی ہے.....“

”علی حیدر۔“ ایک پہلوان نما پنجابی نے ہمارے قریب آ کر دونوں بازو اٹھا کر نعرہ لگایا۔ ”بھاجی سنگ اسود کو چوم کر آئے ہیں“ وہ بولا۔ ”سنگ اسود کو چومے بغیر بھلا آسکتے تھے ہم۔“

”لیکن وہاں تو بڑی بھیڑ ہے۔“ میر صاحب بولے۔

”ہم کیا پروا کرتے ہیں بھیڑ کی۔“ پہلوان صاحب بولے۔

”پر وہ تو رستہ روکے بیٹھے ہیں۔“ سرفراز نے کہا۔

”رستہ روکنے والے کی ایسی کی تیسری۔ اس کے فلاں کے فلاں کا فلاں۔“

پہلوان نے بڑے خضوع اور خشوع سے منہ پھاڑ کر صلوات سنائی۔ پھر بولا۔ ”ساری عمر کسرت کی ہے بھاجی کوئی محول ہے۔ ایک کو اٹھا کر ادھر پھینکا۔ ایک کو موہنڈا مار کر ادھر کیا۔ پانچ دس کو پیچھے گھسیٹا۔ ایک کی گردن دبائی۔ ایک کو ایڑی ماری۔ بس راستہ صاف ہو گیا۔ پھر جی بھر کر سنگ اسود کو چوما۔ کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ ہم کو ادھر سے ہٹائے۔ علی حیدر“ اس نے پھر نعرہ لگایا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سارا ہاتھ جیسے سنگ اسود کو بوسہ دے کر نہیں بلکہ اللہ میاں کی گود میں بیٹھ کر آیا ہو۔

پر اسرار بندے

قدرت اللہ اٹھ بیٹھے۔ ”چلے۔“ انہوں نے کہا ”حطیم میں دو نفل ادا کریں۔

آئے۔“

”ہاں ہاں ہو آئے ہو آئے۔“ میر صاحب بولے۔ ”اپنی جاء نماز میں رہنے







”پھر؟“

”کچھ پلے نہیں پڑا۔“

قدرت اللہ ہنس پڑے۔

”جو جانتے ہیں وہ بتاتے نہیں۔ جو لکھتے ہیں وہ بیان نہیں کرتے۔ پسلیاں

بجھواتے ہیں۔ جو بیان کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ نہیں بات مجھ

ایسے بے سمجھ کے پلے نہ پڑ جائے۔ بڑا Nepotism چلتا ہے وہاں Monopoly بنا

رکھی ہے۔ اللہ کے بندوں نے۔“

”یہ تیرے پر اسرار بندے۔“ قدرت نے ہنس کر کہا۔ ”ان کا بھید کسی نے

نہیں پایا۔“

”یہ اختیار اوتار کیا چیز ہیں۔ پہلی بار سنا ہے آج؟“

”معلوم ہوتا ہے یہ سیکرٹریٹ سے متعلق ہیں فیلڈ سے نہیں۔“

”تو کیا ان کا سیکرٹریٹ بھی ہے؟“

”ہوں۔ ہے۔“

”کیا وہ پاکستانی سیکرٹریٹ کی طرح چلتا ہے؟“

قدرت نے ہنس کر میری طرف دیکھا۔

”قرائن سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ میں نے کہا ”میری حج کی فائل چھ سال پڑی

رہی۔ کسی نے دستخط نہ کیے۔ پہلے اس بات پر حیرت تھی کہ کوئی دستخط نہیں کرتا۔ اب،

اس بات پر حیرت ہے کہ دستخط ہو گئے۔“

”وہ کیوں؟“

”سراسر Favouritism ہوا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”میری طرف دیکھیے۔ کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ۔“

حطیم

”لیجئے“ قدرت نے کہا ”حطیم آگیا۔“ انہوں نے ایک چار دیواری کی طرف

اشارہ کیا۔



مطاف میں گویا وہ ایک ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تھی۔ چھوٹی سی چار دیواری جس کے اوپر کوئی چھت نہ تھی۔ اندر پچاس ساٹھ آدمیوں کے لیے نماز پڑھنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ دو تین صفیں بچھی ہوئی تھیں جن پر چار ایک آدمی کھڑے نفل پڑھ رہے تھے۔

قدرت اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے اندر چلا گیا۔ قدرت پچھلی صف پر کھڑے ہو گئے اور نفل پڑھنے لگے۔ میں قدرت کے پیچھے دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دو نفلوں کی نیت باندھی۔

ابھی میں نے سورہ فاتحہ شروع ہی کی تھی کہ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ اک شور سا بلند ہو گیا۔ اک عجیب سی بھنھناہٹ جیسے بکرے بکرے جتنی بڑی بڑی کھیاں بھنھنا رہی ہوں۔ پھر اس بھنھناہٹ کے پس منظر میں آوازیں سنائی دیں۔ کوئی چیخ رہا تھا۔ کوئی چلا رہا تھا۔ کوئی گھور رہا تھا۔ کوئی ڈانٹ رہا تھا۔۔۔۔۔

پہلے وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔ ارے یہ شخص۔ یہ یہاں اتنی جسارت، باہر نکالو اسے، اٹھا کر پھینک دو، لاحول و لاقوۃ۔۔۔۔۔ پھر وہ سب گویا براہ راست مجھ سے مخاطب تھے: ”چل دوڑ یہاں سے، چل نکل، یہ تو کہاں آگھسا ہے، شرم نہیں آتی تجھے، ذلیل پلید کیرا، تعفن سے بھرپور۔۔۔۔۔“ تو ساری فضا کو متعفن کر رہا ہے۔“

بدبو

دفعتا ”مجھ سے گندگی کے بھجا کے اٹھنے لگے۔ میں نے محسوس کیا۔ جیسے وہ بھجا کے میرے جسم کے بند بند سے اٹھ رہے تھے جیسے میں بہ نفس نفیس گندگی کا ایک تودا تھا۔“

”چل اٹھ نکل یہاں سے دور ہو جا۔“ وہ سب چلانے لگے۔

ان آوازوں سے بچنے کے لیے میں سجدے میں گر پڑا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ کسی نے دونوں طرف سے میرے شانے پکڑ لیے۔ میرا سر ہوا میں لٹکنے لگا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ سر زمین پر لگ جائے اور سجدے میں گر کر میں ان کے حضور دعا کروں، منت کروں، آہ و زاری کروں کہ یا اللہ میری غلاطت دور کر دے۔ مجھے اس



قابل بنادے کہ میں عظیم میں سجدہ کر سکوں۔  
میں نے لاکھ کوشش کی لیکن میرا سر زمین تک نہ پہنچ سکا۔ پھر وہ سب قہقہہ مار  
کر ہنس رہے تھے۔ تمسخر بھری ہنسی۔  
”جاؤ۔ جاؤ۔ چلے جاؤ۔“

میں نے محسوس کیا جیسے میں پھانسی لگا ہوا ہوں۔ پھر مجھ پر ایک انجانا خوف  
طاری ہو گیا اور میں اٹھ کر بھاگا۔  
عظیم سے باہر نکلا۔ تو حرم شریف دھند لایا ہوا تھا۔ چاروں طرف دھند پھیلی  
ہوئی تھی۔ بدبو کے بھجکے جو مجھ سے اٹھ رہے تھے۔ دھند میں تبدیل ہوئے جا رہے  
تھے۔

میں سم کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا اور پتہ نہیں وہاں کب تک کھڑا رہا۔

### اپنا اپنا مقام

آہستہ آہستہ وہ احساس تذلیل چھٹتا گیا۔ پھر غصے نے بڑھ کر مجھے بے بسی اور  
کسمپرسی کی کیفیت سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا۔ میں کونے سے باہر نکل آیا۔ غصے سے  
میرے کانوں کی لوہیں سرخ ہو رہی تھیں۔

یہ کیا مذاق ہے۔ گھر بلا کر بے عزتی کرتے ہو۔ پہلے خواب دکھا کر میرے دل  
میں آرزو کا دیا جلایا۔ پھر مستوں کی زبان سے مجھے مڑدہ سنایا۔ پھر اسباب پیدا کیے۔ اور  
اب جب میں حاضر ہو گیا ہوں تو احساس گندگی دلا کر میری تذلیل کی جا رہی ہے۔ میں  
نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں پاک ہوں۔ میں نے کب دعویٰ کیا تھا کہ میں تیرے گھر میں  
قدم رکھنے کے لائق ہوں۔ پھر بھی میں تیرا بندہ ہوں۔ تیری تخلیق ہوں۔ غصے میں میں  
نے نگاہ اٹھا کر کوٹھے کی طرف دیکھا۔

منڈیر پر کوئی قہقہہ مار کر ہنسا۔ تجھے کس نے کہا تھا کہ خواص کی مسجد میں جا۔  
تجھے کس نے کہا تھا کہ وہاں نفل پڑھ۔ تجھے کس نے کہا تھا کہ ان میں جا کھڑا ہو جن میں  
سے تو نہیں۔

منڈیر پر کوئی تالی بجا بجا کر ہنسنے جا رہا تھا۔ ”یو قوف یو قوف“ اپنے مقام کا بھی  
بتہ نہیں۔“



ہر کسی کا اپنا اپنا مقام ہوتا ہے۔ ادھر آ۔ ادھر میرے کوٹھے کے ارد گرد پھیرے لے۔ یہی تیرا مقام ہے۔ یہی تیری غایت ہے۔ یہی تیرا منتہا ہے۔ میں دیوانہ وار کوٹھے کی طرف بھاگا۔

### انوکھی کرم نوازی

جب میں طواف کر کے واپس آیا تو قدرت میرا انتظار کر رہے تھے۔ ”کیا سنگ اسود کو بوسہ دینے کے لیے گئے تھے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے کبھی سنگ اسود کو بوسہ دینے کی

کوشش نہیں کی۔“

”کوشش بھی نہیں کی“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”مجھے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ طواف کرتے ہوئے مجھے سب کچھ بھول

جاتا ہے۔ سب کچھ۔ سنگ اسود، رمل۔ شوط۔ استلام۔ ملتزم۔ مقام محمود سب کچھ۔“  
قدرت خاموش ہو گئے۔

سرفراز اپنی عقل و خرد کی تلوار چلا رہا تھا۔ وہ حرم شریف کے کبوتروں کی بات کر رہا تھا۔ اردگرد کے زائرین اس کی باتوں سے ان جانے میں اپنی سمت کھوٹی کر رہے تھے۔

”آپ عظیم سے چلے کیوں آئے تھے؟“ قدرت نے پوچھا۔

”میں تو نہیں آیا، انہوں نے مجھے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔“

”کس نے پھینک دیا؟“

”انہوں نے کہا، تو نجس ہے“ اور مجھے اپنے آپ سے گندگی کی بو آنے لگی۔

اب بھی آرہی ہے۔ سو نگہ لو چاہے تم۔“

”مجھے تو نہیں آتی۔“ قدرت نے کہا

”مجھے تو آرہی ہے۔“

”اچھا۔ یہ تو بہت بڑا کرم ہو گیا آپ پر۔“ قدرت نے کہا۔



”کیا کما“ مجھے از سر نو غصہ آگیا۔ ”کرم یا ظلم۔“  
 ”اونہوں بہت بڑا کرم۔ ظلم نہیں۔“ قدرت بولے۔ اپنے آپ سے بدبو  
 آتا۔ اپنی گندگی کا احساس ہونا بہت بڑا کرم ہے۔ ہماری سب سے بڑی بد قسمتی یہ ہے  
 کہ ہمیں اپنے سے بو نہیں آتی۔ دوسروں سے آتی ہے۔ اگر آپ کے اپنے سے بو  
 آنے لگی ہے تو یہ عظیم کا کرم ہے۔“

قدرت کی بات سن کر غصے سے میرا منہ لال ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے  
 قدرت عظیم والوں کے ایجنٹ ہوں۔

میں نے غصے سے منہ موڑ لیا۔ ”میں یہاں ایجنٹوں کی باتیں سننے نہیں آیا۔“  
 دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ کوٹھے کی منڈیر سے کوئی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”سن رہے ہو اپنے ایجنٹ کی باتیں۔“ میں نے دہائی دی۔

”اونہوں ہمارا نہیں۔ ان کا ہو گا جنہیں تم سے بو آتی ہے۔“ منڈیر سے

آواز آئی۔ ”تمہیں خود اپنے سے بو آتی ہو گی۔ ہمیں تم سے بو نہیں آتی۔“

اللہ اکبر میزے دل میں نعرہ گونجا۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر۔

سارا حرم اذان کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

حرم

حرم شریف اللہ کا گھر ہے۔ جس طرح اللہ بے نیاز ہے۔ اسی طرح حرم  
 شریف کی فضا بھی بے نیاز ہے۔ وہاں کوئی پابندی نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں کہ میاں  
 کیا کر رہے ہو۔ چاہے آپ کالے ہیں، گندی ہیں، سانولے ہیں، یا گورے کوئی آپ کی  
 طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ چاہے آپ یورپی ہیں، چینی ہیں یا امریکی۔ کوئی تجسّس  
 محسوس نہیں کرے گا۔ چاہے آپ شیعہ ہیں، سنی ہیں یا وہابی۔ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جس  
 طرح جی چاہے نماز پڑھے۔ دونوں ہاتھ باندھ کر یا ایک ہاتھ باندھ کر یا دونوں ہاتھ کھلے  
 چھوڑ کر۔ چاہے نماز کے وقت آپ الگ ہو کر بیٹھ جائے، کوئی نہیں کہے گا کہ آپ نماز  
 میں شامل کیوں نہیں ہوئے۔

بے نیاز فقیر

حرم شریف کا وہ فقیر مجھے آج تک نہیں بھولا۔ جو سارا دن اور ساری رات



حرم کے عین درمیان میں پاؤں پسا کر چادر میں لپٹا ہوا سویا رہتا تھا۔ نماز کا وقت ہوتا تو وہ آپ ہی آپ اٹھ کر بیٹھ جاتا لیکن نماز ادا کرنے کے بعد وہ پھر سے چادر تان کر پڑ جاتا۔۔۔۔۔ اس کے پاس صرف ایک چادر تھی۔ وہ چادر اس کا واحد ساز و سامان تھی۔ نماز پڑھنے سے پہلے اس نے کبھی وضو نہیں کیا تھا اور نماز پڑھنے کے بعد وہ اتنی بے نیازی سے پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتا کہ بسا اوقات اس کے پاؤں خانہ خدا کی طرف ہو جاتے۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے لیکن جلد ہی ان کی توجہ دوسری باتوں کی طرف منعطف ہو جاتی اور انہیں وہ فقیر بھول جاتا۔ کچھ لوگ تجسس کے مارے اس فقیر کے پاس بیٹھ جاتے تاکہ اس پر نظر رکھیں لیکن۔ کسی زائر میں اتنی جرات نہ ہوتی تھی کہ اسے جگاتا۔ اس سے پوچھتا کہ میاں تم یہاں سونے کے لیے آئے ہو کیا۔ یا کم از کم اسے اتنا کہا کہ تم نے اتنی جگہ کیوں گھیر رکھی ہے۔ اٹھ کے بیٹھو میاں۔

محافظین حرم نے کبھی اسے یہ نہیں کہا تھا کہ بابا۔ جا اپنے ڈیرے پر جا کر سو۔ کسی مولوی میں اتنی جرات نہ ہوتی تھی کہ اسے سرزنش کرتا اور کہتا اپنی ٹانگیں خانہ خدا کی طرف مت کر۔

حرم شریف میں کسی مولانا میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ عورتوں کو منع کرنا کہ بیبیوں مردوں کے ساتھ طواف نہ کرو۔ مردوں کی بھیڑ میں داخل ہونے سے احتراز کرو۔ نامحرموں کے قریب مت بیٹھو۔

### اسلام کو خطرہ

حرم شریف میں اسلام خطرے میں نہ تھا۔ اسلام کے مخالفین یہ بھولے بیٹھے تھے کہ وہ اسلام کی حفاظت کے لیے دنیا پر اتارے گئے ہیں۔

حرم شریف میں مذہب کی قید نہ تھی۔ رسم کی قید نہ تھی۔ رواج کی قید نہ تھی۔ گناہ اور ثواب کی قید نہ تھی۔

حرم شریف میں کوئی نامح نہ تھا۔ کوئی مسکوں کا اجارہ دار نہ تھا۔ کوئی ہمہ دان نہ تھا۔ وہاں کوئی منع کرنے والا نہ تھا۔ چاہے ناچ ناچ کر طواف کرو۔ چاہے سجدہ کرنے والے کے سامنے سے گزر جاؤ۔ چاہے نماز پڑھنے والے کے سامنے بت بن کر بیٹھ جاؤ۔ کسی عالم میں اتنی جرات نہ تھی کہ ٹوکے۔ مین میخ نکالے۔ کسی مفتی میں امت



نہ تھی کہ فتویٰ جاری کرے۔

حرم شریف میں کوئی بندش نہ تھی۔ کوئی تکلف نہ تھا، کوئی قاعدہ نہ تھا، کوئی گرانہ نہ تھی۔ صرف نفس مضمون، نفس مضمون، نفس مضمون۔

وہاں خدا اور بندے کے درمیان کچھ حارج نہ تھا۔ نہ مذہب نہ رسم و رواج نہ قاعدہ نہ گناہ نہ ثواب۔

زائرین میں کوئی آقا نہ تھا کوئی غلام نہ تھا کوئی بزرگ نہ تھا۔ کوئی عالم نہ تھا۔ امیر میں امارت کی بو نہ تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کے پاس لاکھوں کابنک بیلنس ہے۔ نواب اپنی جاگیر کو بھولے بیٹھا تھا۔ افسر کو یاد نہ رہا تھا کہ وہ اپنے چہڑا سی کے پاس بیٹھا ہے۔ عورت کو یاد نہ تھا کہ وہ عورت ہے اور اس کے پاس بیٹھا ہوا مرد نامحرم ہے۔ ملا کو یہ یاد نہ تھا کہ وہ اسلام کا اجارہ دار ہے۔

یہ سب حرم شریف کا اعجاز تھا۔ نہیں حرم کا نہیں۔ اس کا اعجاز تھا جو اپنے بھدے بے ڈھنگے کوٹھے کی منڈیر سے اپنے بندوں کو جھانک رہا تھا۔ ان پر مسکراہٹیں پھینک رہا تھا۔ انہیں آنکھیں مار رہا تھا۔

اللہ اور بندے

حرم شریف اس وقت صرف اللہ کا گھر نہیں تھا۔ وہ بندوں کا گھر بھی تھا۔ اللہ اور بندہ دونوں اکٹھے اس گھر میں مقیم تھے۔ خانہ خدا میں اللہ اور بندہ شانہ سے شانہ جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہاں ایسے زائرین بھی تھے جو حرم شریف میں مقیم تھے۔ وہیں دن رات عبادت کرتے تھے اور جب نیند آتی تو وہیں سو جاتے تھے۔ ایسے زائرین بھی تھے جو دوپہر کو رات کا کھانا وہیں کھاتے تھے۔ کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ بندہ خدا یہ کیا ڈائیٹنگ ہال ہے۔

مطاف میں خانہ خدا کے عین زیر سایہ عربی معلم زائرین کو دھڑا دھڑا لوٹ رہے تھے۔ وہ زائرین سے طواف کرانے کا بھاؤ کر رہے تھے۔ اوراد کو مینگے داموں فروخت کر رہے تھے۔ نیچے وہ اللہ کا نام بیچ رہے تھے۔ اوپر اللہ مسکرائے جا رہا تھا۔ میں حیرت سے بت بنا کر ہاتھ لگا رہا تھا۔



میری دانست میں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی اللہ کا نام نیچے۔ دین کی عجارت کرے۔ قرآن کریم کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔ اسلام کو ذاتی وقار کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ میری دانست میں کوئی بڑے سے بڑا گناہ اس قدر مذموم نہیں ہو سکتا۔ مگر وہ مسکرائے جا رہا تھا۔ میں حیرت سے بت بنا کھڑا تھا۔

### میزاب رحمت

اسی مطاف کے ایک کونے میں وہ بڑھا کھڑا تھا۔ وہ بڑھا صبح و شام وہیں میزاب رحمت کے سامنے کھڑا رہتا تھا۔

میزاب رحمت خانہ خدا کی چھت سے نکلا ہوا ایک پرنا ہے۔ جب بارش ہو رہی ہو۔ اور رحمت کا پرنا چل رہا ہو تو جو شخص میزاب رحمت سے گرتے ہوئے دھارے تلے کھڑا ہو گا وہ رحمت خداوندی میں شرابور ہو جائے گا۔ لیکن عام طور سے یہ مشہور ہے کہ جو میزاب رحمت سے گرتے ہوئے دھارے تلے کھڑا ہو گا اس پر بہشت کے دروازے کھل جائیں گے۔

وہ بوڑھا ایک نظر میزاب رحمت پر ڈالتا اور دوسری نظر آسمان پر۔ اس کی نگاہیں پرنا لے اور آسمان کا یوں طواف کرتی رہتیں جیسے گھڑی کا پنڈولم ہوں اسے نہ طواف کی پروا تھی نہ نماز کی۔ صرف ایک لگن تھی کہ آسمان سے پانی برسے۔ پرنا لے سے دھارا گرے۔ اور وہ اس کے نیچے کھڑا ہو کر بھیکے اور یوں اس پر جنت کے دروازے کھل جائیں۔ وہ بڑھا جنت کا طلبگار تھا۔ دودھ کی نہروں حوروں اور غلمان کا طالب تھا۔

اس بوڑھے کو دیکھ کر میری ہنسی نکل جاتی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی چھاچھ کے منگے پر بیٹھا چھاچھ کے خواب دیکھنے میں مصروف ہو۔ حرم شریف میں نہ جانے کتنے افراد ایسے تھے جو دودھ کے منگے پر بیٹھے چھاچھ کی آرزو میں دیوانے ہو رہے تھے۔ کوئی وہاں پچھلے گناہ دھلوانے آیا تھا جیسے خانہ خدا سٹ بازی کا مرکز ہو۔ کوئی حوروں غلمان کا بھوکا۔ بہشت کا ٹکٹ کٹوانے آیا تھا جیسے خانہ خدا بنگ آفس ہو۔

کیا یہاں بیٹھے ہوئے لوگ زائر ہیں یا سوداگر۔



میرا قہقہہ چاروں طرف گونجا۔

کوٹھے سے کسی نے میری طرف نیچے جھانکا۔

”پانی کیوں نہیں برساتے۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”دیکھتے نہیں یہ بڑھا کب سے

تیرے پر نالے کے نیچے کھڑا ہے۔ اس کی نگاہیں پنڈولم کی طرح چل چل کر دھندلا گئی ہیں۔ اس کی گردن متورم ہو گئی ہے۔ اس طالب کی آرزو پوری کیوں نہیں کرتے۔“

زار۔ سوداگر

”یہ اتنے سارے سوداگر جو زار کا بھیس بدلے تیرے کوٹھے کے ارد گرد بیٹھے

ہیں۔ ان کے مطالبات پورے کیوں نہیں کرتے۔“ میرا قہقہہ حرم میں گونجا۔

”بتا ان میں کتنے لوگ ہیں جو تیری ذات کی خاطر یہاں آئے ہیں؟“

”کیا اتنی بھیڑ میں تو اکیلا ہے؟“

”کیا کسی کا دھیان تیری طرف بھی ہے۔ مانا کہ سب تیرے نام کی مالا جپ

رہے ہیں۔ نام کی۔۔۔۔ تیری نہیں۔“

”تیری نہیں۔ تیری کتاب کی پوجا کر رہے ہیں۔“

اس نے اپنی ٹھوڑی منڈیر پر رکھی ہوئی تھی اور وہ ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ

رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھیں پر نم ہوں۔

عین اس وقت کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔

میرے پیچھے نظم و نسق کا متوالا سرفراز کھڑا تھا۔

”آپ تو پڑھے لکھے آدمی نظر آتے ہیں“ وہ بولا۔ ”آپ تو توہم پرست

نیں۔ پھر آپ اس بوڑھے کے پاس کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ یہ بوڑھا تو توہم پرستی کی

وجہ سے دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس سے کوئی پوچھے بڑے میاں کیا اس پر نالے کے پانی میں

بہشت بہہ کر چلا آئے گا۔ کہاں خلد بریں کہاں اس پر نالے کا پانی۔ بہشت حاصل کرنا

ہے تو اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ اپنے اعمال کو منظم کرو۔ اپنے کردار کو

سنوارو۔ حد ہو گئی توہم پرستی کی۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

سرفراز مجھے وہاں سے گھسیٹ کر دور برآمدے میں لے گیا تھا۔ وہاں دیر تک

وہ مجھے مسلمانوں کی توہم پرستی پر لیکچر پلاتا رہا۔



میراجی نہیں چاہتا تھا کہ اللہ کے کوٹھے سے دور جا کر بیٹھ جاؤں۔ میراجی چاہتا تھا کہ کوٹھے کے والی سے باتیں کروں۔ میراجی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ سے گرتے ہوئے آنسو کو اٹھا کر اپنے جسم سے مل لوں۔ میراجی چاہتا تھا کہ میں سرفراز کو بتاؤں کہ وہ خود کوٹھے کی منڈیر سے جھانک رہا ہے لیکن یہ سب باتیں میں اسے کیسے بتاتا۔

### تو اہم پرستی

سرفراز تو مجھے پڑھا لکھا آدمی سمجھ رہا تھا وہ سمجھ رہا تھا۔ میں عقل و ادراک کا مالک ہوں تو ہم پرست نہیں۔ پھر اسے کیسے بتاتا اسی لیے میں چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

دفعتا "وہ جلال میں آگیا۔"

یہ تو ہم پرستی اسلام کے منافی ہے۔ یہ تو ہم پرستی اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہے۔ یہ تو ہم پرستی ہمارے لیے باعث ننگ ہے۔"

عین اس وقت ایک شور اٹھا۔ ایک گرج حرم شریف کی مرمریں دیواروں سے آکر ٹکرائی اور پھر چاروں طرف گونجی۔

ہم دونوں نے ڈر کر خانہ خدا کی طرف دیکھا۔ حرم پر ایک بدلی چھا چکی تھی۔ خانہ خدا پر بڑی بڑی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ میزاب رحمت سے پانی کی ایک چھوٹی سی دھار گر رہی تھی اور وہ بوڑھا اس دھارے کے نیچے کھڑا اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے لگا رہا تھا۔

یہ دیکھ کر سرفراز کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کی پتلیاں پھیل گئیں، مٹھیاں پہنچ گئیں جیسے اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور پھر غصے میں بھرا ہوا خانہ خدا کی طرف یوں بھاگا جیسے وہ اس بڑھے کی ہڈیاں توڑ دے گا۔

میں ڈر گیا "رک جاؤ سرفراز، ٹھہرو ٹھہرو سرفراز۔" میں اس کے پیچھے پیچھے

بھاگا۔

میزاب رحمت کے قریب پہنچ کر سرفراز نے بڑھے کو زور سے دھکا دیا اور پھر

--- خود اس دھارے کے نیچے کھڑا ہو گیا۔



خوشی سے وہ دیوانہ وار نعرے لگانے لگا۔ آیتیں پڑھنے لگا۔ چھینٹے اڑانے لگا۔

تاجر ہی تاجر

اس کے قریب پہنچ کر میں رک گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا اور جوش میں چلانے لگا۔ ”آ جاؤ آ جاؤ۔ یہ لمحہ پھر نصیب نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ آ جاؤ۔“

پھر چاروں طرف سے لوگوں نے میزابِ رحمت پر یورش کر دی۔ وہ سب چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔ آیات کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو یوں دھکے دے رہے تھے۔ جیسے ہولی کھیل رہے ہوں۔

کوٹھے کی چھت پر کوٹھے کا والی مسکرا رہا تھا۔ میزابِ رحمت کی رنگ پچکاری سے بہشت کے گاہکوں کو بھگو رہا تھا۔ ان کی دھکم پیل کو دیکھ کر تالیاں بجا رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔۔۔۔۔ لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

کوئی اس کا طالب نہ تھا۔

کسی کو اس کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔

وہ سب بہشت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکے دے رہے تھے۔

ان کی نگاہوں تلے حوریں تھیں۔ دودھ کی نہریں تھیں۔ باغیچے تھے۔ پھلوں سے بھری ہوئی طشتریاں تھیں۔

بے شک ان کے ہونٹوں پر اللہ کا نام تھا۔ لیکن وہ سب اس نام کو استعمال کر

رہے تھے۔ آخرت میں اپنے آرام و آسائش کے حصول کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

اس وقت ان میں کوئی زائر نہیں تھا۔ تاجر ہی تاجر، تاجر ہی تاجر۔



## زائرین اور حج

توحید پرست اور بت پرست

قدرت نے کہا ”کل حج کے لیے روانگی ہوگی۔ ہمیں قبل از ظہر مکہ سے نکل جانا چاہیے۔ یہ سن کر میرا دل بیٹھ گیا۔

میں نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ کوٹھا ویران دکھائی دے رہا تھا۔ دیواریں نکلی تھیں۔ غلاف کے کونوں میں رسیاں باندھ کر اوپر اٹھا دیا گیا تھا۔ دیواروں پر لگے ہوئے بڑے بڑے نیم کندہ سلیٹی پتھر دور سے نظر آ رہے تھے۔

کہتے تھے غلاف کے پلو اس لیے اٹھا دیے گئے ہیں کہ خانہ کعبہ کو غسل دیا جائے گا۔ شاہ سعود خود اپنے ہاتھوں سے غسل دیں گے اور پھر نیا غلاف لگایا جائے گا۔ کوٹھے کی منڈیریں خالی تھیں۔ ان سے کوئی جھانک نہیں رہا تھا۔ کوئی ان کی اوٹ میں چھپا ہوا نہ تھا۔ اک بے نام افسردگی اور ویرانی طاری تھی۔ پھر بھی میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ کوٹھے کو چھوڑ کر حج کے لیے جاؤں۔

”آپ معلم سے آج ہی مل لیں۔“ قدرت نے کہا۔

میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ معمول سے زیادہ خوش ہوں۔

قدرت اس لیے خوش تھا کہ وہ اللہ کا حکم بجالانے کے لیے حج پر جا رہے تھے۔

میں بے حد ناخوش تھا۔ اس لیے کہ میں خانہ خدا سے دور جا رہا تھا۔

میرے نزدیک خانہ خدا کے قرب سے بڑھ کر کوئی عشرت نہ تھی۔

قدرت توحید پرست تھے۔

میں بت پرست تھا۔



اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ اس توحید پرست کو اٹھا کر حرم سے باہر پھینک دوں۔

”آپ ابھی اپنے معلم سے جا کر ملئے۔“ قدرت بولے۔ ”ان سے کانگنات پر مہر لگوا لیجئے ورنہ ہمیں راستے میں وقت پیش آئے گی۔“

اس وقت تک معلم میرے لیے صرف ایک نام تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ کون ہے۔ اس کا ڈیرہ کہاں ہے۔

”معلم کہاں ملے گا“ میں نے پوچھا۔

”کیا پتہ۔ تلاش کیجئے۔“

”لیکن کہاں؟“

”یہیں کے میں۔ وہ پاکستانی زائرین کے معلم ہیں۔ کسی سے ان کا ڈیرا پوچھ لیجئے۔ پتہ چل جائے گا۔“

میں سیدھا پاکستانی ہوٹل میں چلا گیا۔ ہوٹل کے لڑکے نے کہا۔ ”بالکل آسان راستہ ہے۔ بائیں ہاتھ کی گلی میں جاؤ پھر دائیں ہاتھ مڑ جاؤ پھر دو گلیاں چھوڑ پھر دائیں ہاتھ گھومو پھر دس قدم چلو اور بائیں ہاتھ گھومو پھر تین گلیاں چھوڑ اور بائیں ہاتھ گھومو۔ بس سامنے ان کا ڈیرا ہے سمجھے؟“

کوئی مجھے پتہ سمجھائے اور اتنی محنت اور محبت سے سمجھائے جیسے ہوٹل کے اس لڑکے نے سمجھایا تھا تو مجھ میں اتنی جرات نہیں پڑتی کہ اسے کہوں میں نہیں سمجھا۔ لہذا میں نے بڑی شکرگزاری سے سر ہلا دیا جیسے بالکل سمجھ گیا تھا۔

اس روز میں مکے کی تنگ اور پیچیدہ گلیوں میں گھنٹوں آوارہ گھومتا رہا۔ دو ایک راہ گیروں سے راستہ پوچھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جواب میں قرآن کریم کی آیت پڑھ دی۔ کوئی قرآن کریم کی آیت پڑھ دے تو میں لاجواب ہو جایا کرتا ہوں۔ یہ میری پرانی کمزوری ہے۔

گلیوں کے مکانات میں جگہ۔ جگہ دہلیزوں پر، ڈیوڑھیوں میں، زینے کی بیڑھیوں پر، صحنوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ یوں پڑے تھے جس طرح کسی پرانے کارخانے کے عقبی صحن میں کاٹھ کبار بکھرا پڑا ہوتا ہے۔

کچھ لوگ حال مست کیفیت میں پڑے تھے۔ ذہن کے پٹ بند کیے۔ سپردگی



اور حواگی کے جذبہ سے سرشار۔

زیادہ تر لوگوں کی آنکھوں میں چمک تھی۔ ذہن کے دیئے جل رہے تھے۔  
ظاہر تھا کہ وہ سوچوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کھڑکیاں کھول رکھی ہیں۔

### کھڑکیاں اور درتپے

سوچیں کھڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ کھڑکیاں حال سے باہر کھلتی ہیں۔ وہ لوگ جو  
حال سے مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ حال کی تلخیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے ماضی کی  
کھڑکیاں یا مستقبل کے درتپے کھول لیتے ہیں۔  
کھڑکیاں بھی رنگ برنگ کی ہوتی ہیں۔

کھڑکی کھولنے کے انداز بھی رنگ رنگ کے ہوتے ہیں۔ پوری نظم تو مجھے یاد  
نہیں نہ جانے کس شاعر نے یہ کیفیت یوں بیان کی ہے کہ برسات کا موسم ہے بادل  
چھائے ہوئے ہیں بوندیں پڑ رہی ہیں۔ کتنا دلفریب موسم ہے لیکن  
میں وہ ماضی پرست ہوں کہ مجھے  
یاد آتی ہیں پچھلی برساتیں

جب میں معلم کے ڈیرے پر پہنچا تو کھڑکیاں اور درتپے واضح طور پر میرے  
سامنے آ گئے۔ حسرتوں کی کھڑکیاں شکایات کی کھڑکیاں، دکھ سکھ کی کھڑکیاں یادوں کے  
طاقچے، خوف و خدشات کی کھڑکیاں، وہم و گمان کی کھڑکیاں، طمع کی کھڑکیاں، حرص کی  
کھڑکیاں۔ جانے کیسی کیسی کھڑکیاں۔

یہ کھڑکیاں مکے سے باہر کھلتی تھیں۔ سر زمین حجاز سے باہر کھلتی تھیں۔  
زائرین ان کھڑکیوں سے باہر دیکھنے میں شدت سے مصروف تھے۔

ایسے زائر بھی تھے جو مکہ میں قیام کا حظ اٹھانے کے بجائے اس فکر میں گھلے جا  
رہے تھے کہ مکے سے وداع ہونے کا دن آ پہنچا تھا۔ ایسے زائر بھی تھے جو مکہ میں جینے کی  
لذت کو بھول کر یہ دعا مانگ رہے تھے کہ یا اللہ ہمیں موت اسی پاک سر زمین پر واقع  
ہو۔ یا اللہ اسی مٹی میں دفن ہونے کی سعادت نصیب کر۔

### پالتو شکایات

شکایات کی کھڑکیوں کا کوئی شمار نہ تھا۔



کئی لوگوں کو منگائی کی شکایت تھی۔ انہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر سارے پیسے ختم ہو گئے تو واپسی پر عزیز و اقربا کے لیے کسکھیں اور آب زم زم کی کپیاں کیسے لے جاسکیں گے۔

کئی لوگوں نے یہ فکر پال رکھی تھی کہ کھانا اچھا نہیں ملتا۔ اور چونکہ کھانا اچھا نہیں مل رہا۔ لہذا صحت خراب ہوئی جا رہی ہے۔ وہ خرابی صحت کے انڈے کو سینچ رہے تھے۔

اچھی صحت کا دار و مدار اس بات پر نہیں ہوتا کہ صحت اچھی ہو بلکہ اس بات پر کہ اچھی صحت ہونے کی فکر دامن گیر نہ ہو۔ وہاں میں نے تندرست پہلوان دیکھے جنہیں خرابی صحت کی فکر کا کھن لگا ہوا تھا۔

پتہ نہیں زائرین نے شکایات کی کھڑکیاں کیوں کھول رکھی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں اس بات کا شعور تھا یا نہیں کہ شکایتیں پالنا کھڑکیاں کھولنے کے مترادف ہے اور ہر کھڑکی حال سے غیر حاضری کا پتہ دیتی ہے۔ وہ زائر جو دعائیں مانگ مانگ کر سر زمین حجاز میں پہنچے تھے اب انجانے میں کھڑکیاں کھول کر باہر دور نہ جانے کدھر دیکھ رہے تھے۔

معلم کے ڈیرے پر مجھے وقار صاحب مل گئے۔ وقار صاحب میرے پرانے جاننے والے ہیں۔ وہ ایک معزز باوقار آدمی ہیں۔ پہلے تو انہوں نے مکہ میں میری موجودگی پر حیرت کا اظہار کیا۔ جیسے میرا وہاں ہونا ناقابل قبول بات ہو۔ میں نے سرسری طور پر پوچھا کیسے گزر رہی ہے۔ اس پر وہ میزا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک طرف لے گئے۔ پھر وہ گویا پھوٹ بنے۔

بند کرا

کہنے لگے مفتی صاحب کیا بتائیں۔ ان کبھیوں نے تو ہمارا حج ہی فسق کر دیا ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارے پہلو میں غلاطت کا انبار لگا دیا جائے گا۔ اور ہمارے لیے اس پاکیزہ فضا کو متعفن کر دیا جائے گا۔ کسی سے کیا ملے مفتی صاحب اپنے اپنے نصیب ہیں۔

وقار صاحب نے جو کھڑکی کھول رکھی تھی۔ اس کی نوعیت انوکھی تھی۔ پتہ



نہیں انہیں مکہ معظمہ میں ایسی پرلذت اور پر اسرار کھڑکی کھولنے کا خیال کیسے آیا تھا۔

جس جگہ وقار اور ان کی بیگم مقیم تھے۔ اس سے ملحقہ ایک کوٹھڑی تھی۔ یہ کوٹھڑی ان کے معلم کے عمل دخل سے باہر تھی۔ اس کوٹھڑی میں ادھیڑ عمر کی ایک پاکستانی زائرہ مقیم تھی۔ جس سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ پھر ایک روز ایک اجنبی اس زائرہ سے ملنے کے لیے آیا۔ یہ تفصیل میاں بیوی دونوں کے لیے ناقابل قبول تھی۔ ایک نامحرم کو یوں کمرے میں ملا جائے اور پھر کمرے کا دروازہ اتنی دیر تک بند رہے۔ بیگم وقار اس روز سارا دن ”ہائے یہ کیا ہو گیا“ کا ورد کرتی رہیں۔ اور پھر بار بار اپنے میاں کی توجہ اس بند کمرے کی طرف مبذول کراتی رہیں۔ ”میں پوچھتی ہوں یہ کمرہ اتنی دیر سے کیوں بند ہے“ آخر کیوں؟“

اس کے بعد میاں بیوی دونوں کے احساس شرافت پر ایک اور ظلم ڈھایا گیا۔ وہ نامحرم مرد اپنا سامان لے کر آگیا اور باقاعدہ طوز پر اس کوٹھڑی میں خاتون کے ساتھ مقیم ہو گیا۔

یہ انتہا تھی۔ میاں بیوی دونوں کو سخت صدمہ ہوا۔ بیگم میں شوق تجسس جاگا اور اس شدت سے جاگا کہ وہ نیم پاگل ہو کر رہ گئیں۔ دن کے وقت وہ دونوں کوٹھڑی پر نگاہ رکھتے۔ بیگم کے کان کھڑے رہتے۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کا حساب رکھتے۔

پھر جب رات پڑتی تو بیگم دروازے کی درزوں سے کوٹھڑی میں جھانکتیں اور میاں کے لیے رنگ کنٹری کرتی رہتیں۔ یوں ان کے دن رات اس کوٹھڑی سے اس قدر بھر گئے کہ کسی اور چیز کی گنجائش نہ رہی۔

وقار صاحب دیر تک اپنی بد قسمتی کی داستان مجھے سناتے رہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی جگالی کرتے رہے تاکہ اس لیے کی اہمیت مجھ پر واضح ہو۔

ان کے جوش و خروش اور شدت جذبات کو دیکھ کر مجھ میں جرات نہ ہوئی کہ کھل کر ان سے کہوں ”وقار صاحب آپ اس کھڑکی کو بند کیوں نہیں کر دیتے۔“

صرف ایک بار میں نے سرسری کوشش کی۔ صرف ایک بار میں نے کہا۔ ”وقار صاحب انہیں بند کوٹھڑی میں جینے دیجئے۔ آپ حرم کے کوٹھے کی موج لیجئے۔ اس



کو ٹھڑی پر خانہ کعبہ کو کیوں قربان کر رہے ہیں آپ؟“

کردہ اور ناکردہ گناہ

میری بات سن کر وقار صاحب یوں چور چور ہو گئے۔ جیسے کانچ کے گلاس پر ضرب پڑی ہو۔ ان کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ ”آپ سمجھتے کیوں نہیں مفتی صاحب“ وہ بولے ”ہم اتنے بڑے الیے سے گزر رہے ہیں۔ مکہ شریف میں آکر ہم پر اتنا بڑا حادثہ گزر گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارا یہ سفر پاک داغ دار ہو گیا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ اس المناک واقعہ سے بے نیاز ہو جائیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

میراجی چاہا کہ ووڈ کر حرم شریف پہنچوں اور کوٹھے کے والی سے پوچھوں ”بتا یہ کیا بھید ہے۔ غلاطت اور گناہ تو رکاوٹیں ہوئیں لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ طبعی شرافت، نیکی اور صفائی عظیم تر رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ گناہ کی نسبت احساس گناہ عظیم تر دیوار بن جاتی ہے۔ کردہ گناہ کی نسبت ناکردہ گناہ راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“ کو ٹھڑی کے کینوں کو غلاطت شاید ان کی اپنی راہ کی ٹھوکر نہیں بنتی بلکہ معصوم پڑوسیوں کی منزل کھوٹی کر دیتی ہے۔ بتا یہ کیا بھید ہے۔ یہ بھید کیوں ہے۔ کیوں تیرے نیک اور معصوم بندوں کو حالات نے الجھاؤ میں ڈال رکھا ہے؟“

شک و شبہات

پھر کسی نے میرا بازو تھام لیا۔ وہ ایک عمر رسیدہ باتونی آدمی تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی پراسرار چمک تھی۔ آواز میں دبدبہ تھا ”انداز خبردار قسم کا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور انگلی ہلا ہلا کر مجھے سرزنش کرنے لگا۔ ”میاں۔“ وہ بولا۔ ”خبردار رہنا۔ یہاں کے لوگوں سے خبردار رہنا۔ ان کی باتوں میں نہ آنا ورنہ پچھتاؤ گے۔ جس طرح میں پچھتا رہا ہوں۔ یہ لوگ دوکاندار ہیں۔ حج ان کے لیے مقدس فریضہ نہیں بلکہ کاروبار ہے کاروبار۔“

”ان کے نزدیک قول کی کوئی اہمیت نہیں۔ جب وقت آتا ہے تو وہ بدل جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ایک بار نہیں بار بار۔ جدہ سے یہاں آنے کے لیے انہوں نے ہم سے ۴۰ ریال طے کیے تھے۔ پھر جب ہم نے اپنا سارا سامان موٹر پر رکھ دیا تو ڈرائیور بولا۔ ۶۰ ریال لوں گا۔ منظور ہے تو چلو نہیں تو اپنا سامان اتار لو۔“







جذبات سے لبرز تھے۔ انہیں اپنی خوش قسمتی پر ناز تھا کہ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس میں کوئی دکھاوا نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑے اہتمام سے درتچے کھولنے میں مصروف تھے۔ بڑے شوق سے ان درپچوں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ بڑے انہماک سے حضوری کی نفی کرنے میں کوشاں تھے کیوں؟ میری حیرت نمناک تھی۔

### باتھ اور سلیم کی ماں

ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ ”میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں۔ یہ تنگ جگہ، یہ خستہ حال کمرہ، یہ غلیظ ماحول، یہ بد مزہ کھانا، مجھے یہ سب گوارا ہے، خوشی سے گوارا ہے۔ خدا شاہد ہے میں شاکی نہیں۔ لیکن مجھے صرف ایک نیٹ اینڈ کلین باتھ روم چاہیے۔ عالی شان نہیں صرف صاف ستھرا اور میں نے اس کے لیے دگنا کرایہ ادا کیا تھا۔ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ ایک الگ صاف ستھرا باتھ روم مہیا کیا جائے گا۔ لیکن ابھی تک وعدہ ایفا نہیں کیا گیا۔ بس یہی ایک غلش دل میں کانٹے کی طرح لگی رہتی ہے۔“

ایک صاحب کیفیت سے سرشار تھے۔ ”سبحان اللہ سبحان اللہ کیا مقام ہے، کیا عظمت ہے۔ بس ایک ہی افسوس لگا ہے کہ سلیم کی ماں اس سعادت سے محروم رہ گئیں۔“

”جب حرم میں حاضری دیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر سلیم کی ماں بھی موجود ہوتی تو..... جب زیارتوں پر جاتا ہوں تو دل میں کسک اٹھتی ہے اگر سلیم کی ماں بھی..... جب طواف کرتا ہوں تو یہ دکھ ہوتا ہے کہ اگر سلیم کی ماں بھی.....“

سلیم کی ماں کی غیر حاضری کے درتچے نے ان کی اپنی حاضری کو جاں غسل بنا رکھا تھا۔ بیشتر زائر ایسے ہیں جو یہاں سے روانہ ہوتے وقت کھڑکیاں اور درتچے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ شاید اس ڈر کے مارے یہاں پہنچ کر وہ انہیں مہیا نہ کر سکیں۔ روانگی کے وقت ان درپچوں کی چوکھٹیں وہ اپنے سامان کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ ساتھ لیے پھرتے ہیں اور ہر مقام پر پہنچنے کے بعد ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ انہیں فٹ کر لیں اور جب وہ فٹ ہو جاتے ہیں تو وہ مسلسل باہر دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں۔



صرف عام لوگوں کی بات نہیں۔ بڑے بڑے دانش ور بھی اپنے اپنے درتھے ساتھ لے جاتے ہیں۔ حالانکہ دانش ور کو نئے اور تازہ درتھے ایجاد کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

### ابوالاثر اور بت

حج سے واپسی پر ازراہ اتفاق جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے بڑے فخر سے کہا۔ ”آپ کو پتہ نہیں میں حج کرنے گیا تھا۔“  
 ابوالاثر سرسری انداز میں بولے ”ہاں اکثر لوگ جاتے ہیں۔“  
 میں نے کہا۔ ”جانا ہی بڑی بات ہے۔“  
 ہنس کر جواب دیا۔ ”اہم بات یہ ہے کہ بخیر و عافیت لوٹ آؤ۔“  
 میں نے کہا۔ ”آپ بھی تو گئے تھے حج پر۔“  
 بولے۔ ”ہاں گیا تھا حج پر۔“  
 ”پھر؟“ میں نے بات بڑھائی۔

ہنس کر پنجابی میں کہنے لگے۔ ”وہاں کوئی حج نہیں مفتی جی۔“

حفیظ کی اس بات پر میں بہت حیران ہوا۔ حفیظ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ وہ عظیم شاعر ہیں مستند دانش ور ہیں۔ ان کی شخصیت میں انفرادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میں نے انہیں کئی ایک حبشینوں سے دیکھا ہے۔ مداح کی حیثیت سے۔ دوست کی حیثیت سے۔ ساتھی کی حیثیت سے۔ اسی لیے میں ان کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔ ان کے منہ سے ”کوئی حج نہیں“ سن کر میں بہت حیران ہوا۔

پھر بات کھل گئی۔ حفیظ صاحب کی غیر مطبوعہ حج بیٹی ہاتھ لگ گئی۔ جس سے انکشاف ہوا کہ حفیظ صاحب جاتے ہوئے ایک بت ساتھ لے گئے تھے۔

اپنی ڈائری کے پہلے دو صفحات پر ابوالاثر لکھتے ہیں

مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۳۵ء

صبح پانچ بجے جاگا۔ رات بھر سو نہ سکا تھا۔ خیالات سے دماغ بھرا ہوا تھا۔ بستر بندھا رکھا تھا۔ سامان تیار تھا۔ بارہ بجے رات تک والد صاحب بیوی بچیاں میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔



اس کے بعد میں نے ان سے کہا۔ ”جاؤ سو جاؤ کیوں کہ صبح تڑکے  
جج پر روانہ ہونے کے لیے اٹھنا پڑے گا۔“

”وہ چلے گئے تو میں بھی لیٹ گیا۔ نیند نہ آئی۔ دل کی  
طرف خیال کیا تو ایک ذرہ برابر بھی تشویش نہیں تھی۔ میں نے  
دل سے پوچھا۔

”اے دل کیا تو اس مقدس سفر سے گھبراتا ہے؟“

دل نے کہا۔ ”نہیں“

میں نے سوال کیا ”کیا تجھے اس بات کا خیال ہے کہ  
چونکہ میں نواب صاحب بہاول پور کی معیت میں جا رہا ہوں۔  
اس لیے شاید خداوند تعالیٰ کی عبودیت کے اظہار کا حق کماحقہ ادا  
نہ ہو سکے گا۔“

دل نے جواب دیا۔ ”تمہیں ساتھ لے چلنے کا جو احسان  
کیا ہے۔ اس کی شکرگزاری کے سوا اور کسی قسم کی تعظیم نہ کی  
جائے گی۔ جس سے روح کو کسی انسان کے سامنے جھکنے کی  
شرم ساری ہو۔۔۔۔۔“

ظاہر ہے کہ حفیظ نے یہ خود محسوس کر لیا تھا کہ وہ ایک بت کی معیت میں  
رہے ہیں۔ اگرچہ حفظ ماتقدم کے خیال سے انہوں نے شعوری طور پر اس کا اعتراض  
نہ کیا۔

ڈائری کے دوسرے صفحے پر بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔ ملاحظہ ہو

مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۵ء

۔۔۔۔۔ نواب صاحب کے پبلسٹی افسر نے مجھ سے کہا ”کیا

آپ رخصتی کے وقت کچھ پڑھیں گے۔ میں نے جواب دیا ”مجھ  
کو اس کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ ایسا ہو گا۔“

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وقت پر کوئی (نواب صاحب)

مجھ سے کہہ بیٹھے اس لیے میں نے اسی وقت چند شعر جوڑے۔

مدینے کو چلا ہے قافلہ ایمان والوں کا



رہ حق میں سر تسلیم خم ہے شان والوں کا

ہوا ثابت کہ دونوں جہاں میں بیڑا پار ہے اس کا  
کہ سر صادق کارواں سالار ہے جس کا  
مجھ میں اور حفیظ صاحب میں چنداں فرق نہ تھا۔  
ہم دونوں ہی بت پرست تھے۔

میں نے خانہ خدا کو بت بنا کر اللہ کو اس کی اوٹ میں مقید کر دیا تھا۔ حفیظ  
صاحب نواب صاحب کو بت بنا کر ساتھ لے گئے تھے۔ وہ جہاں بھی پہنچتے اپنے بت کو  
ایسی جگہ نصب کر دیتے کہ سب کچھ اس کی اوٹ میں آجاتا۔

### خارجی اور داخلی

خارجی نگاہ سے دیکھا جائے تو حج ایک Ritual ہے۔ ایک رسم، ایک  
جمناسٹک، ایک قواعد۔

کعبہ کے گرد پھیرے لو۔ دو پہاڑوں کے درمیان دوڑو۔ ظہر سے پہلے مکہ سے  
منیٰ پہنچو۔ وہاں ظہر اور مغرب اکٹھی پڑھو۔ رات قیام کرو۔ اگلے دن غروب آفتاب  
سے پہلے عرفات پہنچو۔ وقوف کرو۔ غروب آفتاب کے بعد مغرب کی نماز پڑھے بغیر  
مزدلفہ جاؤ۔ وہاں مغرب اور عشاء اکٹھی پڑھو اور کنکر چنو۔ سورج چڑھنے سے پہلے منیٰ  
کو روانہ ہو جاؤ۔ وہاں تین دن شیطانوں کو کنکر مارو۔ قربانی دو۔ پھر مکہ پہنچو۔ بال  
کٹواؤ۔ خانہ کعبہ کے پھیرے لو اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ حاجیوں کے حج قبول۔

تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ کے زمانے سے پہلے دور جمالت میں جو  
حج کا Ritual ہوتا تھا۔ اس کی تفصیلات تقریباً ایسی ہی ہوتی تھیں۔

مطلب یہ ہوا کہ حج کی خارجی شکل میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ داخلی پہلو کے لحاظ  
سے عظیم تبدیلی عمل میں آئی ہے۔ خارجی شکل پہلے بھی ایک جمناسٹک کی تھی۔ اب  
بھی ہے۔ اگر آپ ارکان حج کو پورا کریں اور باقی وقت مسلسل تاش یا شطرنج کھیلنے میں  
سرگردیں تو بھی آپ کا حج فسق نہیں ہوگا۔

اگر آپ خارجی طور پر ارکان حج ادا کرتے رہیں اور ذہنی طور پر کارہائے دیگر



کے خیالوں میں مصروف رہیں تو بھی آپ کا حج فسق نہیں ہوگا۔  
 لیکن اگر آپ حج کے داخلی پہلو کو اہمیت دیتے ہیں تو حج ایک کیفیت ہے ایک جذبہ ہے ایک سرشاری ہے اور ہر وہ چیز یا خیال یا احساس جو اس کیفیت میں مخل ہو۔ درپچہ ہے۔ کھڑکی ہے۔ بت ہے۔ ممکن ہے ہم الزاما "درتچے اور کھڑکیاں کھولتے ہوں۔ تاکہ کیفیت کی شدت دیوانگی کی شکل اختیار نہ کر لے۔ درتچے سے باہر اس لیے جھانکتے ہوں کہ دم لے کر آگے بڑھیں تاکہ سانس پھول نہ جائے۔"

یہ بھی ممکن ہے کہ ان بتوں کھڑکیوں اور درپچوں کی مدد سے شیطان ہمارا راستہ کاٹتا ہو۔ جب کیفیت کی تپش اس حد تک بڑھ جائے کہ کندن بن جانے کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ کٹھالی میں سوراخ پیدا کر دیتا ہو۔

ایک دن بر سبیل تذکرہ میں نے قدرت سے پوچھا۔ "میں نے کہا حج کیا ہے۔ کیا وہ داخلی کیفیت ہے یا خارجی رسم۔"

حج اللہ کا حکم ہے۔ "وہ بولے۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن۔۔۔"

"حکم میں لیکن نہیں ہوتے" قدرت نے کہا۔ "ہر کلب کے اصول اور قانون ہوتے ہیں۔ اگر آپ کلب کے ممبر ہیں تو یہ قانون آپ پر عائد ہو جاتا ہے۔ کیوں اور کس لیے کی گنجائش نہیں رہتی۔"

قدرت کا جواب نہیں جب چاہیں دانشور بن کر کیوں اور کس لیے کی بات چھیڑ دیتے ہیں اور جب چاہیں مومن بن کر اللہ ہو اللہ ہو کرنے لگتے ہیں۔ میں نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ یا اللہ کیا یہ ابن الوقفی نہیں کہ جب شکوک سے کام چلتا ہے تو یہ ذہن کی جیب پر سوار ہو جاتے ہیں۔ جب ایمان سے کام نکلتا ہے تو پیدل چلنے لگتے ہیں۔

کوٹھے پر میرے سوال کا جواب دینے کے لیے کوئی نہ تھا۔ خانہ خدا ویران تھا۔

نورانی بڑھا

پھر مجھے اس نورانی بڑھے کی آہ و بکا یاد آگئی۔



یہ ۱۹۵۹ء کا ذکر ہے۔ جب حکومت پاکستان نے حج پر کڑی پابندی لگادی تھی۔ ایک شام ایک سفید ریش بڑھا کراچی کے پریذیڈنٹ ہاؤس کے دروازے پر کھڑا دھاڑ دھاڑ کر رونے لگا۔ سیکورٹی پولیس کے سب لوگ دروازے پر اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے بڑھے کو ڈانٹا۔ اسے سمجھایا اس کی منتیں کیس کہ وہ پریذیڈنٹ ہاؤس کے دروازے پر شور و غوغا برپا نہ کرے۔ جوں جوں پولیس والے اسے سمجھاتے توں توں اس کی چیخوں میں شدت بڑھتی جاتی۔ پھر پتہ نہیں کس طرح وہ سفید ریش نورانی بڑھا پولیس کے ہاتھوں سے نکل کر دوڑ کر پریذیڈنٹ ہاؤس میں داخل ہو گیا اور بیرونی صحن میں جا پہنچا۔ پولیس والوں نے اسے پکڑ لیا۔ لیکن اس کی شکل و صورت میں اتنا تقدس تھا کہ پولیس کی ہمت نہ پڑی کہ گھسیٹ کر اسے باہر نکال دیں۔ سفید ریش نے پریذیڈنٹ ہاؤس کے صحن میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

شور و غل سن کر صدر ایوب باہر نکل آئے۔

انہوں نے پوچھا۔ ”بڑے میاں آپ کیوں چیخ چلا رہے ہیں؟“

بڑھا ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگا۔ ”اللہ کے واسطے مجھے حج پر بھجوادیتے۔ اللہ کے واسطے۔“ بڑھے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صدر ایوب کے لیے اسلامی جذبہ دھیمی آنچ پر عقل اور دانش کے مرکب سے کشید کیا ہوا معطر اور شفاف عرق تھا۔

اس معزز اور نورانی سفید ریش کے راب جیسے کثیف جذبہ حج کو دیکھ کر صدر ایوب حیران رہ گئے۔ انہیں بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

ایک رسم Ritual کے لیے یہ معزز و محترم بوڑھا حواس باختہ کیوں ہو رہا ہے۔ ان پر حیرت اس قدر غالب آگئی کہ انہوں نے بوڑھے کو حج پر بھجوانے کے لیے خاص انتظامات کر دیے۔

میں نے قدرت سے پوچھا۔ ”آپ کو وہ نورانی سفید ریش بڑھا یاد ہے۔ کیا وہ اس لیے چینیں مار مار کر حج کے لیے رو رہا تھا کہ اللہ کا حکم پورا کرے۔“

”ہاں یاد ہے۔“ قدرت نے جواب دیا۔

”کیا آپ کو ایڈووکیٹ صاحب کا حج یاد ہے؟“ میں نے پوچھا۔

صدر ایوب



ایڈووکیٹ صاحب کے حج کی تفصیلات انوکھی تھیں۔ ہوائیوں کے ایڈووکیٹ صاحب کی ڈیوٹی لگ گئی کہ صدر ایوب کو خط لکھتے رہیں۔ کس نے ڈیوٹی لگائی۔ کیوں لگائی اس کے متعلق مجھے علم نہیں۔

ایڈووکیٹ صاحب نے اپنے پہلے خط میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی۔

”میں آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہوں۔ چوں کہ آپ کو خط لکھنے

کی ڈیوٹی مجھ پر عاید کر دی گئی ہے۔ یقین جاتیے جس قدر میرے

خط موصول کرنا آپ کو ناگوار گزرے گا۔ اسی قدر یہ امر میرے

لیے ناگوار ہے کہ آپ کو خط لکھوں۔“

ایڈووکیٹ صاحب نے صدر ایوب کو کل سو سے کچھ زیادہ خط لکھے ہوں

گے۔

الیکشن سے پہلے انہوں نے لکھا یہ طرز عمل اختیار نہ کیجئے۔ کامیاب ہو جاؤ گے

لیکن بے عزتی ہوگی۔

۱۹۶۵ء کے سیز فائر سے انہیں خبردار کیا کہ سیز فائر نہ کیا جائے اور اگر امر

مجبوری ہو تو صرف چند گھنٹوں کے لیے۔

پھر تاشقند سے پہلے انہیں لکھا گیا کہ وہاں نہ جائیں۔ امر مجبوری ہو تو نمائندہ

بھیج دیں نہیں تو باعث تذلیل ہو گا لیکن صدر ایوب نے اس کے برعکس کیا۔

ہائی لیول کانفرنس

پتہ نہیں کیوں ۱۹۶۶ء میں ایڈووکیٹ صاحب اسی ڈیوٹی کے سلسلے میں حج پر

تشریف لے گئے۔ وہاں سے انہوں نے صدر صاحب کو خط لکھا کہ یہاں مکہ معظمہ

میں اللہ کے خاص بندوں کی ایک ہائی لیول کانفرنس ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

پاکستان کی صدارت عام صدارت نہیں بلکہ عظیم ہے۔ صدر ایوب کو صلاحیتیں دی گئی

تھیں۔ انہیں بہت موقعے دیے گئے لیکن وہ ذات سے ابھر کر جہاد کرنے کی اہلیت پیدا

نہ کر سکے۔ لہذا انہیں الگ کر دیا جائے۔

جب ایڈووکیٹ صاحب اس کانفرنس سے باہر نکلے تو کسی نے پکارا۔ ”ایوب

خاں۔“ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک نحیم و سحیم مجذوب تھا۔ اس کے گلے میں



سینکڑوں تعویذ لنگ رہے تھے۔

ایڈووکیٹ صاحب نے کہا۔ ”جناب میرا نام ایوب نہیں ہے۔“  
وہ بولا ”اسے کہہ دے بزدل نہ بنے جہاد کرے۔ اور یہ لے لے یہ اسے دے دینا  
کہنا یہ پن لے۔“ مست نے گلے سے ایک تعویذ توڑ کر ایڈووکیٹ صاحب کو تھما دیا۔  
اور بولا ”بزدلی چھوڑ کر جہاد کرے گا تو ایک موقع اور ملے گا۔ اگر یہ آخری موقع بھی  
کھو دیا تو بڑی دھول اڑے گی۔ بڑی تزیل ہوگی۔ بڑی جگ ہنسائی ہوگی۔ جا اسے کہہ  
دے۔“

ایڈووکیٹ صاحب نے یہ سب تفصیلات صدر ایوب کو لکھ دیں۔ صدر ایوب  
نے ناراض ہو کر ایڈووکیٹ صاحب کے پیچھے پولیس لگا دی۔ ایڈووکیٹ صاحب کا تو کچھ  
نہ بگڑا لیکن ایوب خاں کی صدارت کا تیر ضرور کمان سے نکل گیا۔  
میں نے قدرت سے کہا۔ ”آپ کو ایڈووکیٹ صاحب کے حج کی تفصیلات یاد  
ہیں؟“

”ہاں یاد ہیں۔“ وہ بولے۔

”کیا وہ حج کے لیے گئے تھے؟ کیا حج میں ہائی لیول کانفرنس ہوتی ہیں۔ بتائیے  
حج کیا ہے؟“ میں نے چلا کر قدرت نے پوچھا۔

اتفاق سے میر صاحب ادھر آہنچے اور انہوں نے میرا یہ جملہ سن لیا۔

”لو اور سنو اور وہ چلاتے پوچھ رہے ہیں حج کیا ہے۔ کس وقت پوچھ رہے  
ہیں۔ کس مقام پر پوچھ رہے ہیں۔ جب ڈرائیور سر پر کھڑا ہے۔“

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ہمارا ڈرائیور پیچھے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ”روانگی کا وقت ہو  
گیا۔ گاڑی لے آیا ہوں۔“  
اور ہم حج کے لیے روانہ ہو گئے۔



## منی

ہزاروں بسیں اور موٹریں گھاؤں گھاؤں کر رہی تھیں۔ پئے ساکت تھے۔ انجن غرار ہے تھے۔ چیخ چلا رہے تھے۔ فضا پٹرول کی بو سے بو جھل ہو رہی تھی۔

زائرین کے دل دھڑک رہے تھے۔

جسم اور روح میں ایک دھنکی بیج رہی تھی۔ ہونٹوں پر لبیک لبیک کے نعرے تھے۔ سینوں میں جوار بھانا اٹھ رہا تھا۔ دلوں پر ایک بے نام احساس چھاپا ہوا تھا کہ ابھی ابھی یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ کوئی عظیم واقعہ پر اسرار واقعہ جس کی تمنا میں انہوں نے سالہا سال بسر کیے تھے، جس کے لیے وہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے آئے تھے۔

اس وقت ہم چھ آٹھ لاکھ زائرین حج کے لیے منی جا رہے تھے۔

منی مکہ معظمہ کا ایک مضاف ہے جو مکہ معظمہ سے صرف تین میل دور ہے۔ حج میں منی کی اہمیت کی وجہ سے سعودی حکومت نے مکہ معظمہ سے منی تک چار ایک پختہ اور فراخ سڑکیں بنا دی ہیں۔ تاکہ حج کے دوران زائرین کی ٹریفک میں سہولت ہو جائے۔ یہ جدید سڑکیں گھوم پھر کر منی پہنچتی ہیں اور ایک دوسری کے متوازی چلتی ہیں۔ ان کے ذریعے منی پہنچنے کے لیے چھ میل کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔

انوکھا سفر

منی کا سفر میرے لیے ایک انوکھا سفر تھا۔ چھ آٹھ لاکھ آدمی ہیں پہنچیں



ہزار ہوں میں سوار تھے۔ پچیس ہزار موٹرا انجن غصے میں منہ سے جھاگ نکال رہے تھے۔ احتجاج کر رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ چلو چلو آگے بڑھو۔ لیکن پچیس ہزار بیس رکی کھڑی تھیں۔ چلتی بھی تو چند ایک قدم چوٹی کی رفتار سے آگے کو رہتی تھیں اور پھر رک جاتیں۔

کتی عجیب کتی معسکہ خیز بات تھی کہ تین میل کا سفر طے کرنے کے لیے زائرین موٹروں پر سوار تھے اور یہ موٹریں چوٹی کی حال چل رہی تھی۔ تین میل کی مسافت چار چھ گھنٹوں میں طے ہو رہی تھی۔ پھر رکے رہنے کی پریشانی الگ انجنوں کا شور و غوغا الگ اور پڑول کے بھجا کے الگ۔

کتی معسکہ خیز بات تھی۔

بسوں میں بیٹھے ہوئے زائرین کا جذبہ شوق بڑھتا جا رہا تھا کہ جلد منزل کو جا لیں۔ راستے کی رکاوٹیں انہیں معسکہ کر رہی تھیں۔ موٹروں کی ریٹگی ہوئی رفتار ایک عجیب سی بے اطمینانی تذبذب اور چڑچڑاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ اس ذہنی کتر کتر کو جھٹلانے کے لیے وہ لبیک لبیک کے نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی حاضر نہ تھا۔ ان کے ذہن پہلے گیتروں میں پھنسی ہوئی موٹروں کی طرح گھاؤں گھاؤں کر رہے تھے۔

صدیاں بیت گئیں لیکن منی کی وہ سڑک ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

انجن چلا رہا تھا۔ زائرین چیخ رہے تھے۔ موٹروں سے پڑول کی بو کے بھجا کے اٹھ رہے تھے۔ زائرین سے نا آسودگی کی بھڑاس خارج ہو رہی تھی۔

### الف لیلوی شہر

الف لیلوی میں کئی ایک شہروں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جہاں صاف ستھری سڑکیں ہوتی ہیں۔ جن سے ادھر ادھر کو گلیاں نکلتی ہیں۔ پختہ مکانات ہوتے ہیں۔ جو رہائش کے جملہ ساز و سامان سے آراستہ ہوتے ہیں۔ لیکن سارے شہر میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔

منی بھی ایک ایسا ہی الف لیلوی شہر ہے۔ وہاں سڑکیں ہیں۔ گلیاں ہیں۔ پختہ مکانات ہیں۔ جہاں رہائشی سامان لگا ہے لیکن وہاں کوئی رہتا نہیں۔ سارا سال مکانات ویران پڑے رہتے ہیں۔ پھر آٹھ نو ذوالحجہ کو مقامی لوگ اور زائرین یورش کرتے ہیں



--- چند گھنٹوں میں مکانات کینوں سے بھر جاتے ہیں۔ کمرے جھاڑ پونچھ کر صاف کیے جاتے ہیں۔ گاؤں کیے لگ جاتے ہیں۔ مطبخوں میں دیکھیں چڑھادی جاتی ہیں۔ لنگر چلتے ہیں۔ خالی دکانیں سامان سے لد جاتی ہیں اور بازار میں کھوے سے کھوا چھلنے لگتا ہے۔ یہ تو شہر کے اس حصے کا ذکر ہے۔ جہاں پختہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔

شہر سے باہر لقمہ و دوق میدان میں پختہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے، جن پر نمبروں کی تختیاں لگی ہوئی ہیں۔ درمیان میں ٹیموں کے لیے پلاٹ بنے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ ٹل لگے ہوئے ہیں۔ بیت الخلاء کے لیے گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ ۸ یا ۹ ذوالحجہ کو زائرین کے پہنچنے سے پہلے ہزاروں ٹرک خیمے اور دیگر سامان اٹھائے منی میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس لقمہ و دوق ویرانے میں ہزار ہا خیمے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کھانے پکے لگتے ہیں اور سڑکوں پر قسم قسم کے شال لگ جاتے ہیں۔ چوکوں میں اس احرام میں ملبوس سپاہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور زائرین کے آرام و آسائش کے لیے جگہ جگہ سعودی حکومت کی مختلف وزارتوں کے دفتر قائم ہو جاتے ہیں۔

منیٰ ایک جادوگری ہے جو سارا سال ویرانیوں میں دم توڑتی رہتی ہے اور پھر "دفعتاً" چند ایک روز کے لیے یوں آباد ہو جاتی ہے۔ جیسے کبھی غیر آباد نہ تھی اور چار ایک دنوں بعد پھر وہی لقمہ و دوق ویرانی جیسے کبھی آباد نہ ہو سکتی ہو۔

خیمہ ہوٹل

منیٰ میں ہماری موٹر ایک صاف ستھرے خوبصورت خیمے کے سامنے رک گئی۔ جس پر جلی حروف میں لکھی ہوئی تختی لگی ہوئی تھی "تندق الکلی"۔ اندر ایک فراخ صحن تھا۔ جس کے ارد گرد رہائشی خیمے لگے ہوئے تھے۔ وسط میں ایک وسیع شامیانے میں کھانے کے میز لگے ہوئے تھے۔ لمبے وسیع و عریض خیمے میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ جن پر کرسیاں اور صوفے لگے ہوئے تھے۔ لمبے چغوں میں ملبوس چند موٹی موٹی میسین ان صوفوں پر بیٹھی کوک پی رہی تھیں۔ چار ایک احرام پوش سکہ بند صاحب کافی کے پالے سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کے ارد گرد دروہوں میں ملبوس ہیرے کھڑے تھے۔

ہوٹل میں داخل ہو کر قدرت نے کہا اب تمہارا سا آرام کر لین اور وہ اپنے



خیمہ میں داخل ہو گئے ساتھ والا خیمہ میرا تھا۔ خیمے میں بیڈ لگا تھا۔ ٹالیچہ بچھا تھا۔ چار ایک کرسیاں اور میزیں رکھی ہوئی تھیں۔

## بے نام آزر دگی

پتہ نہیں اس روز میں اس قدر مضطرب کیوں تھا۔ پتہ نہیں کیوں ایک بے نام سی آزر دگی چھائی ہوئی تھی۔ دل میں ایک غلٹ سی لگی تھی۔ اندر کی آگ سلگ رہی تھی۔ ایک دھنکی چل رہی تھی۔ میں اس قدر پریشان تھا جیسا کوئی بچہ میلے میں اپنے ماں باپ سے چھڑ گیا ہو۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ کالا کوٹھا جو میرا مرکز بن چکا تھا، میری نگاہ سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ کھوٹی نہ رہی تھی جس پر میں نے اپنے آپ کو ٹانگ رکھا تھا۔ اس لیے منی میں یوں بے جان پڑا تھا جیسے کھوٹی سے گرا ہوا کپڑا سمین پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ دو گھنٹے میں اسی طرح ڈھیر پڑا رہا۔ پھر سارے کی تلاش میں میں قدرت کے خیمے میں جا داخل ہوا۔ اس وقت ڈاکٹر محنت سے باتیں کر رہے تھے۔ میں رک گیا۔ قدرت نے اپنی بات جاری رکھی۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر بھی نہ دیکھا اور یوں باتیں کرنے میں معروف رہے جیسے کمرے میں کوئی داخل نہ ہوا ہو۔ جیسے وہ اکیلے تھے۔ ان کی نگاہ میں ایک عجیب بے تعلق سی تھی جسے محسوس کر کے مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

## عظیم بے گانگی

اگر آپ کو کسی بزرگ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے تو شاید آپ کسی بزرگ سے ملیں۔ وہ آپ کو دیکھ کر اٹھ بیٹھیں گے۔ محبت سے مصافحہ کریں گے۔ بڑی ہمدردی اور شفقت سے حال احوال پوچھیں گے۔ پوری توجہ سے آپ کی بات سنیں گے اور بھرپور خلوص سے آپ کو مشورہ دیں گے۔۔۔۔۔ ٹھہریئے۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اسی وقت اسی بزرگ کو فرشی سلام کیجئے اور وہاں سے چلے آئیے۔ اگر وہاں سے چلے آنے میں آپ نے توقف کیا تو آپ کو Divine unconcern سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور وہ عظیم بے نیازی، عظیم بیگانگی، عظیم بے تعلق نگلی ہو کر آپ کے سامنے آجائے گی۔



اگر آپ نے توقف کیا تو آپ دیکھیں گے کہ اس بزرگ کی توجہ آپ کی طرف سے یوں Switch Off ہو جائے گی کہ انہیں آپ کے وجود تک کا احساس نہیں رہے گا۔ وہ آپ کی طرف یوں دیکھیں گے کہ ان کی نگاہیں رکیں گی نہیں بلکہ آپ کے پار ہو جائیں گی۔ آپ حرف غلط کی طرح مٹ کے رہ جائیں گے۔ نقش بر آب کی طرح ناپید ہو جائیں گے۔ Divine unconcern بزرگوں کا ایک وصف ہے۔ ایک ہتھیار ٹھنڈی اور کند چھری۔

### پتھر اور چور چور

قدرت کے خیمے میں میں دیر تک کھڑا رہا۔ انہوں نے دو ایک مرتبہ میری طرف دیکھا بھی، لیکن ان کی نگاہیں میرے پار ہو گئیں۔ پھر ڈاکٹر عفت بولیں ”مفتی صاحب آئے ہیں۔“ قدرت نے یوں ”اچھا؟“ کہا جیسے ایک مترجمے پھونک کر دوسرے کے وجود کو رد کر دیا جاتا ہے۔

وہ ”اچھا“ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کچے شیشے پر پتھر دے مارا ہو۔ میرا وجود چور چور ہو گیا۔ میرے ریزے ہوا میں یوں اڑے جیسے دھنکے کے ارد گرد روئی کے ذرات کی بارش ہوتی ہے۔ وہ ریزے میری روح میں کانٹوں کی طرح پوست ہو گئے۔ غصے سے میرا خون کھولنے لگا۔ میری آنکھوں میں قدرت کا خیمہ سرخ ہو گیا اور میں بھاگا۔

دور بہت دور ڈاکٹر عفت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ”مفتی صاحب مفتی صاحب۔“

لیکن ٹھہریے۔ اس پتھر اور چور چور کی اہمیت آپ پر واضح نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کا پس منظر بیان نہ کیا جائے اور جب تک آپ پر اس تفصیل کی اہمیت واضح نہ ہو۔ آپ منیٰ کو نہیں سمجھ سکتے۔

### پراسرار شخصیت

قدرت اللہ شہاب بزرگ ہیں یا نہیں، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن ایک بات یقین ہے کہ وہ ایک پراسرار شخصیت ہیں۔ صرف نفیست کے لحاظ سے نہیں۔ انفرادی نفیست گمن گھیریاں تو تقریباً ہر شخصیت میں موجود ہوتی ہیں جو اسے اسرار کی جمال



دے دیتی ہیں۔ قدرت کی پر اسراریت کسی اور قسم کی ہے۔ داخلی تاثرات کی بات نہیں۔ اس پر اسراریت کے مجھے کئی ایک خارجی ثبوت بھی ملتے رہے تھے۔

مثلاً "اشفاق احمد نے ۱۹۵۸ء میں مجھے قدرت سے متعارف کیا۔ پھر ان ابتدائی دنوں میں جب قدرت اور میں ملنے لگے تھے تو ایک پائے کے بزرگ نے جمعہ سے خط لکھا جس میں تحریر تھا کہ "ان دنوں جن صاحب سے آپ ملنے لگے ہیں انہیں ہمارا سلام کہئے۔" حالانکہ قدرت اور میری ملاقاتوں کی بات ابھی نکلی نہ تھی۔

کراچی کی ایک نہایت پاکیزہ اور عابدہ خاتون جو احکاف کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں خواب میں قدرت کا مکان دکھایا گیا اور اشارہ ہوا کہ فلاں مکان میں احکاف کیا جائے۔ اس نے عرض کیا کہ مجھے اس مکان کا اتنا پتا بتایا جائے۔ پھر حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ اس خاتون کو قدرت کے گھر جانا پڑا۔ وہاں جاہلے ہی وہ گھر کو پہچان گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے مجھ سے بات کی۔ کہنے لگیں۔ "بھائی یہ کس کا گھر ہے۔ مجھے یہاں احکاف کرنے کا حکم ہوا ہے۔"

ایسے بیسیوں خارجی واقعات ہیں جو قدرت کی پر اسراریت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن قدرت سے میرے تعلقات اس پر اسراریت کی وجہ سے استوار نہیں ہوئے۔ الثانی کی یہ خصوصیت تو ہمارے درمیان ایک رکاوٹ ہے۔ اس تعلق کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ قدرت کے کردار میں عظیم عجز تھا۔ عجز انسان کا منفرد اور مخصوص وصف ہے جو مجھ پر شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ قدرت کے اسلام میں بے پناہ وسعت تھی۔ وہ اپنی نیکی کو بانس پر نہیں چڑھاتے تھے بلکہ یوں جیسے معذرت خواہ ہوں۔ وہ ہچکچاہٹ پر ہاتھ روم میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ قدرت سے ملنے کے بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ اسلام کیا چیز ہے۔ اللہ کا کیا مفہوم ہے اور محمدؐ کس قدر عظیم انسان تھے۔

ان خارجی تفصیلات کی وجہ سے مجھے شک پڑنے لگا تھا کہ قدرت کو اللہ اور اسلام سے ایک پر اسرار تعلق ہے اور اسی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں حج پر اکیلا نہیں جاؤں گا۔ میں سوچتا تھا مجھے وہاں کون جانتا ہے۔ میں وہاں کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ جیسی تو میں نے اتنی دیر انتظار کیا تھا اور پھر قدرت کے ہمراہ حج پر گیا تھا۔ میرے لیے قدرت کی حیثیت ایک لاشی کی تھی اور میری اپنی حیثیت ایک اندھے پانچ



کی۔

## لاٹھی اور اندھا

اس روز منی کے اس خیمے میں لاٹھی نے اندھے اپاہج کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خود لاٹھی نے اندھے کو ٹھوکر لگائی تھی۔ پھر مارا تھا۔ جب میں خیمے سے باہر نکلا تو فضا خون آلود تھی۔ ایک تند و تیز جھکڑ چل رہا تھا۔ میں ایک شدت پسند خلیل آدمی ہوں۔ غصے سے اپنے آپ کو محفوظ میں نے مجھ پال رکھا ہے۔ یہ مجھ جھوٹا ہے۔ اس روز منی میں مجھ اور احترام کی وہ طبع اتر گئی اور نیچے سے میں نکل آیا۔ میں اندھے اپاہج نے آنکھیں کھول دیں۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ مجھے کسی لاٹھی کی ضرورت نہیں۔ میں کیا پروا کرتا ہوں کسی کی۔ قدرت رہبر ہے تو پڑا ہو۔ میں کسی رہبر کا محتاج نہیں ہوں۔ شاید اسے یہ زعم ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے یہ سب سہولتیں میسر ہیں۔ یہ آرام یہ انگریزی ہوٹل۔ یہ ٹاپے یہ کرسیاں یہ بیڈ۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ یہ میری طبیعت کے منافی ہیں۔ to them Do not belong میں نالے کے کنارے دری بچھا کر پڑا رہوں گا۔ میں عرفات پیدل چل کر جاؤں گا۔ مجھے اس مرٹڈیز کی ضرورت نہیں جسے سعودی حکومت نے اپنے سمان کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

غصے میں میں ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میری صرف ایک خواہش تھی کہ میں چلا جاؤں۔ دور اس ہوٹل سے دور اس لاٹھی سے دور اس اندھے پن سے دور جسے میں نے کئی ایک سالوں سے زبردستی اپنا رکھا تھا۔

اس وقت میرے ذہن میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

میں میں

کتنا احمق ہوں۔ میں کہ دانش ور ہوتے ہوئے میں نے ایمان کی تلاش میں اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ کتنا احمق ہوں میں کہ ان مافوق الفطرت واقعات کو اہمیت دیتا ہوں۔ دانش ور کا کام تو شک کرنا ہے۔ ایمان لانا نہیں۔ پال کی کھال اتارنا ہے، تسلیم و رضا کے جذبے سے اپنے کو فریب دے کر مطمئن کرنا نہیں۔



غصے کی وجہ سے میرا منہ لال ہو رہا تھا۔ دل کھول رہا تھا۔ چلتے ہوئے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔

مور کے وہ پر جو گذشتہ آٹھ سالوں میں قدرت سے مستعار لے کر میں نے بڑی محنت سے اپنی دم میں سجائے تھے ایک ایک کر کے نوچ کر نکال پھینکے۔

کیا یہ ضروری ہے کہ میں حج ادا کر کے واپس لوٹوں۔ یہ Ritual جسے حج کہا جاتا ہے۔ محض ایک پریڈ ہے میں اس پریڈ کو فرض کے طور پر ادا نہیں کر رہا۔ میں نے کبھی کوئی فرض بھی تو پورا نہیں کیا۔ پھر حج کا فرض پورا کرنے کا مطلب۔ میں کیا مسلمان ہوں جو فرض پورے کروں۔ میں تو مردم شمارن کا مسلمان ہوں۔ اور.... اور مسلمان کون ہیں؟ کہاں ہیں؟ کچھ لوگوں نے اسلام کو بت بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی اہمیت قائم کرنے کے لیے اسے اجارہ بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگ اسے کاروباری طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن میں ---- میرا تو اسلام پر ایک بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے اسے گدلا نہیں کیا۔ میں نے ذاتی اہمیت کے لیے استعمال نہیں کیا۔ میں نے اس کا اس قدر احترام کیا ہے کہ اس کے حدود میں کبھی پاؤں نہیں رکھتا کہ وہ میلانہ ہو جائے۔

## خیمے

مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس وقت میں زائرین کے خیموں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میرے سامنے خیمے ہی خیمے تھے۔ ہر خیمے کے دو حصے تھے۔ ایک وسیع و عریض حصہ جس میں زائرین نے زمین پر بستر بچھا رکھے تھے اور وہ ان پر بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ شامیانے کا سامنے کا پردہ اٹھا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ باہر سڑک سے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑے حصے سے ملحقہ ایک چھوٹا سا خیمہ تھا۔ جس کے گرد قاتیں لگی ہوئی تھیں اور اندر چولہے بنے ہوئے تھے۔ چولہوں پر بڑے بڑے دیکھے رکھے ہوئے تھے۔ نیچے آگ جل رہی تھی۔

چولہوں کے پیچھے باورچی کھڑا کھانا پکانے یا بانٹنے میں مصروف تھا۔ تقریباً ہر خیمے کا منظر ایک سا تھا۔ کہیں متمول زائرین کا خیمہ آجاتا جہاں پلاسٹک کے برتنوں کا انبار لگا ہوتا۔ دیکچوں کی جگہ دیکیں پک رہی ہوتیں اور عام سالن کی جگہ مرغیوں سے



رقابیں بھری ہوتیں۔

اس وقت میری نظر میں یہ تمام تفصیلات دھندلائی ہوئی تھیں۔ میرے سینے میں غصے کی دیگ چڑھے ہوئی تھی۔ اس سے نکلتی ہوئی بھاپ نے میری نگاہوں پر غلاف چڑھا رکھا تھا۔ ارے۔۔۔۔۔ میں رک گیا۔۔۔۔۔

لڑائی جھگڑے

ایک خیمے کے زائرین اپنے معلم سے جھگڑ رہے تھے۔ پتہ نہیں زیر بحث معاملہ کیا تھا۔ آیا کھانے پر جھگڑا تھا یا داموں پر۔ زائرین غصے میں بول رہے تھے۔ ان کے منہ سرخ تھے۔ آسنینیس چڑھی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر تیوریاں تھیں۔ زبانیں چل رہی تھیں، منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ معلم یوں پتھر بنا کھڑا تھا جیسے بت ہو۔ اس کے چہرے پر خشونت تھی۔ بے حسی تھی۔ تضحیک تھی۔ اس جھگڑے کو دیکھ کر میں رک گیا۔ سعودی عرب کی سر زمین پر قدم رکھے مجھے پانچ ایک دن ہو چکے تھے۔ جدہ یا مکہ معظمہ کہیں بھی میں نے لڑائی بھڑائی کا منظر نہیں دیکھا تھا۔

اس منظر کو دیکھ کر حیرت ضرورت ہوئی لیکن اس میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا۔ غالباً اس لیے کہ میری داخلی کیفیت اس سے ہم آہنگ تھی۔ کافی دیر میں وہاں کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر آگے چل پڑا۔

چند ایک قدم کے بعد کچھ لوگ ایک خیمے کے سامنے ”کیو“ میں کھڑے ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک زائر نے دوسرے کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس نے کھینچنے والے کو دھکا دیا اور وہ زمین پر گر گیا۔ اس پر چار ایک زائر دھکا دینے والے پر پل پڑے۔ کیو کی ساری قطار گڈمڈ ہو گئی۔ جیسے سانپ نے کنڈلی مار لی ہو۔ وہ چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کئے دکھا رہے تھے۔

دفتنا ”میری نگاہ اس خیمے پر جا پڑی جس کے سامنے ہنگامہ ہو رہا تھا۔

وہ ایک چھوٹا سا خیمہ تھا۔ جس پر بیت الخلا کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ہوں۔ تو یہ سارا جھگڑا رفع حاجت کے بارے میں ہے۔

آگے بازار میں دکانوں پر لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ وہ مختلف قسم کی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ دکاندار بڑے خشکیوں لہجے میں خریداروں کو ڈانٹ رہا



تھا۔ غالباً وہ پسند نہیں کر رہا تھا کہ لوگ چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھیں۔ زائرین دکاندار کو چرانے کے لیے جان بوجھ کر چیزیں اٹھاتے ارزاہ مذاق دکاندار کو دکھا کر اس کے دام پوچھتے۔ اس پر دکاندار چیخا چلاتا اور ان سے کہتا 'جاؤ جاؤ اپنا راستہ لو۔ یہاں بھیڑ مت کرو۔'

پھر کسی شخص نے دکان سے ایک چیز اٹھا کر دکاندار کے منہ پر دے ماری۔ اس نے چوک میں کھڑے سپاہی کو آواز دی اور ساتھ ہی چھلانگ مار کر اس شخص پر جھپٹ پڑا۔ گھبرا کر میں آگے چل دیا۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ شرمینا نہ ہو۔ جیسے ہم جج پر نہیں جا رہے تھے بلکہ میں وہاں کسی بین الاقوامی میلے پر آیا ہوا تھا۔ جہاں پاکستانی میلوں کی طرح جگہ جگہ لوگوں میں لڑائیاں جھگڑے اور فسادات ہو رہے تھے۔

ان جھگڑوں اور ہاتھ پائیوں کو دیکھ دیکھ کر میرے دل کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ قریب ہی ایک چائے کا شال دیکھ کر میں وہاں رک گیا۔ ایک پیالہ چائے میں نے اشارے سے شال والے سے کہا اور پھر کرسی اٹھا کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ وہاں پہلے سے ہی ایک بڑے میاں بیٹھے ہوئے تھے۔

بڑے میاں

"السلام علیکم" انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ اور اس کے بعد ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

ابھی میں نے چائے کے دو گھونٹ ہی پئے تھے کہ ایک جھٹی بازار میں چیخنے چلانے لگا۔ شور سن کر لوگ ادھر بھاگے۔

میں حیرت سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا" بڑے میاں نے مجھ سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "غالباً" جھگڑا ہو رہا ہے۔"

"اوہ" وہ اطمینان کا سانس لے کر بولے۔ "میں سمجھا کوئی حادثہ ہوا ہے۔"

"جھگڑا بھی تو حادثہ ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اونہوں۔" وہ بولے۔ "جھگڑے تو یہاں ہوں گے، ہوتے ہی رہتے ہیں"



جگہ جگہ ہوتے ہیں، بات بات پر ہوتے ہیں، ہاتھ پائیاں ہوتی ہیں، لڑائیاں ہوتی ہیں، وہ تو یہاں کا معمول ہے۔“

”جی؟“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”بھائی میرے“ وہ بولے ”یہ منی ہے منی۔“

”منی؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”آپ منی کو نہیں جانتے کیا؟“

”جی نہیں۔“ میں نے کہا ”آپ پاکستان سے آئے ہیں کیا؟“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”کبھی آیا تھا اب تو میں مکہ معظمہ میں رہتا ہوں۔ دس

سال سے یہیں مقیم ہوں۔“

”آپ منی کے متعلق کچھ فرما رہے تھے؟“ میں نے پوچھا

”یہ منی ہے میرے بھائی۔“ وہ بولے۔ ”یہاں کوئی شخص قیام نہیں کر سکا۔

یہاں بہت سے پختہ مکانات موجود ہیں۔ جن میں آرام و آسائش کا سامان لگا ہے۔ لیکن

کس میں اتنی ہمت ہے کہ یہاں قیام کر سکے۔“

میں نے حیرت سے بڑے میاں کی طرف دیکھا۔

”سارا سال یہ شہر خالی پڑا رہتا ہے“ وہ بولے۔ ”سال میں صرف چار چھ دن

کے لیے آباد ہوتا ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

وسوسوں کا شہر

”اس لیے کہ یہ منی ہے، منی ہے، منی وہ جگہ ہے جہاں ابلیس نے حضرت

ابراہیمؑ کو تین مرتبہ بھگانے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ حضرت اسطیلؑ کی انگلی تھامے

اس راستے پر جا رہے تھے تاکہ بیٹے کو اللہ کی رضا پر قربان کر دیں، اس وقت ابلیس نے

ان کے دل میں وسوسے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہنے لگا، ”چھوڑیے صاحب بیٹے

کی قربانی دینا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اللہ کو قربانی کی کیا ضرورت ہے بھائی۔“

”تین مقامات پر ابلیس نے حضرت ابراہیمؑ کے یقین محکم کو توڑنے کی

کوششیں کیں۔“



”جب ان کا ایمان متزلزل نہ ہو تو ابلیس نے ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو درغلایا۔ تمہارا عقل و دانش ایسا کام کر سکتا ہے۔ کیا تمہارے والد کا ذہنی توازن خراب ہو چکا ہے۔ بھاگ جاؤں۔ ہاتھ چھڑا کر اس دیوانے سے دور بھاگ جاؤ۔ بھاگ کر اپنی جان بچا لو ورنہ۔۔۔۔۔“

”یہ جو تین جمرے منیٰ میں بنے ہوئے ہیں۔ جمرۃ العقبیٰ جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ الاولیٰ جہاں پتھر گڑے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو ابلیس نے بھگانے کی کوشش کی تھی۔“

”لوگ کہتے ہیں ان مقامات کی نشاندہی کے لیے یہ پتھر گاڑے گئے ہیں۔ اونہوں۔ یہ نشانات نہیں یہ تو شیطان کو پتھر بنا دیا گیا ہے اور پتھر بن کر بھی اس کے اثرات جوں کے توں قائم ہیں۔ انہوں نے اپنے اثرات سے اس شہر کو منیٰ بنا دیا ہے۔ وسوسوں کا شہر۔ شہر کا شہر۔ الحاد کا شہر۔ تذبذب کا شہر۔ انتشار کا شہر۔ یہاں بڑے بڑے ڈول جاتے ہیں۔ بڑوں بڑوں کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے۔ اندھوں کے ہاتھوں سے لائٹیاں چھوٹ جاتی ہیں۔“

میں نے چونک کر بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ یوں مسکرا رہے تھے۔ جیسے اندھے اور لاشی کے قصے سے کما حقہ واقف ہوں۔ میرے ذہن میں ایک جھکڑ چلنے لگا۔

تو کیا۔ تو کیا۔ وہ پتھر جس نے مجھے چور چور کر دیا تھا۔ پتھر نہیں تھا بلکہ خود جمرۃ الاولیٰ تھا۔ کیا اندھے سے لاشی کسی مقصد کے لیے چھین لی گئی تھی۔ کیا وہ منیٰ ہی تھا۔ جس نے مجھ سے میرا اندھا پن چھین لیا تھا اور مجھے رہبر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں نے حیرت سے بڑے میاں کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا دیے بولے۔ ”جاؤ میرے بھائی جاؤ۔ اپنے خیمے میں جاؤ۔ ورنہ اندھیرا ہو گیا تو پھر شاید راستہ نہ ملے۔ یہ منیٰ ہے۔ یہاں جو راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ وہ پھر کبھی پہنچ نہیں پاتا۔“

میں نے غور سے بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی تھی۔ ان کے خدو خال میں محبت بھری سلوٹیں رنگ رہی تھیں۔ ان کے انداز میں محبت اور خدمت کا جذبہ کار فرما



تھا۔

اٹھو۔ اٹھو میرے دل سے آواز گونجی اٹھو اور بڑے میاں سے رخصت ہو جاؤ ورنہ اگر The divine unconcern جاگ اٹھی تو-----  
میں نے اٹھ کر بڑے میاں کو مودبانہ سلام کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

رستہ بھول

جب میں اپنے ہوٹل کے قریب پہنچا تو دروازے پر قدرت اور ڈاکٹر عفت کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھ کر شور مچا دیا۔ ”مفتی صاحب۔ مفتی صاحب۔ ادھر اس طرف۔“

قدرت نے کہا۔ ”ہم بڑے فکر مند تھے۔ ہمارا خیال تھا۔ آپ راستہ بھول گئے ہیں۔“

”ہاں میں راستہ بھول گیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”چلو اچھا ہوا آپ لوٹ آئے۔“ انہوں نے کہا۔

”یہ منی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ قدرت نے پوچھا۔

”یہاں بہت سے لوگ راستہ بھول جاتے ہیں۔“

”بہت سے لوگوں کا راستہ کاٹا جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ قدرت بولے۔

”بہت سے اندھوں کے ہاتھوں سے لائٹیاں چھین لی جاتی ہیں۔“ میں نے

کہا۔

”متمل مزاجی کو منتشر کر دیا جاتا ہے۔“

”یہ شہر نہیں، یہ ایک جائے امتحان ہے اور مجھ ایسے نحیف و ناتواں میں اتنی

ہمت نہیں کہ امتحان میں پڑوں۔ میں یہاں رکنا نہیں چاہتا۔“

”نہیں نہیں ایسا نہ کہئے۔ جن کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔

جن کی راہ کاٹی جاتی ہے۔ وہ بڑے خوش قسمت لوگ ہیں۔“ قدرت بولے۔

”خوش قسمت؟“ میں نے حیرانی سے دہرایا۔



”صرف ان کے راستے کاٹے جاتے ہیں۔ جن کے بچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ کہ آپ کے چلنے میں بچنے کی صلاحیت ہے۔ اس سے زیادہ خوشی کا احساس کیا ہو سکتا ہے۔ قدرت مسکرا کر بولے۔“

”امتحان میں پاس یا لیل ہونا اہم نہیں۔ اہم یہ ہے کہ کیا آپ کی حرکت میں وہ نیک نیتی، وہ خلوص، وہ جذبہ ہے جو پہنچانے کا ضامن بن جاتا ہے۔“

”آپ کو علم ہے مفتی صاحب۔“ قدرت نے کہا ”کہ حضور اعلیٰ کو منی کے راستے مکہ معظمہ میں داخل ہونا کتنا پسند تھا۔“



## میدانِ عرفات

تذکرہ غویہ میں نقل ہے کہ

ایک روز ارشاد ہوا کہ فرعون کی ایک چیز گم ہو گئی جو اسے پسند تھی۔ اس نے اپنے تمام غلاموں کو حکم دیا کہ ”تم میں سے جو بھی ڈھونڈ لائے گا، انعام و خلعت پائے گا۔“

طلب اور ریاضت

جس غلام نے وہ چیز پائی نہایت شاد و خنداں تھا۔ باقی مایوسی کے عالم میں سر جھکائے کھڑے تھے۔

فرعون نے ناکام غلاموں سے کہا: ”تم سب ملول کیوں ہو۔ طلب اور تلاش میں تو تم سب برابر ہو۔ صرف یافت سے محروم ہو اور یافت ایک اتفاقیہ امر ہے۔ اس لیے کہ چیز صرف ایک تھی اور کسی ایک کو ہی ملنی تھی۔ اس پر وہ غلام جس نے وہ چیز پائی تھی بولا۔ ”حضور اس لحاظ سے مجھ میں اور ان سب میں کیا فرق رہ گیا؟“

فرعون نے وہ چیز اٹھا کر یوں زمین پر دے ماری کہ وہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پھر وہ بولا۔

”تم میں اور ان سب میں صرف اس چیز کا فرق تھا سو مٹ گیا۔ اس چیز کے ہونے نہ ہونے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو صرف تمہاری طلب کے قدر دان ہیں۔“

اس روز سات لاکھ غلام میدان عرفات میں طلب سے سرشار تھے۔ ان کے دلوں میں صرف ایک لگن تھی۔ ایک جذبہ تھا۔ ایک ولولہ تھا۔ تکمیل حج۔



انہیں صرف ایک فکر تھی۔ قبولیت کی فکر۔  
 انہیں طلب کی عظمت کا احساس نہ تھا۔ حکم بجالانے کے مقام کا شعور نہ تھا۔  
 فضا نعروں سے بھری ہوئی تھی۔ اے اللہ میں حاضر ہوں۔ سبھی حاضر تھے۔  
 سر تا پا حاضر تھے مگر کسی کو احساس نہ تھا کہ حاضری جمعی ممکن ہے جب حضوری حاصل ہو  
 کہ حاضری اور حضوری دو مختلف چیزیں نہیں کہ طلب انتہا پر پہنچ کر بذات خود مطلوب  
 بن جاتی ہے۔

کسی کو شعور نہ تھا کہ جس کی خدمت میں وہ حاضر ہونے کے لیے جا رہے  
 تھے۔ وہ خود ان کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ تلاش بے معنی فعل  
 تھا اور فکر قبولیت فروغی چیز تھی۔

چاروں طرف نعرے گونج رہے تھے، دل دھڑک رہے تھے۔ جذبات کا و فور  
 آنسو بن کر آنکھوں سے پھلکنے کے لیے بے تاب تھا۔

### جوار بھاٹا

تیس ہزار موٹریں گھاؤں گھاؤں کر رہی تھیں۔ منزل پر پہنچنے کے لیے بے  
 تاب انجن اپنی بے تابی کی شدت کی وجہ سے پہلے گیئر میں پھنسے ہوئے تھے۔  
 اس وقت ہم سب منی سے میدان عرفات کو جا رہے تھے۔ چھ کشادہ متوازی  
 سڑکیں ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو عرفات کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ اس کے باوجود  
 بسیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ انجنوں کے شور کی وجہ سے زائرین کے دلوں کی  
 دھڑکنیں تیر تیر تھیں۔ جب آپ چاہتے ہوں کہ اڑ کر منزل کو جالیں لیکن ریٹنگے پر  
 مجبور ہوں تو دلوں میں ایک طوفان اٹھتا ہے۔ طلب جوار بھاٹا بن جاتا ہے۔  
 یہ کیفیت کرائسس کی کیفیت تھی۔ ست روی سانس پیدا کر رہی تھی۔  
 سانس دلوں کی دھڑکنوں کو اور تیز کر رہا تھا۔

پتہ نہیں کیوں جب جلد پہنچنے کا خط شدت سے سوار ہو تو وہ خود حرکت میں  
 رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پتہ نہیں کس اصول کے تحت اس روز عرفات کی چھ فراخ اور  
 ہموار سڑکوں پر تیس ہزار بسیں یوں ریٹنگے پر مجبور تھیں کہ چھ میل کا سفر دو سو میل  
 کے سفر کے برابر ہو گیا تھا۔ لیکن اگر بسیں پہلے گیئر میں ریٹنگے کی بجائے چوتھے گیئر میں



دوڑتیں تو عرفات کا میدان ایک معمولی سا ریگزار بن کر رہ جاتا۔ حج کا Ritual ایک بے معنی سی دوڑ کی صورت اختیار کر لیتا۔

میدان عرفات خیموں، قاتوں اور شامیانوں کا ایک وسیع و عریض پھیلاؤ تھا۔ میدان تو کہیں نظر ہی نہیں آتا تھا۔ منیٰ میں تو پھر بھی ایک حصہ ایسا تھا جسے شہر کہا جاسکتا تھا۔ لیکن میدان عرفات میں نہ میدان تھا نہ شہر۔ خیمے ہی خیمے، خیمے ہی خیمے۔

ہماری موٹر حسب دستور ایک وسیع شامیانے کے صدر دروازے پر ٹنگے ہوئے بورڈ کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ جس پر جلی حروف میں فندق الکلی لکھا ہوا تھا۔ اندر وہی منیٰ کے پڑاؤ کا سا منظر تھا۔ دونوں جانب رہائشی خیموں کی قطاریں اور درمیان ایک وسیع شامیانے کے نیچے بھی سجائی نشستیں اور اس کے ملحق خیمے میں کھانے کی میزیں۔

وہی ہیں، وہی صاحب، وہی ٹرے اٹھائے ہوئے منتظر بیرے۔ بالکل منیٰ کے پڑاؤ کی طرح۔

### خالی قیام

عرفات میں پہنچنے کے بعد ایک عجیب سا سکوت طاری ہو گیا۔ جیسے پہاڑوں میں سے لاکھوں چٹھے، ندیاں، نالے شور مچاتے ہوئے تیزی سے آئیں اور دامن کوہ پر ان کا پانی ایک وسیع میدان میں پھیل کر ساکن ہو جائے۔

اس سکوت کی وجہ یہ تھی کہ عرفات میں صرف قیام کرنا ضروری ہے خالی قیام۔ اس قیام کے دوران چاہے آپ چائے پیتے رہیں، طعام کھاتے رہیں، تاش کھیلتے رہیں یا نوافل پڑھتے رہیں۔ یہ آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے یعنی عرفات کا قیام بذات خود ایک خلا ہے۔

Ritual درخت کی صداقت ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اس بات پر موقوف ہوتی ہے کہ وہ ٹہنیوں اور پتوں سے لدا ہوا ہو۔

بیاہ بنیادی طور پر ایک مذہبی اور قانونی معاہدہ ہے لیکن ہم نے اس میں رسم کی پھول پتیاں لگا کر ایک رنگین Ritual بنا رکھا ہے۔ رسم کی پھول پتیاں جس قدر زیادہ ہوں گی، اسی قدر Ritual میں رنگ پیدا ہوگا۔



اس لحاظ سے حج Ritual نہیں۔ حج میں طواف، سعی اور جمر صرف تین ارکانِ فعالی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی قیام قیام قیام۔ منیٰ کا قیام۔ عرفات کا قیام۔ مزدلفہ کا قیام۔

### پھول پتیاں

بچپن میں میں سنا کرتا تھا کہ حج کے دن میدانِ عرفات میں پہنچ کر زائرین کا عظیم انبوه چھیل میدان میں قطاریں بنا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قطاریں ہی قطاریں۔ قطاریں ہی قطاریں۔ زائر ہی زائر۔ زائر ہی زائر۔ تاحد نظر۔

اور پھر بنے بچے اونٹوں کا ایک قافلہ جبلِ رحمت کی طرف بڑھتا ہے۔ گھنٹوں یہ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ جبلِ رحمت کی چوٹی پر پہنچ کر ہر اونٹ اپنے مخصوص مقام پر ایستادہ ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی صاحبِ خطبہ پڑھتے ہیں اور ہجومِ احرام کے جذبے سے سرشار چپ چاپ کھڑا سنتا ہے۔

پھر غروبِ آفتاب کے قریب جبلِ رحمت پر ایستادہ اونٹوں میں سے وہ اونٹنی جو سب سے زیادہ بنی سچی ہوتی ہے اور جو مرکزی مقام پر ایستادہ ہوتی ہے۔ اپنی اگلی ٹانگیں جھکا کر گھنٹوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہے، پھر آواز آتی ہے ”حاجیوں کے حج قبول“ جسے سن کر کوئی سفید رومال لہراتا ہے۔ جو زائر اس اعلان کو سنتا ہے، وہ با آواز بلند اسے دہراتا ہے ”حاجیوں کے حج قبول۔“ ساتھ ہی وہ اپنا سفید رومال لہراتا ہے۔

آن کی آن میں عرفات میں لاکھوں سفید رومال پھر یروں کی طرح ہلتے ہیں اور لاکھوں زائرین خوشی اور انبساط سے نعرے لگاتے ہیں۔ ”حاجیوں کے حج قبول۔“ پتہ نہیں یہ تفصیلات قیام کے اس خلاء کو پر کرنے کی خواہش کے زور پر اختراع کی گئی تھیں یا واقعی اس زمانے میں اربابِ نظم و نسق نے حج کی رسم کو پر شکوہ بنانے کے لیے ان جزویات کو رائج کر دیا تھا۔

### جان کین

۱۸۷۸ء میں ایک عیسائی جان ایف کین نے محمد امین کے نام سے حج میں شرکت کی تھی اور اپنے تاثرات قلم بند کیے تھے۔

اگرچہ کسی غیر مسلم کو حرمین کے حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔



اس کے باوجود چند ایک عیسائیوں نے تحقیق کی غرض سے زائر کا بھیس بدل کر حج میں شرکت کی۔ مثلاً جان روڈوگ برک ہارٹ نے شیخ حاجی عبداللہ کے نام سے فریضہ حج میں شرکت کی تھی۔ حاجی محمد امین بھی ان عیسائیوں میں سے ایک ہیں۔ میدان عرفات کے متعلق۔ حاجی محمد امین کے تاثرات اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

عرفات کا میدان ہے جو چار پانچ مربع میل رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ عرفات کے شمال مشرق میں دو سو گز اونچا پہاڑ ہے جسے جبل العرفات کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ملحقہ ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو جبل الرحمت کے نام سے موسوم ہے۔

جبل العرفات کی طرف پیٹھ کر کے کھڑے ہو جاؤ تو میدان عرفات یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک عظیم اعمنی تھیٹر ہو۔ اور ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے لاکھوں آدمیوں کے ساتھ آپ ایک قدیم عظیم اور عالی شان سٹیج پر کھڑے ہیں۔

### پرہیت انبوه

آپ کے سامنے ایک عظیم انبوه ہے۔ ننگے کالے سروں اور سفید پیراہنوں کا انبوه۔ قطار در قطار انبوه۔ اس ویرانے میں اتنے عظیم انبوه کو دیکھ کر آپ کے دل میں حیرت پیدا ہوتی ہے۔ پھر آپ سوچتے ہیں کہ ان میں سے ہر فرد ہزاروں میل کا سفر کر کے دنیا کے کونے کونے سے وہاں پہنچتا ہے۔ اس خیال سے آپ کے دل پر بہت سی چھا جاتی ہے۔

جبل الرحمت پر لوگوں کی اتنی بھیڑ ہے کہ کسی کا حرکت کرنا یا راستہ بنانا ممکن نہیں۔

پھر غروب آفتاب کے قریب جبل العرفات سے ایک نعرہ بلند ہوتا ہے۔ جس میں اللہ اور محمد کے الفاظ واضح طور پر سنائی دے رہے ہیں۔

یہ نعرہ اس انبوه میں یوں گونجتا چلا جا رہا ہے جیسے سمندر میں لہریں چل رہی ہوں۔

ساتھ ہی کسی نے پہاڑی سے سفید کپڑا لہرا کر اشارہ سا کیا۔ اس اشارے کے جواب میں لوگوں نے احرام کا اوپر کا حصہ اتارا اور اسے لہرانے لگا۔

ہر چند ساعت کے لیے وہی عظیم گنگناہٹ لہریں کی طرح جبل العرفات سے اٹھتی



ہے، پیراہن لہراتے ہیں اور پھر مکمل سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ منٹوں کے بعد یہی عمل دہرایا جاتا ہے اور پھر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

یہ سلسلہ آدھ گھنٹے تک جاری رہتا ہے۔

اس دوران میں ہجوم کا جذبہ طوفان بن گیا ہے۔ لوگ جذبے کی شدت کی وجہ سے آپے سے باہر نکلے جا رہے ہیں۔ کئی ایک پر دیوانگی طاری ہے۔ وہ چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں۔ ایک عظیم شور برپا ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسے دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ حیرت اور خوف کے طے جلے جذبات آپ پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ میں جو اس منظر کو حقیقت پسندانہ اور خارجی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے۔ جیسے سات لاکھ دیوانوں میں صرف میں ایک فرزانہ ہوں۔

اس روز میدان عرفات میں نہ تو میدان نظر آتا ہے اور نہ زائرین کا انبوہ۔ صرف خیمے تھے اور خیموں کا عظیم پھیلاؤ بھی تو پورے طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ فندق الکلی میں بھی زائرین اپنے اپنے خیموں میں بند تھے۔ چند زائرین بڑے شامیانے کے نیچے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ کسکس چل رہی تھیں، ہونٹ مل رہے تھے۔ چروں پر اداسی بھرا سکون طاری تھا۔ کندھے یوں جھکے ہوئے تھے جیسے کوئی افتاد آ پڑی ہو جسے وہ صبر و تشکر سے جمیل رہے ہوں۔

## رنگ رنگ

دنیا میں رنگ رنگ کے لوگ ملتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو منزل پر پہنچ کر عجیب سا سکون محسوس کرتے ہیں۔ تشکر کے جذبات سے لبالب بھر جاتے ہیں۔ غالباً ایسے لوگ بہتر قسم کے لوگ ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ جن کے لیے خوشی اطمینان اور سکون نہیں بلکہ ایک اضطرابی کیفیت ہے۔ منزل پر پہنچ کر میرا جی چاہتا ہے کہ خوشی سے ناچوں یا حال مکیلوں یا دھمال چاؤں۔ خوشی کی شدت میرے لیے ایک فحالی کیفیت ہے۔

فندق الکلی کے مہذب و متمدن لوگ اور ان کا وہ سکون میرے لیے سخت پریشان کن تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ سب ذکر الہی میں معروف تھے لیکن ذکر الہی تو گھر بیٹھ کر بھی ہو سکتا ہے۔ تسبیح چلانا مقصود ہو تو کیا اس کے لیے ہزاروں مصلوں کا سفر کر کے



میدان عرفات میں پہنچنا ضروری ہے۔ نہیں نہیں۔ میں وہاں سے اٹھ بھاگا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میدان عرفات میں دوڑوں بھاگوں۔ ریت اڑاؤں جیسے کسی صحرا میں دھول اڑتا پھرتا تھا۔

قدق الکلکی کے خیمے سے نکلنے سے پہلے میں نے سوچا کہ قدرت کو بتادوں کہ میں جا رہا ہوں۔ نہ جانے کہاں جا رہا ہوں۔ نہ جانے کیا کرنے جا رہا ہوں لیکن جا رہا ہوں تاکہ وہ میری تلاش میں سرگرداں نہ ہوں۔

### روپ، ہروپ

میں نے خیمے میں جھانکا۔ اندر قدرت اور ڈاکٹر عنفت دونوں نفل پڑھنے میں مصروف تھے۔

جب قدرت نفل پڑھ رہے ہوں تو انہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ قدرت ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی اور آدمی ان کا روپ دھارے کھڑا ہو۔ لیکن نہیں۔ روپ دھارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا چونکہ اس وقت ان کا اپنا روپ تو ہوتا ہی نہیں۔ نفل یا نماز پڑھتے وقت ان کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے۔ یوں مسخ ہو جاتا ہے جیسے کالج کا گلاس ضرب کھا کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ لیکن ریزے ایک دوسرے سے جڑے رہیں۔ الگ الگ نہ ہوں۔ ان کے چہرے سے ذہانت موقوف ہو جاتی ہے۔ اور شخصیت کی وہ چمک جو عام زندگی میں ان کے چہرے پر آتی جاتی رہتی ہے۔ اس کی آمد کا امکان سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔

اس وقت ایسا لگتا ہے جیسے اس شخص کو دانشوری سے دور کا واسطہ نہ ہو۔ اس وقت ان کے چہرے پر وہ نورانیت بھی تو نہیں ہوتی جو اللہ کے ان بندوں پر صاف نظر آتی ہے، جنہیں علم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔ اور وہ اس احساس پر اک ان جانی مسرت سے لبریز ہوتے ہیں۔

قدرت کا چہرہ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اس کے شانے یوں گرے گرے تھے، جیسے ابھی ٹوٹ کر زمین پر ڈھیر ہو جائیں گے۔ ان کے جسم کا ذرہ ذرہ لجاہت، بلامت اور گڑگڑاہٹ سے بھرا ہوا تھا۔

ہٹاؤ میں نے سوچا اس شخص کو تو اپنی ہی خبر نہیں میں اسے اپنے بارے میں



کیسے خبر دے سکتا ہوں۔ میں نقد لکھی سے باہر نکل گیا۔

### زار اور دوکاندار

چند قدم گیا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو بازار میں پایا۔ یہ خیموں کا بازار تھا۔ وہاں ہر قسم کی خوردنی چیزوں کی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ گوشت سبزی، آٹا، وال، کباب، تکے، نان چائے۔

لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ یوں مصروف تھے جیسے زندگی محض خرید و فروخت ہو۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ وہ میدان عرفات میں ہے کہ حج کا دن ہے، وہ دن جس کی آرزو میں اس نے برسوں خواب دیکھے تھے۔ سوتے کے خواب جاگتے کے خواب۔

بازار میں بیشتر دوکان داروں نے احرام پہن رکھے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ دوکاندار ہونے کے علاوہ زائر بھی تھے۔ عرفات میں دنیاوی اور دینی دونوں کمائیاں کر رہے تھے۔

کیا واقعی طعام میں اتنی طاقت ہے کہ وہ گرد و پیش کو بھلا دیتی ہے۔ کیا طعام اتنی بڑی حقیقت ہے؟

کیا روپیہ کمانا اتنی عظیم خواہش ہے کہ زائر عرفات کے قیام کو بھی منافع کمانے کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ کیا منافع کمانے کی ہوس عرفات میں بھی ہمیں نہیں بخشتی۔ کیا روپے کی ہوس اتنی طاقت ور ہے کہ اس کے سامنے سب کچھ ماند پڑ جاتا ہے۔

میں نے محسوس کیا جیسے وہ بازار اٹلیس نے لگا رکھا ہو کہ زائرین کو طعام اور منافع کے جال میں جکڑ لیا جائے۔

### جبل الرحمت

بازار سے باہر نکلا تو وہ ٹھن ختم ہو گئی۔

میرے سامنے ایک فرلانگ دور جبل الرحمت کی پہاڑی تھی۔

جبل الرحمت پر لوگ یوں چڑھے ہوئے تھے جیسے گڑ کی بھیلی پر چوٹیاں چڑھی

ہوتی ہیں۔ ابھی بہت سے لوگ جبل الرحمت کی طرف چلے جا رہے تھے۔

نہیں نہیں میں اس بھیڑ میں نہیں جاؤں گا۔ بھیڑ میں میرا دم گھٹتا ہے۔ اس



وقت مجھ پر ایک بے نام سی دیوانگی طاری تھی۔ میرے اندر خوشی کا ایک سمندر ٹٹاٹھیں مار رہا تھا۔ اس احساس پر خوشی کہ میں میدانِ عرفات میں تھا۔ اور وہ جس کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے میں وہاں آیا تھا۔ وہ خود ہمارے ساتھ ساتھ آیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس خوشی پر اکیلے میں جا کر ناچوں، دھمال کھیلوں۔ کوئی ایسا ڈھول بجاؤں جس کی ضرب سات لاکھ زائرین کے قلب پر پڑے اور وہ سب دیوانہ وار خمیوں سے باہر نکل آئیں۔ اپنی اپنی کسکیں پھینک دیں، نوافل پڑھنا بھول جائیں اور پھر ہم سب مل کر اس کو ڈھونڈ نکالیں۔ جس کے حکم پر ہم سب وہاں حاضری دینے آئے تھے اور ہمیں حاضری کا حکم دینے کے بعد وہ خود ہم میں شامل ہو گیا تھا اور ہمیں میں چھپا بیٹھا تھا۔

### سفید پتھر

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میدانِ عرفات تو نہ جانے کہاں کس اوٹ میں گم تھا۔ اس میں لگے ہوئے خیمے بھی پتہ نہیں کس نچان میں دبکے ہوئے تھے۔ کدھر جاؤں میں نے سوچا۔ کہیں جانے کی کوئی جگہ بھی تو نظر نہیں آتی تھی۔ رہ رہ کر میری نگاہ جبلِ الرحمت پر گڑے ہوئے سفید پتھر کی طرف اٹھ جاتی۔ یہ سفید پتھر دراصل پتھر کی تراشی ہوئی سل تھی۔ جو قد آدم سے بھی اونچی تھی۔ اور اس پر چوڑے کی دہیزہ چڑھی تھی۔

اس میلی میلی پہاڑی پر وہ سفید پتھروں چمک رہا تھا جیسے نیلے آسمان پر سورج چمک رہا ہو۔

رہ رہ کر میری نگاہ اس سفید پتھر پر مرکوز ہو جاتی۔ جی چاہتا کہ جا کر دیکھوں کہ یہ سفید پتھر کیا چیز ہے۔ نہیں نہیں میں اپنے آپ کو سمجھاتا، میں میدانِ عرفات میں حاضری دینے آیا ہوں۔ میں ادھر کیوں جاؤں۔ میں نے سفید پتھر کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا، دفعتاً میرے سامنے میدان کی طرف وہی سفید پتھر ابھر آیا۔ میں نے اپنا منہ خمیوں کی طرف موڑ لیا۔ ارے وہاں بھی وہی سفید پتھر موجود تھا۔ پھر تو وہ سفید پتھر سارے منظر پر چھا گیا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ جس کی حاضری



دینے کے لیے میں میدانِ عرفات میں آیا تھا۔ وہ اسی پتھر کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔  
میں جبلِ الرحمت کی طرف بھاگا۔ دوڑتا پھلا نکلا۔ بھیڑ کو کاٹتا ہوا۔ لوگوں کو  
دھکے دیتا ہوا۔ میں سفید پتھر کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں بہت سے لوگ کھڑے تھے۔  
میں نے ایک زائر سے پوچھا۔ ”یہ سفید پتھر کیا ہے؟“ اس نے حیرت سے  
میری طرف دیکھا، میرے احرام کی طرف دیکھا۔

اس کی نگاہوں میں شکوک جھلک رہے تھے۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ میں  
مسلمان ہوں۔ پھر نیم حیرت اور نیم غصے سے گویا ہوا۔ ”اے۔“ وہ چلایا ”آپ کو اتنا  
بھی نہیں پتہ کہ یہ سفید پتھر اس مقام کی نشاندہی کر رہا ہے جہاں سرور کائنات نے  
کھڑے ہو کر آخری خطبہ پڑھا تھا۔“

پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ دفعتاً ”بھیڑ معدوم ہو گئی۔ پہاڑی پر کوئی تنفس نہ رہا۔  
میرے خیموں کا شہر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ اس سفید پتھر کے پاس اکیلا کھڑا تھا۔ پھر اس  
سفید پتھر سے ایک کنکر اڑا۔ اور نہ جانے میرے کہاں لگا۔ تراخ کی آواز آئی۔ میں  
ریزہ ریزہ ہو گیا۔ میرا چہرہ گویا ٹوٹ کر مسخ ہو گیا اور میں دھائیں دھائیں کر کے رونے  
لگا۔

نہ جانے کب تک میں وہاں روتا رہا۔ پھر دفعتاً میں نے دیکھا کہ میرے  
ارد گرد بھیڑ لگ گئی ہے۔ لوگ میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ باتیں کر رہے ہیں۔ ٹھٹھا  
اڑا رہے ہیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ میں وہاں سے بھاگا اور سفید پتھر سے دور ایک غار نما کھڈ  
میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں تنہائی تھی۔ شرمندگی، شرمساری محسوس کیے بغیر میں رو سکتا  
تھا۔ پتہ نہیں وہاں بیٹھ کر میں کتنی دیر رک رک کر روتا رہا۔

دفعتاً مجھے اجناس ہوا کہ میرے سامنے کچھ دور لوگوں کا ایک جھگٹا لگ گیا  
ہے۔ درمیان میں کوئی مولانا قسم کا آدمی وعظ فرما رہا تھا۔ لوگ اس کے ارد گرد کھڑے  
تھے لیکن ان سب کی نگاہیں سفید پتھر پر مرکوز تھیں۔ کوئی وعظ نہیں سن رہا تھا۔  
پھر پہاڑی کے پچھواڑے سے ایک معزز آدمی نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ  
تھا۔ انداز میں بڑا وقار تھا۔ موڑ مڑ کر دفعتاً اس کی نگاہ سفید پتھر پر پڑی۔ اس کا چہرہ  
ریزہ ریزہ ہو گیا۔ وقار کی طبع اتر گئی۔ سنجیدگی پاش پاش ہو گئی اور وہ ڈھائیں مار مار کر  
رونے لگا۔



پھر یک لخت اسے احساس ہوا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ بڑی محنت سے پھر سے چہرے پر ضبط بھری سنجیدگی پیدا کی۔ بڑے وقار سے ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن نجانے کیا ہوا پھر سے اس کا ضبط پارہ پارہ ہو گیا اور وہ ڈھائیں مار مار کر رونے لگا۔

باوقار زائر کے بلانے کے بعد ایک اور شخص پہاڑی کے پچھواڑے سے لیک کے نعرے لگاتا ہوا نمودار ہوا۔

سجدہ سہو

سفید پتھر کو دیکھ کر وہ رک گیا۔ وہ لیک پڑھنا یکسر بھول گیا جیسے سفید پتھر کو دیکھ کر اس کی سدھ بدھ ماری گئی ہو۔ پھر اس نے اپنی آستین کے گرد لپٹا ہوا سفید رومال کھولا۔ اسے زمین پر بچھایا، ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور پھر دھڑام سے سجدے میں گر گیا۔

بڑی دیر کے بعد وہ سجدے سے اٹھا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، جیسے وہ اپنے اس فعل پر ندامت محسوس کر رہا ہو۔ اس کی نگاہ سفید پتھر پر پڑی اس پر پھر وہی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی عالم دیوانگی میں اس نے پھر سے رومال بچھایا اور دم سے سجدے میں گر گیا۔

اس شخص کو دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی۔ میں نے محسوس کیا، جیسے وہ کوئی غیر نہ تھا۔ جیسے وہ میں خود تھا میں۔ جیسے وہ میرے اندر کا ممتاز تھا۔ بے شک اس میں بھی جھجک موجود تھی۔ چونکہ سجدے سے اٹھ کر وہ چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ لیکن میں تو سر تاپا جھجک تھا۔ مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ رومال بچھا کر سجدے میں گر پڑوں۔ حالانکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ سفید پتھر شخص ایک اوٹ ہے۔ جس کے پیچھے وہ خود چھپا بیٹھا ہے جس کے لیے ہمارے سجدے مخصوص ہیں۔

امر کی ٹریلر

میری نگاہ سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ پگڈنڈی سے پرے ایک ایسی ہی غار نما کھوہ تھی۔ جس میں میں بیٹھا تھا۔ اس کھوہ میں امر کی طرز کا ایک باورچی خانہ لگا ہوا



تھا۔ اوون 'چولے' سنک 'سب کچھ' کیل کانٹے سے لیس۔ کھوہ کے باہر ایک ٹریلر قسم کی کار کھڑی تھی۔

اندر باورچی خانے میں زمین پر ایک قالین بچھا ہوا تھا۔

اس قالین پر ایک صاحب نما آدمی احرام پہنے 'زانوئے ادب' کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بڑے احترام سے بیٹھا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ نماز ادا کرنے میں مصروف ہے۔ پھر دفعتاً "مجھے خیال آیا کہ وہ تو مشرق کی طرف منہ کیے بیٹھا ہے۔ پھر جو میں نے غور سے دیکھا تو اس کی نگاہیں سفید پتھر کا طواف کر رہی تھیں۔

سفید پتھر۔ سفید پتھر۔ سفید پتھر۔

چاروں طرف سفید پتھر چھایا ہوا تھا۔ میدان عرفات پر۔ جبل عرفات پر۔ جبل الرحمت پر۔ زائرین کے دلوں پر 'لوگوں کے ذہنوں پر' ان کے جذبات پر۔ بالکل اسی طرح جس طرح مکہ معظمہ پر خانہ خدا کا سیاہ پتھر چھایا ہوتا ہے۔

دفعتاً "مکہ معظمہ کا کالا کوٹھا میری نگاہوں میں ابھرا۔ پھر وہ ہوا میں معلق ہو گیا اور سفید پتھر کی طرف بڑھنے لگا۔ سفید پتھر کے قریب پہنچ کر وہ اس کے پہلو میں ایستادہ ہو گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیاہ اور سفید پتھر دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

## وقوف

عین اس وقت زائرین کے انبوہ سے ایک شور اٹھا۔ حاضر ہوں اے میرے اللہ میں تیرے حضور حاضر ہوں۔ سارا میدان لبیک کے نعروں سے گونج اٹھا۔ وہ سب مغرب کی طرف رخ کیے کھڑے تھے۔ اور سورج کی طرف دیکھ رہے تھے جو عیزی سے افق کی جانب گرتا جا رہا تھا۔

جوں جوں وہ سب لبیک پڑھتے جاتے ان کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ جذبہ جوار بھاتا بنتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کی تسکین بھول چکے تھے۔ تسکین ان کے ہاتھوں میں یوں لٹک رہی تھیں جیسے بے جان ہو چکی ہوں۔ وہ سفید پتھر کو بھول چکے تھے۔ وہ پتھر جو حج سے لے کر اب تک ان کی نگاہوں کا مرکز بنا رہا تھا۔ وہ پتھر جسے وہ عملی طور پر نہ سسی لیکن ذہنی طور پر سجدے کرتے رہے تھے۔ وہ پتھر اب اتنی بڑی بھیڑ میں



اکیلا کھڑا تھا۔ اکیلا تھا۔

جذبات کا ظالم بڑھتا جا رہا تھا۔

چاروں طرف پھینٹے اڑ رہے تھے۔ تقدیس بھرے پھینٹے۔ احترام کے فوارے اچھل رہے تھے۔ اس بڑھتے جوش و خروش کی وجہ سے زائرین پر دیوانگی کا عالم طاری ہو تا جا رہا تھا۔ ایسی دیوانگی جس پر لاکھوں فرز انگلیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔

سیاہ و سفید

یہ سب کیا ہے؟ میں نے سوچا۔ اتنے بڑے ہجوم کی اتنی فوری کاپلاٹ بے وجہ کاپلاٹ۔ یہ کاپلاٹ کیسے عمل میں آئی۔ اس کا محرک کیا تھا۔ کون تھا؟  
 ”یہ قیام ہے۔“ میرے دل سے آواز بلند ہوئی۔ ”قیام۔“  
 ”یہ حج کا وقوف ہے۔“ قریب ہی سے آواز آئی۔

میں نے حمت سے چاروں طرف دیکھا۔ یہ قیام خالی تو نہیں۔ یہ قیام خالی تو نہیں۔ یہ قیام خالی تو نہیں۔ یہ قیام تو نہیں۔ یہ قیام تو جذبے کی مد سے بھرا ہوا ہے۔ یہ قیام تو اک طوفان ہے۔ لیکن لیکن خلا کیسے پر ہو گیا۔ کس نے اس قیام کو بھر پور بنا دیا۔ اس قیام کا مرکز کیا ہے۔ ڈوہتا سورج؟ نہیں نہیں ڈوہتا سورج تو کبھی روح میں جوار بھانا پیدا نہیں کر سکتا۔ ڈوہتا کیا چڑھتا سورج بھی جذبے کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ یہ سورج جو دن رات کی پابندی میں مقید ہے۔ یہ بے چارا کیا مرکز بنے گا۔ میں نے تحقیر سے سورج کی طرف دیکھا۔  
 میری نگاہوں تلے سورج ادب و احترام سے پیچھے ہٹ گیا۔ دو پتھر ابھرے۔ کالا اور سفید پتھر۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ اور پھر وہ بڑھ کر سارے میدان پر مسلط و محیط ہو گئے۔



## حجرۃ الباطنیہ

اندھیرا چھائے جا رہا تھا۔

سامنے میدان عرفات کالق ودق ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم چاروں پتھروں پر سرنگوں بیٹھے تھے۔ قدرت 'ڈاکٹر عفت' عرب موٹر ڈرائیور اور میں۔ پاس ہی ہماری سیاہ رنگ کی لمبی کار کھڑی تھی۔

میدان عرفات میں سامنے ایک گیس جل رہا تھا۔ جس کے ارد گرد چار ایک ہی قسم کے زائرین بیٹھے ہوئے تھے۔

### وقوف اور خروج

قریب ہی ایک شور برپا تھا۔ جیسے آبشار گر رہا ہو۔ یہ شور زائرین کے عمل اخراج کی وجہ سے تھا۔ زائرین میدان عرفات سے نکل بھاگنے کے لیے اس قدر مضطرب تھے کہ ہمیں یہ شک پڑنے لگا تھا کہ میدان عرفات میں غروب آفتاب تک قیام کرنے کی شرط نہیں بلکہ غروب آفتاب سے پہلے اخراج کا حکم ہے۔

میدان عرفات میں غروب آفتاب سے پہلے ہی ایسی جھگڑ پڑ جاتی ہے۔ جس میں شدت چھوڑ دیوانگی کا عنصر ہوتا ہے۔ خیمے اکھاڑ لیے جاتے ہیں۔ سامان باندھے جاتے ہیں۔ ٹرک سامان سے لاو دیے جاتے ہیں۔

غروب آفتاب سے بہت پہلے زائرین ذہنی طور پر پابار کاب ہو جاتے ہیں۔ وقوف کی دعاؤں کی محویت میں فوری اخراج کے لیے بے تابی کا کائناتک جاتا ہے۔ ایک نظر وقوف پر مرکوز ہوتی ہے دوسری اخراج پر۔ وقوف کی قدمیں اخراج کا نمک شامل



ہوتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں یہ گنگا جمنی کیفیت کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ شاید منفی طاقتوں نے حاضری کو اغوا کرنے کے لیے یہ انوکھا طریقہ ایجاد کیا ہو۔

بہر حال نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر آفتاب غروب ہوا ادھر سات آٹھ لاکھ زائرین میں فوری اخراج کی خواہش جھکڑ بن کر چلنے لگی۔ ایک عجیب قسم کی نفسا نفسی ایک پریشان کن اضطراب ”تو“ سے سرشار ہونے کی غرض سے اتنی دور سے چل کر آنے والے زائرین اس نفسا نفسی کی گھمن گھیری میں پڑ کر گویا بکروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور سارا میدان عرفات ان کی ”میں میں“ سے گونجنے لگتا ہے۔ میرا سامان کدھر ہے۔ میرا کببل کیا ہوا، میرا ٹرک کون اٹھا کر بس تک لے جائے گا۔ میری گھڑی، میرا لوٹا، میرا تالہ۔

## تجیل

پھر ہجوم مست ہاتھی کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ ہر زائر چاہتا ہے کہ فوراً میدان عرفات سے نکل جائے۔ ہر ایک، دوسرے سے آگے نکل جانے کے لیے بے تاب ہے۔ دوسرا تیسرے کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں لگا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی میدان عرفات سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ نکلنے کا راستہ اس دیوانگی، نفسا نفسی اور تجیل کی وجہ سے جام ہو جاتا ہے۔

گھنٹوں کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ اس بے بسی کے عالم میں موٹریں گھاؤں گھاؤں کرتی ہیں۔ زائرین کے دل دھک دھک کرتے ہیں اور پڑول کے مرغولے اندھیرے کو اور بھی اداس بنا دیتے ہیں اور پھر میدان عرفات سے خوف آنے لگتا ہے۔ ہم چاروں چپ چاپ بیٹھے اس شور و غوغا کو سن رہے تھے۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پاس ہی مکھیوں کا بھتہ چمڑا ہوا ہو۔

میں نے قدرت سے کہا۔ ”یہ آوازیں سن رہے ہیں آپ؟“

”ہاں۔“ وہ بولے۔

”عجیب سا شور ہے جیسے جھکڑ چل رہا ہو۔“

”ہاں، تجیل بذات خود ایک جھکڑ ہے۔“

”جھلت تو آج کے دور کی خصوصیت ہے۔ جلدی اور جلدی، جلدی جائیں،“



جلدی نہیں، جلدی لوٹیں، جلدی جئیں، جلدی مریں۔“  
 ”ہاں۔“ وہ بولے ”قیام ایمان پیدا کرنے میں مدد ہوتا ہے۔ مجلت تذبذب  
 پیدا کرتی ہے۔“

”ان سب کا خیال ہے کہ اگر غروب آفتاب کے فوری بعد اخراج نہ ہو تو ج  
 فسق ہو جائے گا۔ کیا یہ اعتبار درست ہے؟“

”غروب آفتاب کے بعد Point of time نہیں Period of time  
 ہے۔ اللہ کے احکامات مبہم نہیں ہوتے۔“

”تو یہ تعجیل غلط فہمی کی وجہ سے ہے؟“

”چاہے غلط فہمی ہو یا کچھ بہر صورت اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا  
 کہ اس وقت کی تعجیل اللہ کا حکم بجالانے کے شوق کی وجہ سے ہے۔ اسے تحقیق کی نظر  
 سے دیکھنا اچھا نہیں۔ ان سب میں لگن ہے جذبہ ہے۔“

”آپ تو کہا کرتے ہیں Over Enthusiasm قابل ستائش نہیں؟“

”ہاں۔ لیکن اسے برا بھی نہیں کہہ سکتا۔“

دفترا“ ڈاکٹر محنت ہننے لگی ”Your Lordships“ وہ بڑی سنجیدگی اور  
 ادب سے بولی ”آپ زائرین پر جج بنا کر بھیجے گئے ہیں نا؟“

دور سے قفقہ سنائی دیا۔ روشن گیس تلے بیٹھے ہوئے بیسی نما زائرین قفقے  
 لگا رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کس بات پر ہنس رہے تھے۔ میری کوتاہ نظری پر یا ڈاکٹر محنت  
 کی وسعت نگاہ پر۔

پھر میری نگاہ تلے وہ جلتا ہوا گیس کھونٹے لگا۔ اور گھومتے گھومتے دفترا“ سفید  
 منور پتھر میں بدل گیا۔ وہی سفید پتھر جو شام کے وقت جبل الرحمت پر ایستادہ تھا۔ اس  
 مقام پر ایستادہ تھا۔ جہاں سے اللہ کے آخری رسول نے اپنا آخری خطبہ اپنی امت کو  
 عطا فرمایا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں جیب کا رومال بچھا کر اس منور پتھر کے روبرو  
 سر بسجود ہو جاؤں۔

پھر چاروں طرف سے رات کی سیاہی نے منور پتھر کی طرف پورش کر دی۔  
 گویا سارا گرد و پیش سیاہ پتھر کا بنا ہوا کوٹھا بن گیا۔ اس کالے کوٹھے میں وہ سفید منور پتھر  
 دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔



## مزدلفہ

پتہ نہیں ہم کس وقت مزدلفہ پہنچے۔ پتہ نہیں مزدلفہ شہر تھا، گاؤں تھا یا کوئی پڑاؤ تھا۔ ہماری موٹر کی تو سامنے ویرانے میں ایک ٹیلے کا ایک نشیب پھیلا ہوا تھا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ آٹھ لاکھ زائرین کہاں تھے۔

جہاں ہم اترے وہاں پندرہ بیس زائرین نماز پڑھنے کی تیاری میں مصروف تھے۔ ہم جلدی سے ان کی صف میں جا کھڑے ہوئے نماز کے بعد وہ سب اس ویران اور اندھیرے نشیب پر بکھر گئے۔ پھر اندھیرے سے دو ایک آوازیں سنائی دیں۔ ”بھائیوں کنکریاں چن لو۔“

”کنکریاں حساب سے چنئے گا۔“ قدرت نے کہا:

پہلے روز صرف سات کنکریاں جمرۃ العقبہ کو مارنی تھیں، اور باقی دو دن تینوں جمروں کو کنکریں مارنے کا عمل دہرانا تھا۔ یعنی پہلے دن صرف سات، دوسرے اور تیسرے دن ایکس فی دن یعنی کل ۴۹ کنکریاں فی کس۔ احتیاطاً ”ہر کس تقریباً ساٹھ ستر کنکریاں چننے میں مصروف تھا یعنی اس وقت مزدلفہ کی پہاڑی سے آٹھ لاکھ زائرین چھ کروڑ کنکریاں چن رہے تھے۔“

## کنکریاں

مزدلفہ کی پہاڑی کنکریوں کی پہاڑی ہے۔ اس کے باوجود کنکریاں چننے میں خاصی دیر لگ رہی تھی۔ جب کسی چیز کی بہتات ہو تو انسان چٹاؤ پر مائل ہو جاتا ہے۔ زائرین سائز کے حساب سے کنکریاں چن رہے تھے۔ بڑی نہ ہوں گول ہوں۔ ایک سی ہوں۔

پتہ نہیں کیوں، کسی ان جانی خواہش کے تحت میں بہت چھوٹی کنکریاں چننے میں مصروف تھا۔ شاید اس لیے کہ بہت چھوٹی اور ایک سی کنکریاں چننے میں بہت وقت درکار تھا اور یوں بچوں کی طرح بننے اکٹھے کرنے میں نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کا بہانہ بنا لیا تھا۔ یا شاید میں زیادہ بوجھ اٹھانے کی کوفت سے اپنے آپ کو بچا رہا



تھا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں شیطان کو زیادہ ایذا پہنچانے سے گریز کر رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ماضی میں ہمارا گھرایارانہ رہا تھا۔ اور اب میں کس منہ سے اسے پتھر مارتا۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا ”اس فاحشہ عورت کو پہلا پتھر وہ مارے جس نے زندگی میں کبھی گناہ نہ کیا ہو۔“ شاید یہ بات میرے لاشعور میں کانٹا بن کر لگی ہو یا شاید اس کی وجہ یہ کہ مجھے احساس تھا کہ شیطان کتنا منتقم واقع ہوا ہے اور مجھ پر اس کے انتقام کا خوف طاری تھا۔

ایک روز حرم شریف میں بیٹھے ہوئے میں نے قدرت سے کہا تھا۔ ”یہاں حاضری دینے کے کوئی اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ کیا یہ میری نااہلیت کی وجہ سے ہے؟“

رجعت

قدرت بولے۔ ”یہاں حاضری دینے کے اثرات واپسی کے بعد مرتب ہوتے ہیں۔“

”کیا وہ آپ ہی محسوس ہوتے ہیں؟“

”ہاں۔“

”کیا وہ لازماً مثبت ہوتے ہیں؟“

”ضروری نہیں۔“

”منفی بھی ہو سکتے ہیں؟“

”ہاں“ مگر عام لوگوں کے لیے نہیں صرف ان کے لیے جنہیں مقام حاصل ہے۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر کیا۔

”کئی بار رجعت یعنی Reversion عمل میں آتی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے Reverse-Gear لگ جاتا ہے؟“

”ہاں۔“ وہ بولے۔

”Reverse Gear تو صرف اسی صورت میں لگ سکتا ہے جب آپ

آگے بڑھ چکے ہوں۔ بڑھ رہے ہوں۔“







لاکھ بچے بننے جن رہے تھے تاکہ منی میں جا کر جمروں کے نشانے لگائیں۔ بے شک وہ اپنے اللہ کا حکم بجالارہے تھے۔ لیکن کسی نے سوچا نہ تھا کہ اس میں کیا حکمت پنہاں ہے۔ پھر مارنے کے فعل میں تواتر کیوں ہے۔ اور کیا یہ تواتر تین دن کے بعد ختم ہو جاتا ہے؟

کنکریاں چننے کے بعد زائرین پہاڑی کے ڈھلان پر بکھر گئے۔ اپنی اپنی دریاں زمین پر بچھالیں، چادریں لپیٹ لیں اور اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ پہاڑی کے پیچھے مدھم اور بے جان سا چاند نہ جانے کہاں لٹکا ہوا تھا۔ پہاڑی کے اس ڈھلان پر جہاں ہم بیٹھے تھے۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں زائرین یہاں، وہاں بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں وہ عبادت میں مصروف تھے یا سڑکی کوفت کی وجہ سے تھک کر پڑ گئے تھے۔

قدرت اور ڈاکٹر عفت کچھ دیر تو بیٹھے رہے۔ پھر وہ دونوں لیٹ گئے۔

”آپ لیٹ گئے؟“ میں نے قدرت سے پوچھا۔

”ان کی طبیعت اچھی نہیں۔“ ڈاکٹر عفت نے جواب دیا۔

”ان کی طبیعت بڑی موقع شناس ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“ وہ بولیں۔

”یہ تو کہتے تھے کہ مزدلفہ کی رات عبادت کی رات ہوتی ہے۔“

”ہاں ہوتی ہے۔ لیکن جب طبیعت ہی ناساز ہو تو۔۔۔۔۔؟“

قدرت کی ناسازی طبع کاراز میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔ صرف قدرت ہی

نہیں چند ایک اور لوگ بھی ہیں جن کی ناسازی طبع میرے لیے معمرہ بنی رہی ہے۔

جان محمد بٹ

مثلاً میرے اولین بنیاد کرم فرما بھائی جان، جان محمد بٹ صاحب ہیں۔ ان کی

زندگی گویا ناسازی طبع کے محور پر گھومتی ہے جس میں انہیں گذشتہ سترہ سال سے جانا

ہوں۔ ان سترہ سالوں میں بمشکل چند ایک گنتی کے دن ہوں گے جب ان کی طبیعت

ناساز نہ تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے شک پڑنے لگا کہ ان کی ناسازی طبع ہماری ناسازی طبع سے

بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ناسازی طبع پانی ہو اور بھائی جان



پھلی ہوں جیسے ناسازی طبع کے بغیر بھائی جان کے لیے حرکت ممکن نہ ہو، جیسے حرکت ان کا مقصد حیات ہو جس کے لیے ناسازی طبع پیدا کرنا از بس ضروری ہو۔

بھائی جان کی اس ناسازی طبع کی نوعیت کا اندازہ اس تفصیل سے لگ سکتا ہے کہ وہ اس کا سدباب کرنے کے لیے دل کو طاقت دینے والی دوا "کورامن" کا استعمال کرتے ہیں اور "کورامن" کی پوری شیشی چار دنوں میں ختم کر دیتے ہیں۔

میرے ایک عزیز دوست اور ساتھی راجہ شفیق کو بھی بھائی جان سے عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ مارکیٹ میں طاقت والی کورامن کا توڑا ہو گیا۔ بھائی جان نے راجہ کو کہا کہ ہمیں ہر چوتھے دن کورامن کی ایک شیشی درکار ہوتی ہے۔ راجہ نے اپنے کیمسٹ دوست سے بات کی۔ کیمسٹ یہ سن کر گھبرا گیا کہنے لگا۔ کورامن کی شیشی تو مہینوں چلتی ہے اور چونکہ زہریلی دوا ہے جو شخص اسے چار دن میں ختم کر دے وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ راجہ صاحب اس کیمسٹ کو بھائی جان کی خدمت میں لے گئے۔ بھائی جان نے بڑی معصومیت سے کہا، جی ہماری کورامن کی شیشی تو صرف چار دن چلتی ہے، کیمسٹ کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں لیکن بھائی جان کی معصومیت جوں کی توں قائم رہی جیسے وہ کورامن کی شیشی نہیں بلکہ ٹافیوں کے پیکٹ کی بات کر رہے تھے۔

قدرت کو جب بھی انجامینا کا دورہ پڑے تو کہا کرتے ہیں۔ "گھبرانے کی بات نہیں مفتی صاحب اگر برتن پر زیادہ دباؤ پڑ جائے تو وہ ترخ جاتا ہے۔ میں ذرا ترخ گیا ہوں۔ ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

مجھے شک پڑتا ہے کہ وہ الزاما برتن پر زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ ترخ جائے۔ ترخنے میں ایک لذت ہے ایک کیفیت۔ اس کیفیت میں لذت اور اذیت یوں ملے جلتے ہوتے ہیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کہاں لذت ختم ہوئی اور لذت شروع ہو گئی۔ کہاں اذیت ختم ہوئی اور لذت شروع ہو گئی۔ اس حقیقت کو تو نفسیات کے مشاہیر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ Ectasy اور Pain کا ازلی ناطہ ہے۔

میں نے قدرت سے کہا۔ "ایک بات پوچھوں؟"

انہوں نے سراٹھات میں ہلا دیا۔

"کیا آپ کو شش کر کے ترخنے ہیں؟"

انہوں نے سر نیلی میں ہلا دیا۔



”کیا آپ میں تڑخنے کی خواہش ہے؟“  
”نہیں۔“

”کیا تڑخنے میں لذت کا احساس ہے؟“  
”لذت بھی ہے۔“ وہ بولے۔

”تو آپ لذت حاصل کرنے کے لیے تڑختے ہیں۔“

”حصول لذت سب سے بڑی دیوار ہے۔“ وہ بولے اور

”بس بس“ ڈاکٹر عفت بولیں ”کوئی بحث نہیں ہوگی“ انہیں اب سونے

دیتے۔“

واپسی

پو پھوٹتے ہی موٹر ڈرائیور نے ہمیں جگا دیا اور نماز پڑھنے کے بعد ہم موٹر میں  
سوار ہو کر منی کی طرف چل پڑے۔

دفعتا ”قدرت چلائے۔“ ”کنکریاں“ ”کنکریاں بھول تو نہیں آئے؟“

”ارے۔“ میں نے گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا۔

”یہ رہیں۔“ ڈاکٹر عفت نے کنکریوں کی پوٹلی نکالی۔ ڈاکٹر نے وہ پوٹلی اس  
طرح کلیجے سے لگا کر رکھی ہوئی تھی جیسے وہ کنکریاں پتھر کی نہیں بلکہ سونے کی بنی ہوں،  
جیسے ہم مزدلفہ سے نہیں بلکہ افریقہ کی کسی سونے کی کان سے آرہے تھے۔

صرف ڈاکٹر عفت ہی نہیں تمام زائرین کنکریوں کی پوٹلیاں سینے سے لگائے  
بیٹھے تھے۔ وہ بار بار پوٹلیاں کھولتے کنکریاں گنتے کہ کہیں کم تو نہیں ہو گئیں۔ بار بار  
پوٹلیوں کو سنبھالتے۔

جب ہم منی کے قریب پہنچے تو موٹر رک گئی۔ دیر تک رکی رہی۔ میں موٹر  
سے اتر کر دیکھوں بات کیا ہے۔ دیکھا تو سینکڑوں بسوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ منی کے  
موٹر پر جہاں بہت سی سڑکیں ملتی ہیں۔ ٹریفک جام ہو رہی تھی۔

میں نے واپس آ کر قدرت سے کہا ”یہ ٹریفک جام تین چار گھنٹوں سے پہلے  
صاف نہ ہو گا۔“ اس مقام سے منی صرف چار ایک فرلانگ دور تھا اور فندق الکلی کا  
خیمہ زیادہ سے زیادہ ایک میل ہو گا۔ اس لیے ہم نے پیدل چلنے کا فیصلہ کر لیا۔



جب مجھے یہ علم ہوا کہ ہمیں منی میں تین دن قیام کرنا ہے تو میں گھبرا گیا۔ منی کی اضطراب بھری اذاسی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اب کیا ہو گا؟ میں نے سوچا۔ اس دوسو سوں بھرے شہر میں تین دن کیسے گزریں گے۔

میرے سامنے منی کے ہوٹل والے بزرگ آکھڑے ہوئے۔ ”یہ منی ہے بھائی صاحب!“ وہ بولے ”انتشار کا شہر، تذبذب کا شہر، الحاد کا شہر، پھپھلی بار تو اندھے کے ہاتھ سے لاشی چھوٹی تھی۔ اب کی بار پتہ نہیں کیا ہو جائے۔“

میں چونک پڑا۔ ”یا اللہ کوئی ایسی صورت بنا دے کہ منی کا قیام منسوخ ہو جائے۔“ میرے دل سے منت بھری التجا نکلی ”یا اللہ کام بنانے والے۔“

سڑک سے پیدل چل کر آنے کی وجہ سے قدرت کی طبیعت اور بھی ناساز ہو گئی تھی۔ میراجی چاہتا تھا کہ جا کر پوچھوں کہ اب کیا حال ہے لیکن میں ڈرتا تھا۔ قدرت سے نہیں منی سے ڈرتا تھا۔

نہیں، نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ میں قدرت کے خیمے میں نہیں جاؤں گا۔ منی کے قیام کے دوران میں قدرت سے ملوں گا ہی نہیں۔

لیکن اگر قدرت میرے خیمے میں آگئے تو۔۔۔۔۔؟ کیوں نہ میں اپنے خیمے سے باہر چلا جاؤں شہر میں گھوموں پھروں۔ منی کے اثرات کا جائزہ لوں۔ جمروں کو جا کر کنکر ماروں۔ میں جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ تیار ہوتے ہوئے رہ رہ کر میرے دل میں خیال آتا تھا۔

دعا

میرے اللہ یہ منی کا قیام خیریت سے گزر جائے۔ یا اللہ میں ایک کنزور آدمی ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں ہے اور یہ جمرے جو تو نے اس شہر پر مسلط کر رکھے ہیں۔ یہ بہت فصال ہیں، بہت طاقت ور ہیں۔ میں ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یا اللہ اگر تو میرے لیے منی کا وقوف منسوخ کر دے تو تیرا کیا جائے گا۔ تجھے پوچھنے والا کون ہے؟ یہ دعا نہیں تھی یہ تو میں تیار ہوتے ہوئے کوٹھے کے والی سے باتیں کر رہا تھا۔ بر سبیل تذکرہ قسم کی باتیں۔

مجھے دعا مانگنی نہیں آتی۔ میں صرف دعا پڑھا کرتا ہوں۔ قرآن کریم کی آیات



میں بہت دعائیں ہیں لیکن انہیں پڑھتے وقت مجھے کبھی شعور نہیں ہوا کہ وہ دعائیں ہیں۔ میں نے زندگی میں بارہا سورۃ الحمد پڑھی ہے لیکن کبھی اللہ سے یہ درخواست نہیں کہ اے اللہ مجھے سیدھا راستہ دکھا بلکہ کئی ایک بار ایسا ہوا ہے کہ اهدنا الصراط المستقیم پڑھتے ہوئے دفعتاً مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اللہ کے حضور کیا عرض کر رہا ہوں۔ پھر مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے دعا سمجھ کر منظور فرمائیں اور مجھے سیدھے راستے پر چلا دیں تو کیا ہو گا۔

نہیں، نہیں میرے مولا میں دعا مانگ رہا ہوں۔ کہیں دعا سمجھ کر اسے منظور نہ کر لیتا۔ کہیں مجھے صراط مستقیم کا پابند نہ کر دیتا۔ بے شک صراط مستقیم بڑی عظیم چیز ہے۔ لیکن ابھی نہیں۔ ابھی کچھ دیر کے لیے مجھے جی لینے دے۔

زندگی میں میں ایک بار مسجد بھی گیا ہوں اور وہاں میں نے جناب امام مسجد کو بڑی لمبی چوڑی دعائیں پڑھتے ہوئے سنا ہے جن پر میں نے جملہ نمازیوں کے ساتھ آمین آمین بھی کہا ہے۔ لیکن وہ آمین میں یوں کہا کرتا ہوں جس طرح کسی سیکشن آفیسر کے پروپوزل پر ڈپٹی سیکرٹری ”نو آ بکشن“ کا اظہار کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دعا کے عمل میں دعا جملے کی نہیں بلکہ مانگنے کے فعل کی اہمیت ہوتی ہے۔ اور مانگنے میں منت ہوتی ہے، احساس بے بسی ہوتا ہے، ندامت ہوتی ہے، رقت ہوتی ہے اور جس سے مانگا جائے اس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔

باقی تو جانے

لاہور میں نور بابا کے ڈیرے کو گوشت میا کرنے والے قصائی کی ماں اور بیوی بھاگی بھاگی بابا کے پاس آئیں، کہنے لگیں ”بابا جی چل کر اپنے قصائی کا منہ دیکھ لیجئے۔ وہ آخری دموں پر ہے۔“

جب بابا قصائی کے گھر پہنچے تو اس کی حالت غیر تھی۔ قصائی کی حالت کو دیکھ کر بابا سرکاری انداز میں بولے۔

”یا اللہ یہ قصائی ہمیں اچھا گوشت دیتا ہے اور تیرے بندے اسے کھاتے ہیں۔ تو اگر اسے زندگی دے دے تو تیرے بندوں کو ڈیرے پر اچھا گوشت کھانے کو ملے گا اور تجھ سے پوچھنے والا کوئی ہے نہیں۔ باقی تو جانے تیرا کام جانے۔“



اسی شام قصائی ڈیرے پر آیا اور بولا۔ ”بابا جی اللہ نے فضل کر دیا۔ میں اچھا ہو گیا ہوں۔“

شیخ سعدی

شیخ سعدی سفر کر رہے تھے۔ ساتھ ان کا گدھا تھا۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو رات پڑ گئی۔ سردی کے دن تھے۔ رات بسر کرنے کا ٹھکانا تلاش کرنے لگے۔ گاؤں والوں میں سے کوئی ٹھکانہ دینے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ گھر والوں نے کہا۔ ”میری بیوی درد زہ میں تڑپ رہی ہے بچہ نہیں ہوتا اگر تو دعا کرے تو جگہ دے دوں گا۔“ شیخ سعدی مان گئے۔ انہیں کرا مل گیا۔ پھر انہوں نے کانڈ کے ایک پرزے پر ایک تعویذ لکھا اور گھر والے سے کہا اسے مریضہ کی ناف پر باندھ دے۔ تعویذ باندھتے ہی بچہ ہو گیا۔

اگلی صبح شیخ سعدی تو چلے گئے لیکن گاؤں والوں نے تعویذ سنبھال کر رکھ لیا۔ جب بھی کسی گاؤں والی کو زچگی کی تکلیف ہوتی تو وہ وہی تعویذ۔ جا باندھ دیتے۔ تکلیف رفع ہو جاتی۔

گاؤں کے مولوی کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ ان نے سوچا کہ اگر تعویذ پر لکھی ہوئی آیت کا پتہ چل جائے تو اسے بڑا فائدہ ہو گا۔ مولوی نے جھوٹ موٹ کا بہانہ تراشا اور تعویذ مانگ کر لے گیا۔ اسے کھولا تو لکھا تھا۔

”یا اللہ میں اور میرا گدھا اب آرام سے ہیں۔ ٹھکانہ مل گیا ہے۔ باقی تو جانے اور تیرا کام جانے۔“

صح فری کو تنسی

ایک دن میں نے قدرت سے پوچھا۔ ”دعا کیا چیز ہے؟“ بولے ”دعا صح Frequency کو جاننے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کا نام ہے۔ اگر آپ کے Receiver اور Transmitter ٹھیک ہوں تو دعا ایک میکانکی عمل ہے۔ پھر نا منظور کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔“

پتہ نہیں اس روز منیٰ میں خیمے گھومتے پھرتے ہوئے اپنے اللہ سے سرسری باتیں کرتے کرتے اتفاقاً ”میرے اندرونی ٹرانسمیٹر نے صح Wave Length کیے



پکڑی کہ کوٹھے کے والی سے میری سرسری بات دعابن گئی۔

ابھی میں تیار ہو رہا تھا کہ قدرت میرے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ غنی تھا۔ وہ آفیسر جو سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے شہاب صاحب سے رابطہ رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

”آپ قربانی دینا پسند کریں گے؟“ قدرت نے مجھے پوچھا۔

”اس میں پسند اور ناپسند کا کیا سوال ہے؟“ میں نے جواب دیا۔

”حاجیوں کی بھاری اکثریت قربانی دیتی ہے۔“ وہ بولے۔ ”اگرچہ یہ امر

مرضی پر موقوف ہے۔“

”تو میں بھی دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ میری زندگی کی پہلی قربانی ہوگی۔“

”کیا آپ اپنے ہاتھوں سے قربانی دینا پسند کریں گے؟“

”میں سمجھا نہیں؟“

”میری طبیعت اچھی نہیں“ قدرت نے کہا۔ ”میں نے غنی صاحب کو رقم

دے دی ہے۔ یہ قربانی کا انتظام کر دیں گے۔ اگر آپ خود قربانی کرنا چاہتے ہیں تو غنی

صاحب کے ساتھ قربان گاہ میں چلے جائیے ورنہ انہیں رقم ادا کر دیجئے۔“

میں نے قربانی کی رقم غنی صاحب کے حوالے کر دی۔

غنی کے جانے کے بعد قدرت بولے۔ ”ہمارا ارادہ ہے کہ مکہ شریف میں جا

قیام کریں۔ حج کے ارکان اور واجبات ادا کرنے کے لیے ہم روز منی آسکتے ہیں۔ آپ

چاہیں تو ہمارے ساتھ مکہ معظمہ چلیں، چاہیں تو ہمیں رک جائیں۔ جیسے آپ کی

مرضی۔“

میرا تجربہ ہے کہ جب کبھی ہماری دعا قبول ہو جائے تو ہمیں اس بات پر خوشی

نہیں ہوتی کہ دعا قبول ہو گئی اور خوشی نہ ہو تو احساس شکر گزاری پیدا ہونے کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ الٹا ہمیں یہ غم لگ جاتا ہے کہ قبولیت کے اس لمحے میں ہم نے کچھ اور

کیوں نہ مانگ لیا۔

لیکن اس روز منی میں پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میری دعا قبول ہو گئی۔

منی کا قیام میرے لیے اللہ نے منسوخ کر دیا۔ میرا دل شکر گزاری کے جذبات سے

چمک اٹھا۔



میرے دل سے جمروں کا خوف دور ہو گیا۔ اگر منی پر جمروں کا تسلط ہے تو پڑا ہو۔ میرے اللہ بھی تو منی میں موجود ہیں۔

میں نے خوشی خوشی کنکروں کی پوٹلی اٹھائی اور جمروں کی طرف چل پڑا۔ منی کا بازار کچا کھج بھرا ہوا تھا۔ کھوے سے کھوا چل رہا تھا۔ زائرین کے جوش و خروش میں تقدیس کا عنصر نہ تھا بلکہ خالی شدت تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ پتھر مارنے کے لیے جا رہے تھے۔ انہوں نے کنکروں کی پوٹلیاں سینے سے لگا رکھی تھیں۔ ان کی بھویں تنی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر تیوریاں تھیں۔ آج پہلی مرتبہ انہیں انتقام لینے کا موقع ملا تھا۔ اس سے انتقام لینے کا موقع جس نے زندگی بھر انہیں بسکایا تھا۔ ان کے دلوں میں دسو سے پیدا کیے تھے۔ شر کا خیر اٹھایا تھا۔

کئی ایک زائرین تو جوش میں آستین چڑھا رہے تھے۔ کئی پہلوانوں کی طرح اپنے بازو ٹھونک رہے تھے۔

### انتقامی غیظ و غضب

جوں جوں حجرۃ العقبہ قریب آتا گیا۔ زائرین کا شور بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ جب میں حجرہ کے پاس پہنچا تو غیظ و غضب کا عجیب منظر نظر آیا۔ زائرین کے چہرے تسمن اور حقارت سے سو بے ہوئے تھے۔ غصے سے ان کے منہ سرخ ہو رہے تھے۔ کوئی حجرہ کو گھونے دکھا رہا تھا۔ کوئی اس پر تھوکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ بیشتر لوگ اسے منقلقات سے نواز رہے تھے۔ ترے فلاں کے فلاں کا بھلا۔ ایسے بھی تھے جو ساتوں کنکریاں مار چکے تھے لیکن ان کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور اب وہ اپنے دل کی تسکین کی خاطر پاؤں سے جوتے اتار کر حجرے کو دھڑا دھڑ پیٹ رہے تھے۔

ہجوم کا یہ جوش و خروش اگرچہ بے معنی نظر آتا تھا لیکن وہ اس قدر پر اثر تھا کہ جلد ہی اس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

دفعاً مجھے یاد آیا کہ منی میں پہلے قیام پر جمار نے اندھے کے ہاتھ سے لاشی پھیننے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے مجھے قدرت سے جدا کرنے کی چال چلی تھی۔ اللہ کا حکم تو خیر ٹھیک ہے لیکن اب تو معاملہ ذاتی رنگ اختیار کر چکا تھا۔

میں نے غصے کے عالم میں کنکروں کی پوٹلی کھولی۔



ارے۔ ان کنکریوں کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اتنی چھوٹی کنکریاں یہ کیا ضرب لگائیں گی؟ اس وقت میرا جی چاہا کہ کوئی بڑا سا پتھر اٹھا لوں اور جمرہ کو ماروں۔ شاید میں پتھر مار پٹنے سے گریز نہ کرتا۔ مشکل یہ تھی کہ جمرہ کے گرد بہت بڑا جھوم تھا۔ زائرین کے سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ اگر پتھر کسی کے سر پر جا لگا تو۔

جب سے میں نے سر زمین حجاز پر قدم رکھا تھا۔ میں نے کسی عورت کو غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر عجیب قسم کا نور ہوتا تھا۔ ان کے انداز میں نسائی شدت نہ تھی۔ صبر، تحمل اور سکون۔ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ عورتیں ہیں۔

لیکن اس روز جمار کے قریب صبر و تحمل کی طبع اتر چکی تھی۔ ایک عورت جمرے کو کھلے دکھا رہی تھی۔ دوسری بچے دے رہی تھی۔ تیسری بجا دکھاتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہہ رہی تھی ”وے در پٹھے منہ تیرا۔“

### جرمۃ العقبہ

”یا علی“ کا نعرہ سن کر میں چونک اٹھا۔ دیکھا تو ایک جوان زائر فاتحانہ انداز میں جمرہ پر چڑھا ہوا تھا اور دھڑا دھڑا سے جوتوں سے پیٹ رہا تھا۔

میں نے اس نوجوان کی طرف حسرت سے دیکھا چونکہ میرے لیے وہاں پہنچنا بے حد کٹھن تھا۔ اس عمل میں دھکا بازی، موٹھے چلانے اور داؤ پتچ کھینے میں دسترس کی ضرورت تھی۔ میرے پاس ان چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے دوبارہ پوٹلی کھولی ان میں سے سات موٹی موٹی کنکریاں چن کر مٹھی میں دبائیں اور جمرۃ العقبہ کی طرف بڑھا۔

چونکہ اس وقت میں جمرہ سے خاصے قاصطے پر تھا۔ اس لیے کنکری جمرہ تک پہنچانے کے لیے میں مڑا اور پھر جھوم کی طرف بھاگا۔ جس طرح کرکٹ میں باؤ لر گیند پھینکنے سے پہلے مڑ کر دوڑ لگاتا ہے۔ جھوم کی حد تک دوڑ کر میں نے پورے زور سے کنکری جمرے کی طرف پھینکی اور پھر ایڑیاں اٹھا کر دیکھنے لگا کہ وہ نشانے پر لگی بھی ہے کہ نہیں؟

دھنستا ”میرے ماتھے پر زور سے ایک کنکر آکر لگی۔“

ارے، میں گھبرا گیا۔ پتھر تو میں نے مارا تھا پھر وہ مجھے آکر کیسے لگا۔ میرے



آگے کھڑے زائرین کا مارا ہوا پتھر مجھے کیسے لگ سکتا تھا۔ میرے پیچھے کھڑے زائرین کا پھینکا ہوا پتھر میرے سر کے پچھلے حصے پر لگتا، پیشانی پر نہیں۔ میں بوکھلا گیا۔

پھر مزید غصے میں دوڑ لگا کر میں نے دوسرا پتھر مارا۔ معاً ایک پتھر میرے گال پر آگیا۔ جب میری ناک پر تیسرا پتھر لگا تو میں سوچنے لگا، کیا میں جمرہ کو پتھر مار رہا ہوں یا جمرہ مجھے پتھر مار رہا ہے؟

کیا وہ مجھے اس بات کا احساس دلا رہا تھا کہ وسوسے ڈالنے والا، نافرمانی پر مائل کرنے والا، بہکانے والا، خود میرے ہی اندر موجود تھا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں بہکنے والا اور بہکانے والوں یارانہ لگائے بیٹھے تھے، گٹھ جوڑ کیے بیٹھے تھے۔ ان کے اس گٹھ جوڑ سے میرے سوا ساری کائنات واقف تھی اور شاید درپردہ میں خود بھی واقف تھا لیکن اپنی نظر میں اپنی عزت بچائے رکھنے کے لیے میں نے نہ جاننے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔

جب مجھے چوتھا کنکر لگا تو گویا میری نگاہ سے پردہ ہٹ گیا۔

### میری طرف دیکھو

میں نے چلا کر ہجوم کو مخاطب کیا۔ ”بھائیو! جمرہ وہ نہیں ہے، میں ہوں، میں۔ مجھے کنکر مارو، مجھے، اس بے جان کو کنکریاں مارنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں نے بنی نوع انسان کو بہکایا ہے، میں نے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کیے ہیں، میں نے کفر و الحاد کا بیج بویا ہے۔“

”میری طرف دیکھو، میں دانش ور ہوں، میں نے شک کو علم کی بنیاد قرار دیا ہے۔“

”میری طرف دیکھو، میں ادیب ہوں، میں نے نئی اور انوکھی بے ادبیوں پر جدید ادب کی تعمیر کی ہے۔“

”میں فلسفی ہوں، میں نے چون و چرا کے خوبصورت ٹائلوں سے ایوان فلسفہ کی تعمیر کی ہے۔“

”میں سائنسی انداز کا مفکر ہوں، اور میں نے فکر کو سیکولر ازم کی حدوں سے باہر نکلانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔“



"میں پڑھا لکھا فرد ہوں" میں نے کفر کو تہذیب کی بنیاد قرار دے رکھا ہے اور ایمان کو جہالت کی نشانی۔"

"بھائیو! مجھے کنکریاں مارو" میں جمرہ ہوں" مجھ سے ڈرو نہیں کہ میں تم میں سے ہوں۔"

میں وہاں کھڑا چلا رہا تھا لیکن میرے طلق میں آواز نہ تھی اور ہجوم غصے اور غیظ و غضب سے جمرہ کو پتھر مارنے میں مصروف تھا۔

جمرہ العقب

جمرہ العقب کے لیے اس وقت میں جمرہ سے غصے اور غیظ کے ساتھ اس کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔

جمرہ العقب کے لیے اس وقت میں جمرہ سے غصے اور غیظ کے ساتھ اس کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔



## بال جنجال

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ حج کرنے جائیں تو ساتھ ایک قینچی لے جانا۔  
مت بھولے۔

اگر مجھ میں تلقین شاہ کی طرح تفصیلی مشاہدے کی صلاحیت موجود ہوتی تو میں ایک کتابچہ لکھتا "ہدایت نامہ حج"۔ جس میں یہ درج کرنا کہ حج ہو جاتے وقت ساتھ کیا کچھ ضرور لے کر جائیے اور کیا کچھ ہرگز ساتھ نہ لے کر جانا۔

### کیمبرہ اور دل

مثال کے طور پر حج پر جانے سے پہلے اچھی طرح سے تسلی کر لینی چاہیے کہ کہیں آپ اپنے ساتھ کیمبرہ تو نہیں لے جا رہے۔

ہمارے حج پر جانے سے ایک سال پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست جمانگیر نے فون کیا۔ کہنے لگے۔ "میں اللہ کے فضل و کرم سے حج کر کے لوٹا ہوں اور اپنے ساتھ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور دیگر مقدس مقامات کی رنگین تصویریں لایا ہوں۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو میں آج شام کو آپ کے ہاں آ جاؤں۔"

میں نے قدرت اللہ شہاب سے بات کی۔ وہ بولے۔ "سبحان اللہ شام گزارنے کے لیے اس سے بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر عفت کہنے لگیں۔ "میں بھی اس محفل میں شریک ہوں گی۔"

شام کو حاجی جمانگیر تشریف لے آئے۔ وہ سکرین، پروجیکٹر، تصویریں اور دیگر سامان ساتھ لائے۔ آتے ہی انہوں نے تصویریں دکھانی شروع کر دیں اور ساتھ ساتھ ان تصویروں سے متعلق کنٹری کرنی شروع کر دی۔

ان کی ہر تصویر کی کمپوزیشن اتنی خوبصورت تھی۔ رنگ اتنے دلکش تھے کہ



ہم تینوں مہوت ہو کر دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔  
 دو گھنٹے کے بعد اتفاقاً ڈاکٹر عفت کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور وہ اس  
 بات پر مصر ہوئیں کہ باقی تصویریں اس وقت دکھائی جائیں جب وہ فارغ ہو جائیں۔  
 میں نے حاجی جہانگیر سے پوچھا کہ کتنی تصویریں باقی رہ گئی ہیں۔ جہانگیر نے جواب دیا کہ  
 ابھی تو بمشکل آدمی تصویریں دکھائی ہیں۔ آدمی سے زیادہ باقی ہیں۔ خیر محفل ملتوی ہو  
 گئی۔ جہانگیر اپنا سامان لے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں بڑی دیر تک  
 ان تصاویر کے گن گاتا رہا۔ واہ واہ کرتا رہا۔ قدرت میری باتیں غور سے سنتے رہے۔  
 آخر میں وہ بولے "معلوم ہوتا ہے جہانگیر صاحب حج کے دوران تصویریں ہی کھینچتے  
 رہے۔"

معا "میری نگاہ سے گویا پردہ ہٹ گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ ارض پاک پر  
 جہانگیر تصویریں کھینچنے میں شدت سے مصروف ہیں۔ ان کی نگاہ مناظر پر لگی ہے۔ توجہ  
 کمپوزیشن پر مرکوز ہے۔ آنکھ ویو فائنڈر میں پھنسی ہے اور دل پر کیمرے کے لینز کا پردہ  
 پڑا ہوا ہے۔ اور حرمین حیرت سے پتھر کی دیواریں بنے کھڑے ہیں اور کوٹھے کا والی منہ  
 میں انگلی ڈالے جہانگیر کا منہ تک رہا ہے۔  
 پتہ نہیں کس کا شعر ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار  
 جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی  
 شعر کے نفس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر پہلی مرتبہ حرمین شریف میں گیا  
 تو وہ اپنے ساتھ کیمرہ لے گیا تھا۔ واپسی پر اسے اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ ازالہ  
 کرنے کے لیے دوسری مرتبہ وہ کیمرے کی جگہ دل لے کر حاضر ہوا۔  
 بہر طور میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اگر آپ حج یا عمرہ کے لیے حاضری دیں تو  
 اللہ کے واسطے اپنے ساتھ کیمرہ نہ لے جائیے گا۔

لنگوٹی

وزارت مواصلات مغربی پاکستان نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔ نام ہے "منفصل ہدایات برائے عازمین حج۔" اس کتابچے کے صفحہ ۴۴ پر قابل عمل ہدایات کی



ذیلی سطر کے تحت شق نمبر ۳ میں درج ہے کہ:

”حکومت کے مقرر کردہ اصول کے تحت اپنے ساتھ راشن ضرور لے جائیں۔ خواہ آپ درجہ اول کے مسافر کیوں نہ ہوں۔ چونکہ حجاز میں اشیائے خوردنی گراں ہیں۔“

بے شک حجاز میں اشیائے خوردنی گراں ہیں، لیکن اگر آپ راشن ساتھ لے جائیں گے تو یقین جاتے ہیں یہ احتیاطی اقدام آپ کو بہت منگنا پڑے گا۔

اگر آپ آٹا ساتھ لے جائیں تو اس کے ساتھ آپ کو ایک ایسا برتن لے جانا پڑے گا جس میں اسے گوندھا جاسکے۔ پھر ایک توالیے جانا پڑے گا جس پر روٹی پکائی جاسکے۔ ساتھ ہی ایک چولہا لے جانا پڑے گا کہ روٹی پکانے کے لیے آگ جلائی جاسکے۔ پھر مٹی کے تیل کی ضرورت پڑے گی جو آگ جلانے میں مدد دے۔ پھر کسی خاتون کی ضرورت لاحق ہو جائے گی جو روٹی پکاسکے۔ پھر۔۔۔۔۔

نقل ہے کہ ایک نائے فقیر کو لوگوں نے کہہ سن کر لنگوٹی پہنا دی۔ حجرے میں چوہے بہت تھے۔ انہوں نے رات کے وقت لنگوٹی کو منہ مارنا شروع کر دیا۔ کسی نے کہا کہ چوہوں سے بچاؤ کے لیے ایک بلی پال لو۔ بلی پالی تو اس کے لیے دودھ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ ایک ہی خواہ نے مشورہ دیا کہ دودھ کی مسلسل سپلائی کے لیے ایک بکری خرید لی جائے۔ بکری خرید لی تو اس کے لیے چارہ فراہم کرنے کا بندوبست کرنا پڑا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ پاس ہی جنگل ہے روز جا کر ہی شبنیاں کاٹ کر لے آیا کیجئے۔ فقیر نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔ ایک روز جب وہ درخت پر چڑھ کر شبنیاں کاٹ رہا تھا تو پاؤں پھسلا اور نیچے آگرا۔۔۔۔۔ عقیدت مندوں کو پتہ چلا تو وہ فقیر کو اٹھا کر گھر لے آئے۔ جب فقیر کو ہوش آیا تو اس نے اٹھتے ہی لنگوٹی اتار پھینکی بولا۔ ”سارا فساد لنگوٹی کا ہے۔ نہ ہم لنگوٹی پہنتے نہ چوہے منہ مارتے نہ بلی پالنی پڑتی نہ بکری خریدتے نہ چارہ لانے کے لیے جنگل میں جانا پڑتا نہ پاؤں پھسلا نہ ہم اس حالت کو پہنچے۔ میاں یہ سب فساد لنگوٹی کا ہے۔ یہ رہی فساد کی جڑ تمہاری لنگوٹی۔“

اہتمام

حرمین میں میں نے راشن کی لنگوٹی باندھے ہوئے ایک نہیں کئی ایک قافلے



دیکھے ہیں۔ یہ قافلے یا تو معربوں کے تھے اور یا ایرانیوں کے۔ ہر ایسا قافلہ دو بسوں پر مشتمل تھا۔ ایک بس زائرین کی، دوسری میں مطبخ کا سامان اور لوازمات، دیکھیں، دیکھے، چولہے، گیس کے سلنڈر، پلاسٹک کی پلیٹیں، چمچے، چھریاں، کانٹے، چائے کے سیٹ، نیپکن، چاول، آٹا، آئیس بکس اور نہ جانے کیا کیا۔

جہاں کہیں پڑاؤ آتا۔ دریاں اور غالیچے بچھ جاتے، چولہے جل جاتے، مرغ پلاؤ کی دیکھیں چڑھ جاتیں۔ دیکھوں میں سویٹ ڈش کا اہتمام شروع ہو جاتا۔ پھر دستر خوان بچھ جاتے۔ پلیٹیں کھنکتیں، چمچے اور کانٹے بجنے لگتے۔

پتہ نہیں اس اہتمام اور بندوبست کا اہل قافلہ پر کیا اثر مرتب ہوتا ہو گا۔ البتہ راہ گیروں یا دیکھنے والوں پر جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ظاہر تھی۔

راہ گیر یہ منظر دیکھ کر رک جاتے، پہلے تو حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی رہ جاتیں چونکہ افراط اس ماحول میں عجیب سی لگتی تھی۔ پھر لذت طعام کا سحر چلتا۔ آنکھوں میں ہوس لہراتی۔ منہ میں پانی بھر آتا اور وہ بھول جاتے کہ وہ زائر ہیں اور دیر تک وہ وہاں بت بنے کھڑے رہتے۔ افراد کا یہ منظر انہیں حرمین سے نکال کر کسی واجد علی شاہ کے مطبخ کی دہلیز پر لے جا کر کھڑا کر دیتا۔

پرہیزگار متقی راہ گیر نظر بچا کر گزر جانے کی کوشش کرتے پھر بھی تقاضائے بشری کی زنجیر کی وجہ سے ان کی چال مدہم پڑ جاتی۔

### سائیں حلوہ

مجاہدہ کے متوالے اس منظر کو دیکھتے تو ان کی کیفیت سائیں حلوہ کی یاد دلاتی۔

سائیں حلوہ۔ تقسیم سے بہت پہلے انبالے کا ایک جانا پچانا فقیر تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے جنماد اس پوری والے کی دکان پر جا کھڑا ہوتا۔ وہاں سے وہ دو آنے کا حلوہ خرید کر اسے دو نے میں ڈال اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ لیتا۔ پھر وہ سارے شہر میں چکر لگاتا۔ بار بار حلوے کے دو نے کی طرف دیکھتا۔ پھر قہقہہ مار کر ہنستا۔ ”ہوں تو تو حلوہ کھائے گا۔ حلوہ کھائے گا تو۔“ وہ قہقہہ مار کر کہتا۔ اس کے قہقہوں میں بلا کا تمسخر ہوتا تھا۔ اس کے اس جملے میں جو وہ سارا دن بار بار دہراتا رہتا تھا کہ ”تو حلوہ کھائے گا۔“ نکواری دھار ہوتی تھی۔



سازادن سائیں حلوه دوناهتیلی پر رکھے سارے شہر میں گھومتا رہتا تھا۔ وہ بار بار ”تو حلوه کھائے گا۔“ دہراتا اور قہقہے مارتا رہتا۔ پھر جب شام پڑ جاتی تو کہتے اس کے گرد جمع ہو جاتے پھر وہ آخری مرتبہ نہ جانے کس سے پوچھتا ”تو حلوه کھائے گا۔“ اور پھر حلوه کا دوناتوں کو ڈال دیتا۔ اس وقت اس کا طویل قہقہہ سارے بازار میں گونجنے اور ہنسنے ہنسنے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

### بندوبستی قافلے

منی میں ایک ایسے ہی اہتمامی قافلے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک روز جب میں شہر منی کے پختہ حصے میں ایک عوامی مسافر خانے میں بیٹھا تھا تو دفعتاً ”برآمدے میں شور و غوغا بلند ہوا۔ پھر ایک اہتمامی بندوبستی قافلہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ قافلہ بیس پچیس افراد پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ سب کے سب بڑے مہذب اور متمدن تھے۔ ہال کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے ”اسلام و علیکم“ کہا اور پھر کمرے میں مقیم زائرین کی خدمت میں بڑے ادب سے درخواست کی کہ اگر وہ کمرے کا ایک حصہ ان کے لیے وقف کر دیں تو نوازش ہوگی۔ اس وقت کمرے میں مقیم زائرین کی تعداد بہت کم تھی۔ لہذا وہ سب سمٹ کر ایک طرف ہو گئے اور اہتمامی بندوبستی قافلے کے لیے جگہ بن گئی۔

پھر خدام دوڑے۔ دریاں بچھ گئیں۔ ان پر سفید چادروں کا فرش بچھا دیا گیا۔ گاؤتکیے لگا دیے گئے۔ ہاتھ کے پکھے بانٹ دیے گئے۔ اور وہ قافلہ جس میں خواتین بھی شامل تھیں، آرام سے بیٹھ گیا۔

انہیں بیٹھے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک بہت بڑا سا وار کمرے میں لایا گیا۔ جس کے ساتھ پیالوں اور چمچوں کا ڈھیر تھا اور وہ سب سفر کی تسکین دور کرنے کے لیے قبوہ پینے لگے۔

اس کمرے میں زیادہ تر عوامی لوگ مقیم تھے۔ یہ لوگ سب غیر اہتمامی لوگ تھے۔ جب کھانے کا وقت آتا تو کوئی سندور کی روٹی پر چٹنی رکھ لیتا۔ کوئی تربوز کی پائیک خرید کر لے آتا۔ کوئی روٹی پر چار کھجوریں رکھ لیتا۔ کوئی اجار کے ساتھ روٹی کھاتا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نمک اور پانی کے ساتھ روٹی کھاتے۔



یہ سب لوگ زائر تھے۔ وہ سب پانچ نمازیں پڑھتے۔ سارا دن اور رات کو  
بیشروقت تسبیحیں چلاتے یا قرآن کریم پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ روٹی کھانا ان  
کے نزدیک ایک غیر اہم کام تھا۔

اس روز جب دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو اہتمامی قافلے کے خدام پہلے  
مرغ پلاؤ کی بھری ہوئی چوٹی دار قابیں کمرے میں لے آئے۔ پھر شور بے دہی، سلاو  
کے برتن آنے شروع ہوئے اور آخر میں سویٹ ڈش کے طشت، اس افراط اور اہتمام  
کو دیکھ کر عوامی زائر کلمہ پڑھتے ہوئے یوں اٹھ کر بیٹھ گئے جیسے صور اسرائیل پھونک دیا  
گیا ہو۔

### تلذذ کا اثر دہا

ان کی تسبیحیں چلتے چلتے رک گئیں۔ باقاعدگی سے ہلتے ہوئے ہونٹ اٹک  
گئے۔ ان کی آنکھیں گھبرا گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کدھر دیکھیں، کدھر نہ  
دیکھیں۔

وہاں ایک عظیم کایا پلٹ عمل میں آگئی جیسے سکون اور تقدیس بھرے فردوس  
میں افراط کا اثر دہا آگھا ہو۔ اس منظر کا مجھ پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ اگر میرا بس چلے تو  
میں راشن ساتھ لے کر جانے والے اہتمامی بندوبستی قافلوں کا سر زمین حجاز میں داخلہ  
بند کرادوں۔ اہتمام اور افراط اس ماحول میں یوں لگتے ہیں جیسے فقیر کی گذری پر  
زربفت کا پیوند لگا ہو۔ پتہ نہیں کس اصول کے تحت یہاں زمین پر بیٹھ کر چٹنی روٹی اور  
تربوز روٹی کھانا ہی زیب دیتا ہے۔

اہتمام کی تو وہاں گنجائش ہی نہیں۔ آپ اہتمام کی جھنجھٹ میں پڑ گئے تو سمجھ  
لیجئے ماحول سے کٹ گئے۔

وہاں پکی پکائی روٹی سستی اور عام ملتی ہے اور حرم شریف کے دیوار تلے بیٹھ  
کر چٹنی روٹی کھانے میں اتنی ہی لذت حاصل ہوتی ہے جتنی مدینہ منورہ میں جالی پکڑ کر  
درود شریف پڑھنے میں۔

بلے بلے بلے

میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ جب آپ حج کے لیے جائیں تو اپنا علم ساتھ لے کر



نہ جائیں۔

”علموں بس کریں اویار“

”آپ چاہتے ہیں کہ خانہ کعبہ میں حاضری دیتے وقت آپ پر ”بلے بلے“ کی کیفیت طاری ہو جسے بلے شاہ نے قلم بند کیا ہے

”جے میں دیکھاں تیرے ولے۔ بلے بلے بلے۔“

تو اپنے پلے علم باندھ کر نہ لے جائیں، بلکہ پلا جھاڑ کر جائیں۔

اگر آپ علم، شوق، تحقیق یا طلب علم ساتھ لے کر جائیں گے تو آپ کا بھی وہی حشر ہو گا جو شبلی بی کام کا ہوا۔

شبلی بی کام میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ اگر ان کی طلب علم کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت ہی اچھے آدمی ہیں۔

حال ہی میں شبلی صاحب نے فریضہ حج ادا کیا ہے اور واپسی پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔

حج پر جانے سے پہلے اور واپسی کے بعد میں نے حج پر بہت سی کتابیں پڑھی ہیں لیکن شبلی جیسی کام کی کتاب میری نگاہ سے نہیں گزری۔ شبلی صاحب کی اس کتاب میں حج کے ہر پہلو پر مفصل معلومات موجود ہیں۔ تاریخی، جغرافیائی، تمدنی، اسلامی، شرعی۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ صرف ایک خامی ہے وہ یہ کہ اس کتاب کا نام غلط رکھا گیا ہے۔ اس کا نام ”رب کعبہ کے حضور“ نہیں بلکہ حج انسانیٹکلو پیڈیا ہونا چاہیے۔

شبلی بی کام

اندازہ ہے کہ شبلی صاحب جب عازم حج ہوئے تو انہوں نے اپنا سارا کام سارا علم پلے باندھ لیا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ طلب علم کی ایک بھاری گٹھڑی سر پر اٹھالی۔ پھر شوق تحقیق کی چھڑی ہاتھ میں اٹھائی۔ پھر وہ رب کعبہ کے حضور چل پڑے۔ شبلی جی، رب کعبہ کے حضور بھلا اس طرح جایا کرتے ہیں؟

نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ حرم شریف کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور ان کی نگاہوں نے دیواروں کی طرف دیکھا تو علم، جذبہ تحقیق اور طلب علم نے سپولیوں کی طرح سر اٹھائے۔



یہ دیواریں اتنے گز اونچی ہیں۔ اوپر سے اتنے فٹ موٹی ہیں۔ ڈیوڑھی کی محراب فلاں طرز تعمیر سے اخذ کی گئی ہے۔ سنگ مرمر کے رنگ اور ریشوں سے ظاہر ہے کہ فلاں ملک سے درآمد کیا گیا ہے۔ حرم شریف میں داخل ہوئے تو انہوں نے خانہ خدا سے کہا:

”آئی بیگ یور پارڈن‘ ذرا ٹھہریے پہلے میں مسجد الحرام کی محرابیں گن لوں۔ مسجد کے صحن کا رقبہ کیا ہو گا۔ کتنے زائرین نماز پڑھ سکتے ہیں۔“

دنیا میں ایسے مجاہد بھی ہیں جو آپ کو، ان کو، مجھ کو، سب کو اور آنے والی نسلوں کو یہ مقدس معلومات بہم پہنچانے کے لیے رب کعبہ کے حضور خود حاضری دینے کی عسرت کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔

خانہ خدا پر نظر پڑی تو چونکے، ارے! اس کو ٹھے کی اونچائی چوڑائی اور لمبائی کا تناسب کتنا غیر معمولی ہے۔ اور یہ جو دروازہ خانہ خدا میں کھلتا ہے۔ یہ فرش سے اتنا اونچا کیوں ہے۔ کتنا اونچا ہو گا بھلا۔

ذرا ٹھہریئے یہ جو کبوتر مسجد پر اڑ رہے ہیں، کیا یہ واقعی مسجد پر بیٹ نہیں کرتے اور خانہ خدا کے اوپر پہنچ کر اذان کی سمت بدل لیتے ہیں۔ کیا یہ احترام کی وجہ سے ہے یا کبوتروں کی نسلی عادت کی وجہ سے ہے۔

اگر آپ حج پر جائیں تو زیارتوں کے طواف میں نہ پڑ جائیے گا۔ ورنہ طلب علم اور شوق تحقیق آپ کے پاؤں میں چکر ڈال دے گی۔ زیارتیں آپ کے لیے ایسا صحرائے اعظم بن جائیں گی کہ آپ صحرا نوردی کو منزل سمجھنے لگیں گے۔

”رب کعبہ کے حضور“ کی ایک جلد لے کر میں قدرت اللہ شہاب کے پاس گیا۔ میں نے کہا۔ ”حج پر اس سے بہتر اور اتنی مکمل کتاب میں نے آج تک نہیں دیکھی۔“ قدرت نے کتاب کو دیکھ کر کہا ”ہاں میں نے اسے پڑھا ہے، بہت خوب کتاب ہے۔“ میں نے کہا ”پڑھی ہے تو یہ بتائیے کہ کیا اس کتاب کا نام ٹھیک بیٹھتا ہے۔ کیا اس کتاب میں رب کعبہ میں حاضری ہے؟“

دہکا کو نکلے

”آپ حاضری کو کیا سمجھتے ہیں؟“ قدرت نے پوچھا۔



”میں اسے ایک کیفیت سمجھتا ہوں Eestasy کی کیفیت۔ جیسے ”حال“ ہوتا ہے۔“

قدرت نے کہا ”مجھے غوث علی شاہ صاحب کی بات یاد آگئی۔“  
 ”ایک روز میرا تعلق نے غوث علی شاہ صاحب کی خدمت میں عرض کی۔ شاہ سلیمان صاحب تو نسوی ابتدائی ایام میں بہت حال کھیلا کرتے تھے لیکن آخری ایام میں انہیں حال آنا بند ہو گیا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔“ غوث علی شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ”جب تک کوئلہ دہک نہیں جاتا، چٹخا اور دھواں دیتا رہتا ہے، لیکن جب آگ اس کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور وہ ہم رنگ آتش ہو جاتا ہے پھر نہ وہ چٹخا ہے نہ دھواں دیتا ہے۔“

میرا سارا بتایا محل دھڑام سے گر کر ڈھیر ہو گیا۔ ایک چھوٹا سا کنکر مار کر دوسروں کے عظیم الشان محل گرا کر ڈھیر کر دینے میں قدرت کو بڑا ملکہ حاصل ہے۔  
 جب قدرت صدر ایوب کے سیکرٹری تھے تو صدر ایوب اکثر مسکرا کر کہا کرتے:

Must you throw a brick at me every time when I say something.

”کیا یہ ضروری ہے کہ جب بھی میں کچھ کہوں تو تم جواب میں مجھے پتھر دے مارو۔“

اس وقت میں نے شدت سے محسوس کیا کہ صدر ایوب زمانے کے ہاتھوں کس قدر ستائے ہوئے تھے۔

تواتر

پھر مجھے وہ دن یاد آ گیا، جب صدر ایوب اپنے وزراء کے ساتھ کانفرنس میں مصروف تھے۔ زیر بحث کوئی قانونی نکتہ تھا۔ صدر ایوب نے برسبیل تذکرہ کہا۔  
 I am the final appealant authority۔ ”میں اپیل پر آخری فیصلہ کرنے کا مجاز ہوں۔“

قدرت یوں سودباز اٹھے جیسے جماعت میں کوئی نالائق لڑکا استاد سے خطاب



کرنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے بولے۔ ”سر آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ میں نہیں۔  
آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔“

صدر ایوب نے تہقیر مارا۔ بولے ”وہ تو Implied ہے۔ اسے ہر بار زبان  
پر لانے کی کیا ضرورت ہے؟“

قدرت نے کہا۔ ”سر اسے بار بار زبان پر لانے کی اشد ضرورت ہے۔ تو اثر  
نہ ہو تو یہ حقیقت ذہن سے نکل جاتی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ صدر نے کہا۔

”سر یقین جانیے اتنی سی بات ذہن میں رکھنے سے بہت فرق پڑتا ہے۔“ خیر

----- یہ تو سارا ہی جملہ معترضہ تھا۔

اصل بات تو یہ تھی کہ جب آپ حج پر جائیں تو اپنے ساتھ ایک قینچی ضرور  
لے جائیں۔ ورنہ آپ کا بھی وہی حشر ہو گا جو میرا ہوا تھا۔

## سیلون

منی سے واپسی پر مکے کے راستے پر جگہ جگہ حاجی سر جھکائے بیٹھے تھے اور  
ناکندہ تراش حجام اپنے استروں سے ان کی کھوپڑیوں کا آلیٹ بنا رہے تھے۔  
فندق الکلکی پہنچ کر قدرت تو ناسازگی طبع کی وجہ سے بستر پر لیٹ گئے۔ ڈاکٹر  
عفت ان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئیں اور میں حجام حجام کے نعرے لگاتا ہوا باہر  
نکل گیا۔

سڑک پر جگہ جگہ حجاموں کے گرد حاجیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں اس  
روز مجھ میں نفاست طبع کیسے جاگ اٹھی۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے حجاموں کے  
سامنے بیٹھنے کو جی نہ چاہا۔ کسی معقول سیلون کی تلاش میں سارے شہر میں مارا مارا پھرتا  
رہا۔ دو ایک دوکانیں نظر آئیں تو ان کے باہر بالکل ایسا ہی ہجوم تھا جیسے نئی پنجابی قلم  
لگنے پر بنگ آفس کے گرد مار دھاڑ قسم کی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔  
پتہ نہیں اس روز میرے ایمان کو کیا ہوا تھا۔

پتہ نہیں اس روز میرے دل پر پتھر کیوں پڑ گئے تھے۔ سیلون کی تلاش میں میں  
گھنٹوں مسلسل حرم شریف کے گرد چکر کاٹتا رہا۔



پتہ نہیں اس روز مجھ میں اتنا دل گرہہ کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ میں حرم شریف کے دروازے کے سامنے سے گزر جاتا۔ دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھ پر اتنا جذبہ بھی طاری نہ ہوا کہ میں بال کٹوانے کی تفصیل کو بھول جاتا۔

پتہ نہیں کیوں بال کٹوانے کی تفصیل اس روز اتنی بڑی دیوار کیسے بن گئی۔ اتنی بڑی رکاوٹ کہ اس نے حرم شریف کے کھلے ہوئے دروازوں کو مجھ پر بند کر دیا۔

”شواط میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکے۔

”استلام“ میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکا۔

”ملتزم“ میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکا۔

”رمی“ میرے رستے کی رکاوٹ نہ بن سکی لیکن حجامت پہاڑ بن کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔

پاگل ای اوئے

مجبور ہو کر میں ایک سیلون کے سامنے کینو میں کھڑا ہو گیا۔

وہ بہت لمبا کینو تھا۔ اس کینو میں میں بہت پیچھے کھڑا تھا۔ میں وہاں کھڑا رہا، کھڑا رہا، کھڑا رہا۔

صدیاں بیت گئیں۔

حتیٰ کہ کھڑا کھڑا بھول گیا کہ میں وہاں کیوں کھڑا تھا۔

کینو ریٹکتا رہا، ریٹکتا رہا، اتنی دیر ریٹکتا رہا کہ میں بھول گیا کہ مجھے جلدی ہے۔ مجھے جانا ہے۔ قریب ہی کوئی منڈیر سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے کہ ابھی پہنچا ہے یا نہیں۔

پھر جو مجھے ہوش آیا تو میں حجام کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ حجام نے میری دونوں قلموں پر مشین چلائی۔ دفعتاً میری نگاہوں سے بال جنجال کا پردہ ہٹ گیا۔

میں کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ حجام نے میرے کندھوں کو نیچے کی طرف جھٹکا دیا۔ میں پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ حجام نے میری گردن پر مشین پھیری۔ جوش میں پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حجام غصے میں چلانے لگا۔

پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ مجھے صرف دو لفظ سمجھ میں آئے۔ بارہ ریال۔ میں



نے جھٹ میں ریال میز پر رکھے اور بقایا لینے کے بغیر ہی باہر بھاگا۔ باہر کھڑے لوگوں کو  
 میں نے کندھے مارے جیسے وہاں فٹ بال کا کھیل ہو رہا ہو۔ پھر وہ سب میری کیفیت  
 دیکھ کر قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ ان کی نگاہوں سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چلا چلا کر  
 کہہ رہے ہوں۔ ”پاگل ای اوئے“ پاگل ای اوئے۔ ”جب میں دیوانہ وار حرم میں  
 داخل ہوا تو کوٹھے پر کھڑا قہقہے مار کر ہنس رہا تھا۔ ”پاگل ای اوئے۔ بال جنجال میں الجھا  
 ہوا پاگل۔“







خانہ کعبہ کی منڈیر خالی پڑی تھی۔ نہ کوئی وہاں سے جھانک رہا تھا۔  
صرف منڈیر ہی نہیں سارا سارا کوٹھا خالی پڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر محسوس  
نہیں ہوتا تھا کہ وہ آباد ہے۔ اس میں وہ احساس موجودگی نہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بت  
خالی ہو۔

### جب اور اب

جب ہم پہلی مرتبہ زائرین کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں آئے تھے تو خانہ  
خدا کو دیکھ کر شدت سے ایک موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے ایک ایک پتھر میں  
زندگی تھی۔ پتھر کی ایک ایک رگ کسی وجود کی تڑپ سے سرشار تھی۔ اس وقت کسی  
نے محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ پتھر کا بنا ہوا ایک بت ہے۔ کسی کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ لا  
محدود اللہ کو اس چھوٹے سے کوٹھے میں کس طرح مقید کیا جاسکتا ہے کہ ایک اتنی عظیم  
قادر مطلق ہستی اس کوٹھے میں کس طرح سما سکتی ہے کہ لامتناہی کائنات کے والی کو ایک  
چھوٹے سے پتھر کے کوٹھے میں محدود کر دینا ایک معجزہ خیربات ہے۔

پتہ نہیں کیوں پڑھے لکھے لوگ اسلام کو جاننے سمجھنے والے لوگ ان دنوں  
بسھی محسوس کرتے تھے کہ وہ اس کا گھر ہے کہ وہ اس کوٹھے میں مقیم ہے کہ وہ اس چار  
دیواری میں چھپا بیٹھا ہے۔ ان دنوں وہ کوٹھا ساری کائنات پر مسلط و محیط تھا۔  
لیکن آج وداع کے روز وہ کوٹھا خالی خالی دکھتا تھا۔ اس کے باوجود زائرین  
مفارقت کے جذبے سے تڑھال تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے اللہ سے جدا ہو  
رہے ہیں۔ اسے الوداع کہہ رہے ہیں۔ خدا حافظ کہہ رہے ہیں۔ جدائی کے خیال سے  
ان کی آنکھیں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں۔

و نعتاً "حرم شریف میں ایک شورا تھا۔

سب کی نگاہیں خانہ خدا سے ہٹ کر حرم شریف کے صحن کی طرف اٹھ گئیں۔

### افریقی قافلہ

وداع ہونے والا قافلہ وہ پہلا قافلہ تھا۔

وہ قافلہ چالیس پچاس افریقیوں پر مشتمل تھا۔ جن میں مرد بھی تھے عورتیں

بھی اور بچے بھی۔ وہ سب حرم میں بنی ہوئی اس شاہراہ پر کھڑے تھے جو سیدھی بیرونی







جب اس قافلے کا آخری فرد بیرونی دروازے سے نکل گیا تو میں چونکا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے اللہ کو وہ اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔  
سارا حرم خالی پڑا تھا۔ جس کے درمیان میں خانہ کعبہ ایک بت کی طرح ایستادہ تھا۔ پتھر کا بت۔

میں بیرونی دروازے کی طرف اٹھ بھاگا۔  
باہر نکلتا تو دیکھا کہ افریقی قافلے کا نشان تک نہیں۔ ”کھودیا“ میں نے سوچا۔ ”  
کھودیا۔“ مجھے اس افریقی قافلے کے ساتھ شریک ہو جانا چاہیے تھا۔ میں بھی اللہ سے  
لت پت ہو جاتا چند ساعتوں کے لیے میں بھی اللہ بن جاتا۔ کھودیا۔  
مایوسی کے عالم میں بیرونی دروازے کے سامنے ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ نہ  
جانے کب تک سر جھکائے میں وہاں بیٹھا رہا۔-----

### مکان اور مکین

پھر جو میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ بیرونی دروازے کی سیڑھیوں پر اپنے  
عصا پر ٹھوڑی رکھے بیٹھا ہے۔ کپڑوں پر جا بجا پوند لگے ہیں، چہرے پر جھریاں لٹک رہی  
ہیں، پوٹے آنکھوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔

جب بھی کوئی وداع ہونے والا دروازے سے باہر نکلتا تو وہ محبت بھری نظروں  
سے اسے دیکھتا اور اپنی انگلی آگے بڑھا کر کہتا۔ ”مجھے چھوڑ کے نہ جاؤ۔ مجھے ساتھ لے  
چلو۔ میری انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ لے چلو۔ نہیں، نہیں، اس کوٹھے کی جدائی کا غم مت  
کھاؤ۔ وہ کوٹھا تو خالی ہے۔ میں تو اب یہاں بیٹھا تمہارا راستہ دیکھ رہا ہوں، تمہارا منتظر  
ہوں، تمہارے ساتھ جانے کا خواہاں ہوں۔ میری انگلی پکڑ لو۔ مجھے ساتھ لے چلو۔“ وہ  
ہر وداع ہونے والے کا دامن پکڑتا تھا۔

لیکن کوئی اس کی جانب نہ دیکھتا۔ کوئی اس کی بات نہ سنتا۔ کوئی اس کی طرف  
توجہ نہ دیتا۔ وہ سب پتھر کے اس کوٹھے پر مرکوز تھے۔ وہ اس سے وداع ہونے کے غم  
میں نڈھال تھے۔

وہ مکان میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ مکین کو بھول  
چکے تھے۔ اور مکین حیرت اور بے بسی سے ان کے منہ تک رہا تھا۔



اس نے ہلتی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اپنی انگلی بڑھا دی۔  
 ”نہیں، نہیں، میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو“  
 میں سے بھرا ہوا ہوں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے ”میں“ کی انگلی پکڑ رکھی ہے۔ میں  
 نے میں کو بت بنا رکھا ہے۔ میں تجھے ساتھ کیسے لے جا سکتا ہوں“

”میں تیرے دو ار پر آ سکتا ہوں۔ میں تیرے حضور حاضری دے سکتا ہوں۔  
 میں تجھے سجدہ کر سکتا ہوں، تیرے پاس رہ سکتا ہوں لیکن صرف چند ساعتوں کے لیے،  
 چند لمحات کے لیے، چند دنوں کے لیے۔ میں تجھے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ میں تجھے ساتھ  
 نہیں رکھ سکتا۔ میں اپنی میں کی نفی نہیں کر سکتا۔ نہیں، نہیں۔“

میں دوسرے دروازے کی طرف اٹھ بھاگا تاکہ ادھر سے حرم میں داخل ہو  
 جاؤں۔ ارے وہ تو وہاں بھی بیٹھا تھا۔ وہ حرم کے ہر دروازے پر بیٹھا تھا۔  
 وہ مکے کے ہر موڑ پر بیٹھا تھا۔ ہر سڑک ہر گلی ہر راستے کی نکل پر بیٹھا تھا۔ لوگ  
 چل پھر رہے تھے۔ وہ مدینہ جانے کی خوشی میں پھولے نہیں مار رہے تھے۔ کوئی اس کی  
 جانب توجہ نہیں دے رہا تھا۔

دفعتا میں نے محسوس کیا جیسے وہ مکہ معظمہ نہ ہو بلکہ یورپ کا کوئی شہر ہو۔  
 جیسے چیکو سلاویکیہ کا پراگ ہو۔

## عکسی مفتی اور پراگ

مجھے اپنے بیٹے عکسی مفتی کا وہ خط یاد آ گیا جو اس نے پراگ پہنچ کر مجھے لکھا  
 تھا۔

باپو! پراگ بڑا خوبصورت شہر ہے۔ یہاں بڑی گہما گہمی ہے لیکن پتہ نہیں  
 کیوں سارے شہر بے نام اداسی کا سا بنان سایہ کیے ہوئے ہے۔  
 یہاں کے لوگوں کو تمام سہولتیں حاصل ہیں۔ بنیادی ضروریات کوڑیوں کے  
 مول ملتی ہیں۔

سرکار روٹی کپڑا دیتی ہے۔ رہنے کو مکان دیتی ہے۔ تعلیم دیتی ہے، کرنے کو  
 کام دیتی ہے۔ علاج معالجہ کرتی ہے۔ انہیں سب کچھ حاصل ہے۔ یہ سب فکر معاش  
 سے آزاد ہیں لیکن یہاں کوئی خوش نہیں۔ کوئی مطمئن نہیں۔



یہاں ہر سڑک پر ہر موڑ پر ایک نہ ایک گر جا موجود ہے۔ یہ گرجے کو تھک  
 لمرز تعمیر کے ہیں اور سنگ تراشی کے انمول نمونے ہیں۔ اندر نقاشی کے نایاب ڈیزائن  
 بنے ہوئے ہیں لیکن انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں۔ وہ سب مقفل پڑے ہیں۔ قفل زنگ  
 الود ہو چکے ہیں۔ چونکہ اوروں کو تنہائی نے بوڑھا کر دیا ہے۔  
 کیونکہ زچہ نے خدا کو ملک بذر کر دیا تھا۔ گرجوں کو مقفل کر دیا تھا۔

### فالتو ہستی

گرجے سے نکالے جانے کے بعد خدا گرجوں کے دروازوں کی دہلیزوں پر آ  
 بیٹھا۔

وہ آج بھی وہیں بیٹھا ہے۔ ہر گرجے کے صدر دروازے کے باہر وہ اپنے  
 عصا پر ٹھوڑی رکھے بیٹھا ہے۔ وہ حسرت بھری حیرت سے گرد و پیش کو دیکھ رہا ہے۔  
 ہر راہ گیر کو دیکھ کر اس کے چہرے کی لنگتی ہوئی جھریوں میں امید کی کرن چمکتی  
 ہے۔ شاید یہ آنے والا مجھے دیکھ لے، شاید اس کی توجہ مجھ پر مبذول ہو جائے۔ شاید وہ  
 رک کر پوچھے تو کون ہے؟ یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ اور تو مجھے امید بھری نظروں سے کیوں  
 دیکھ رہا ہے۔ شاید...

وہ ابھی تک اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک اپنی تخلیق پر  
 نازاں ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر اپنے ہاتھ چومتا ہے۔ لیکن راہ گیر آتے ہیں اور گزر  
 جاتے ہیں۔ کوئی اسے نہیں دیکھتا، کوئی اسے نہیں جانتا۔ کوئی اس کی موجودگی کو نہیں  
 مانتا۔ کوئی اس سے بات نہیں کرتا۔ وہ ایک فالتو ہستی ہے۔

صرف پراگ میں ہی نہیں، ہر بڑے شہر میں۔ صرف کیونسٹ ملکوں میں ہی  
 نہیں، یورپ کے ہر ملک میں۔ وہ اپنا عصا تھامے سڑکوں، گلیوں، کوچوں میں گھوم رہا  
 ہے، اس امید پر کہ کوئی اسے اپنالے۔

### منافقت، منافقت، منافقت

اسے شہزادہ کی طرح کرتے ہوئے اتنے سال گزر گئے ہیں لیکن وہ مایوس نہیں  
 ہوا۔ اس کی تھکی ہاری آنکھوں میں امید کی کرن بچھتی نہیں۔ لہذا اس میں مزید چمک  
 پیدا ہو گئی ہے۔



یوں لگتا ہے جیسے وہ جانتا ہو، جیسے اسے یقین ہو کہ ایک دن جلد آنے والا ہے۔ جب اہل مغرب پھر سے اسے Discover کریں گے، اسے دیکھیں گے، تسلیم کریں گے اور منائیں گے اور پھر اسے انگلی لگا کر مشرق میں لائیں گے، ساتھ ساتھ لے پھریں گے۔

پھر انگلی لگا کر اسے ساتھ ساتھ لے پھرنا فیشن بن جائے گا۔ عین اسی طرح جس طرح ماضی میں شک کرنا، کفر، الحاد، سیکولر ازم فیشن بن گئے تھے۔

پھر اللہ کو انگلی لگائے پھرنے کا فیشن مغرب سے ہم تک پہنچے گا اور ہم اس فیشن کو اپنالیں گے۔ جس طرح ہم نے کفر و الحاد کے فیشن کو اپنایا تھا۔ جس طرح ہم نے منی سکرٹ کے فیشن کو اپنایا تھا Sleeveless کو اپنایا تھا۔ نیل باٹم کو اپنایا تھا۔

مغربی قوموں میں کفر و الحاد اپنانے کی جرات تھی۔ ان میں اللہ کو اپنانے اور انگلی لگانے کی بھی جرات ہے۔ مغربی قوموں میں خلوص ہے فعالیت ہے۔ جرات ہے۔ ہم میں منافقت ہے، منافقت ہے، منافقت ہے۔

جب میں بھاگا بھاگا ہوٹل پہنچا تو میرا دم چڑھا ہوا تھا۔

قدرت ناساز ہی طبع کی وجہ سے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محنت پاس بیٹھی ہوئی انہیں یہ Suggestion دے رہی تھیں کہ آپ آج کے آخری واجبات ادا کر سکتے ہیں، طواف و داع کر سکتے ہیں۔

”نہیں، نہیں، نہیں“ ہوٹل سے باہر نہ جانا۔ ”میں نے گھبراہٹ میں کہا۔“

ہوٹل سے باہر نہ جانا۔“

”کیوں باہر کیا ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

ثواب کی گٹھڑیاں

”باہر وہ ہر موڑ پر بیٹھا ہے۔ حرم کے ہر دروازے پر بیٹھا ہے۔ ہر جانے والے کی طرف وہ امید اور منت بھری نگاہوں سے اپیل کرتا ہے مجھے ساتھ لے چلو۔ لیکن وہ سب حج کے ثواب کی گٹھڑیاں اٹھائے یوں جا رہے ہیں جیسے ڈکیتی کے مال کا حصہ سمیٹ کر لیے جا رہے ہوں۔“

”وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ پھر بھی وہ اپنے بندوں سے مایوس نہیں



ہوتا۔ وہ ان سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ لیکن، لیکن اس کی طرف دیکھا نہیں جاتا ہے۔“

”وہ اکیلا رہ جائے گا۔ تنہا۔ کوئی اسے ساتھ نہیں لے جائے گا اور پھر تازہ زائرین آکر پھر سے اسے اس پتھر کے کوٹھے میں مقید کر دیں گے۔“

ڈاکٹر ہننے لگیں۔ ”مفتی صاحب آپ کا ذہن تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”آپ کا نہیں ہوا کیا؟“ میں نے غصے سے کہا۔ ”نہیں ہوا تو اتنی دور چل کر

آنے کا فائدہ؟ یہاں کون ہے جس کا ذہن خراب نہیں ہوا؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ قدرت اپنی تکلیف بھول

کراٹھ بیٹھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ جیسے دکھی دوسرے کو دکھ میں مبتلا دیکھ کر ان جانے میں ہمدردی بھری خوشی محسوس کرتا ہے۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ بولے۔

”میں ٹھیک ہونا نہیں چاہتا۔“ میں نے کہا۔

”یہ بیماری ہی ایسی ہے۔“ ڈاکٹر عفت بولیں۔ ”جس کے تحت مریض صحت

یاب ہونا نہیں چاہتا۔“

قدرت نے قہقہہ مارا، ان کی آنکھ کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بولے ”آج

شام کو جب آپ مدینہ شریف پہنچیں گے تو.....“

”میں مدینہ منورہ جانا نہیں چاہتا۔“ میں چلایا

”ڈاکٹر اور قدرت حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔“

”کیوں نہیں جانا چاہتے۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ میں خانہ خدا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔“

”آپ چلیں تو سہی“ قدرت بولے۔ ”وہاں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں کون ہوں

”میں نہیں چاہتا کہ سب ٹھیک ہو جائے۔“ میں چلا کر بولا۔ ”میں نہیں چاہتا

کہ کچھ بھی ٹھیک ہو۔“

ان کی نگاہوں کو محسوس کر کے مجھ پر مزید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ ”نہیں،







”مجھے نہیں پتہ وہ کون بزرگ تھے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”شاید اس بزرگ نے آپ کا رخ بدل دیا ہو۔ آپ کی توجہ مہینہ منورہ سے  
 ہٹا کر مکہ معظمہ کی طرف کر دی ہو۔“  
 ”کیا واقعی؟“۔۔۔۔۔۔۔۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا یہ اللہ والے اس قدر پر  
 اثر لوگ ہیں کہ وہ ایک نگاہ سے دوسرے کا رخ بدلنے پر قادر ہیں؟“  
 رخ (Attitude) کیا ہے رخ وہ پھول ہے جو شخصیت کے پودے کا  
 ما حاصل ہے۔ تا، ٹہنیاں، پتے سب باہمی جدوجہد سے ایک پھول پیدا کرتے ہیں۔ اسی  
 طرح تعلیم، خیالات اور جذبات سب مل کر ایک رخ پیدا کرتے ہیں۔ سالہا سال کی  
 جدوجہد اور محنت کے بعد شخصیت کو ایک پھول لگتا ہے۔ ایک رخ حاصل ہوتا ہے۔  
 کیا یہ بابا لوگ اتنے فعال ہیں۔ اتنے بڑے جادوگر ہیں کہ وہ ایک راہ گیر پر  
 نگاہ ڈال کر اس کا رخ بدل سکتے ہیں۔  
 کیا میرا رخ میرا رخ نہیں۔ کیا مجھے اتنا اختیار نہیں کہ اپنا ایک رخ خود وضع  
 کروں اور پھر اس پر قائم رہوں۔

### حاجی صاحب

پھر مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں دلی کی جامع مسجد میں حاجی صاحب کے ہاتھوں  
 میں اپنے ہاتھ دیے بیٹھا تھا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب برٹریٹڈ رسل، جولین ککلی اور ہالڈین مجھے  
 انگلی لگائے پھرتے تھے۔ جب میرا مطلع نظر Scientific Attitude کا حصول  
 تھا۔ جب میرے لیے حصول علم کی بنیاد شک تھی۔ جب میرے نزدیک  
 Scepticism کی سیڑھیاں چڑھے بغیر حقیقت تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔

ان دنوں مجھے بے راہ روی کی طرف بھٹکنے سے بچانے کے لیے میری ماں نے  
 مجھ سے کہا تھا۔ ”بیٹا تو میرے کہنے میں نہیں۔ تو ہمیشہ اپنی کرتا ہے۔ میری ایک آخری  
 بات مان لے، صرف ایک بات۔ آخری بات۔ پھر میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی۔ تو دلی جا  
 اور حاجی صاحب کی بیعت کر لے۔“

حاجی اماں کے پیر و مرشد تھے۔ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ بزرگ تھے یا نہیں



اور تھے تو ان کا مرتبہ کیا تھا۔ یہ مجھے علم نہ تھا۔  
 ان دنوں میں اللہ یا اللہ کے بندوں سے واقف ہی نہ تھا۔ مجھے ان کے وجود کا  
 احساس ہی نہ تھا۔ جب وجود ہی نہ ہو تو مرتبہ کیا۔  
 رہی بیعت۔ تو بیعت کے مفہوم سے تو میں آج بھی واقف نہیں۔ میں نے یہ  
 لفظ کتابوں میں کئی جگہ پڑھا ہے لیکن اس کے مفہوم سے واقف نہیں ہو سکا۔

### بیعت

حاجی صاحب مجھے جامع مسجد میں لے گئے، وضو کرایا۔ پھر ایک کونے میں بٹھا  
 کر میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب  
 ہوئے بولے۔ ”آپ اپنا آپ میرے حوالے کر دینے کا جذبہ پیدا کریں۔“ میں نے  
 اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور کہا ”حاجی صاحب یہ فرمائیے کہ بیعت کا مطلب کیا ہے؟“  
 ”اپنا آپ حوالے کر دینا، سپرد کر دینا، حوالگی اور سپردگی کا جذبہ پیدا کرنا۔“  
 انہوں نے جواب دیا۔

”حاجی صاحب سپردگی کا جذبہ پیدا نہیں کیا جاسکتا، وہ پیدا ہو جاتا ہے۔ از خود“  
 ”اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جو دوسرے میں یہ جذبہ بیدار کر سکتے ہیں۔“  
 وہ مسکرائے۔

”یہ ظلم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے زبردستی نیک نہ بنائیے۔ زبردستی مسلمان  
 نہ بنائیے۔ مجھے موقع دیجئے کہ میں اپنی زندگی خود جیوں، اپنا راستہ خود تلاش کروں۔ اپنا  
 رخ خود وضع کروں اور پھر اس پر قائم رہوں۔ مجھے مانگے کے زیور پہننے سے کوئی دلچسپی  
 نہیں۔“

حاجی صاحب مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ”آپ کا مرشد عظیم تر ہے“ وہ  
 بولے۔ ”میری اس کے روبرو کوئی حیثیت نہیں۔ انشاء اللہ آپ ضرور پہنچ کر رہیں  
 گے۔ صرف وقت حائل ہے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔“ کہتے ہوئے وہ جامع مسجد سے  
 باہر نکل آئے۔

اس روز مکہ معظمہ کے ہوٹل فندق الکلی میں بیٹھے ہوئے میں نے محسوس  
 کیا۔ جیسے میں ہنوز اسی مقام پر بیٹھا تھا۔ جس پر ۴۳ سال پہلے تھا۔ جب میں دلی کی جامع



مسجد میں حاجی صاحب کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے بیٹھا تھا۔

## رکاوٹیں، رحمتیں

”چھوڑیے مفتی صاحب۔“ ڈاکٹر عفت نے کہا۔ ”آپ کیا خواجہ خواجہ کا جھگڑا لے بیٹھے۔“ پھر وہ قدرت سے مخاطب ہوئیں۔ ”سمجھ میں نہیں آتا۔“ وہ بولیں ”کہ جب سے آپ یہاں آئے ہیں آپ کے راستے میں اتنی رکاوٹیں کیوں حائل ہوتی جا رہی ہیں۔ چلئے اٹھئے حرم شریف چل کر طواف وداع کیجئے۔ مفتی صاحب کی باتیں نہ سنئے۔ مفتی صاحب خود آپ کے راستے کی رکاوٹ ہیں۔“

قدرت اٹھ بیٹھے اور مسکرا کر بولے ”جی جی یہ مجھے عزیز ہیں۔“

قدرت اور ڈاکٹر عفت کے جانے کے بعد میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔

”یہ قدرت کیسا آبی ہے۔ یہ رکاوٹوں کو عزیز رکھتا ہے جو Resistance کو اہمیت دیتا ہے جو ان کی برورٹیشن نہیں کرتا۔ ان سے خوف نہیں کھاتا۔ ان کے خلاف غصہ نہیں پالتا۔ ان سے نفرت تک کرتا۔ الٹا انہیں عزیز رکھتا ہے۔“

”کیا رکاوٹیں واقعی رحمتیں ہوتی ہیں۔ کیا رکاوٹیں واقعی اس بات کی دلیل ہوتی ہیں کہ آگے بڑھنا مشکل ہے۔ حرکت مثبت ہے اور رخ درست ہے۔“

”لیکن کیا رخ بھی اللہ کی دین ہے۔ نہیں، نہیں میرا دل نہیں مانتا۔ اگر رخ

بھی اسی کی دین ہے تو پھر ہماری Contribution کیا ہے؟“

اگر اسلام آباد کی ایک ویران سڑک پر بیٹھا ہوا ایک بابا چشم زدن میں میری مرضی کے خلاف ان جانے میں میرا رخ اس حد تک موڑ سکتا ہے۔

اس روز مکہ معظمہ میں میری تمام تر توجہ خانہ خدا پر مرکوز تھی۔ میرے

خیالات اور جذبات اللہ کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ ہر جگہ ہر مقام پر مجھے اللہ دکھائی دے رہا تھا۔ وداع ہونے والے زائرین کے چہروں پر ان کی نگاہوں میں ’ان کے دکھ میں‘ ان کے بند بند میں۔

## محاصرہ

حرم شریف کے دروازوں پر، مکے کی گلیوں میں، کوچوں میں، سڑکوں پر اللہ



نے چاروں طرف سے میرا محاصرہ کر رکھا تھا۔ میں اس سے یوں بھرا ہوا تھا۔ جیسے مالٹا رس سے بھرا ہوتا ہے۔ مجھ میں کسی غیر کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا قدرت اور ڈاکٹر محنت مجھے وہیں چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے جائیں۔ اور میں مکے کی گلیوں، بازاروں اور سڑکوں پر گھومتا پھروں اور ان کا نظارہ کرتا رہوں۔ کبھی وہ خانہ خدا میں چھپا بیٹھا ہو۔ کبھی منڈیر پر سے جھانکتا ہو۔ کبھی زائرین کے خدو خال پر یوں جھلکتا ہو جیسے شور بے پرگھی تیرتا ہے، کبھی وہ حرم کے دروازوں پر بیٹھا ہو اور جانے والوں سے فتیں کر رہا ہو۔۔۔۔۔۔ ”مجھے اپنے ساتھ لے چلو“ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ“ مجھے اپنا ساتھی بنا لو“ میری انگلی پکڑ کر مجھے ساتھ لے چلو۔“



## مدینہ روڈ

وہی کالی موٹروہی کالی سڑک 'اردگرد وہی ویرانہ' وہی اداس قدیم مجلسی ہوئی  
پھاڑیاں بالکل ویسا ہی منظر جیسا جدہ سے مکہ معظمہ جاتے ہوئے پیش پیش تھا۔  
ہم مکہ سے مدینہ منورہ کو جا رہے تھے۔

اللہ اور محمدؐ

اس وقت میرے دل میں مدینہ منورہ کے لیے کوئی امنگ نہ تھی۔ البتہ خانہ  
خدا سے وداع ہونے کا ملال دل میں بوند بوند ٹپک رہا تھا۔ ایسا کیوں تھا۔ بات سمجھ میں  
نہیں آرہی تھی۔

جب میں وطن سے روانہ ہوا تھا تو اگرچہ بظاہر حج کے لیے چلا تھا لیکن دل ہی  
دل میں میری منزل مدینہ منورہ تھی۔

عظیم ترین انسان

مدینہ منورہ سے میری عقیدت بہت پرانی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے  
میرا جذبہ احترام اسلام کی وجہ سے نہ تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ رسول اللہ تھے۔ بلکہ  
اس لیے کہ وہ عظیم ترین انسان تھے۔

اس زمانے میں انگریزی زبان میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہ تھی جو اسلام یا  
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کرتی۔ البتہ ایسے ہندو اور عیسائی  
مصنفوں کی کتابیں ضرور ملتی تھیں جو اسلام کے خلاف تعصب کی وجہ سے مشہور تھے۔



جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔

یہ اس دور کی بات ہے جب میں Revolt کی عمر میں تھا۔ جب مذہب میرے نزدیک اپاہج کے لیے ایک سہارا تھا۔ اندھے کے لیے راستہ تلاش کرنے کی لاشی تھا۔ جب میں نہ تو اندھا تھا نہ اپاہج۔ جب میں سب کچھ جانتا تھا۔ سمجھتا تھا۔ ان دنوں مجھے ایسی کتابوں کی تلاش تھی جو اسلام کے عیب گنوا تی تھیں۔ اس سے مجھے عجیب سی تسکین ہوتی تھی۔

میں نے ایسی کئی ایک کتابیں پڑھیں تھیں۔ سمتہ 'ڈی این سین' لاجپت رائے 'ایڈورڈ گبن' 'باڈلے' 'شینٹے پول'۔۔۔۔۔

یہ سب مصنف اسلام کے خلاف زہر افشانی کرنے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے بات کیا تھی کہ وہ سب یک زبان ہو کر محمدؐ کی تعریف کرنے پر مجبور تھے۔

یا اللہ تمہارا یہ بندہ کتنا عظیم انسان ہو گا کہ دشمن بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی کہتا ہے انہوں نے کبھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ کوئی کہتا ہے ان کا قول و فعل میں تضاد نہ تھا، کوئی کہتا ہے انہوں نے سب امتیازات مٹا دیے۔ کوئی کہتا ہے وہ گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، جھاڑو دیتے، دودھ دوہتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، چولے میں آگ جلاتے، لیکن کئی دن ایسے بھی آتے جب اس عظیم انسان کے گھر چولے میں آگ نہیں جلتی تھی۔

ان تعصب بھری تحریروں کے دھوئیں سے حضورؐ کی منور کرن ابھری اور میرے ذہن پر چھا گئی۔

پھر سالہا سال بعد میرے دوست بشیر خالد نے مجھے مثبت مطالعے کی طرف مائل کر دیا۔

بشیر خالد

ایک روز میں خالد سے ملنے گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے پٹنگ پر سرہانے تلے ایک ضخیم بیڈ بک ہے؟

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ تمہاری بیڈ بک ہے؟"



خالد نے جواب دیا ”یہ میری سب کچھ ہے“ بیڈ بک ہے“ حدیث ہے“ قرآن ہے“ سب کچھ ہے۔“

میں نے اس کتاب کو کھول کر دیکھا۔ وہ حضورؐ کی سوانح تھی۔

”یہ تو حضورؐ کی سوانح ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ وہ کتاب ہے“ خالد نے کہا ”جس نے مجھے پھر سے مسلمان بنایا۔“

خالد بچپن سے ہی مذہب کا دیوانہ تھا۔

بچپن سے ہی اسلام اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔

پھر اسے ایک رہبر مل گئے۔ یہ رہبر صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ ان میں ہر وہ

خوبی موجود تھی جو ایک صالح مسلمان میں ہونی چاہیے۔

ان کے زیر اثر خالد کے جذبہ اسلام میں مزید رنگ پیدا ہوئے۔ عقوان

شباب میں اس نے ڈاڑھی رکھ لی۔ صوم و صلوٰۃ کی پابندی کے علاوہ اس نے اسلام کی تبلیغ کرنی شروع کر دی۔

پھر ایک روز نہ جانے کس ضرورت کے تحت دروازہ کھٹکٹائے بغیر اپنے صالح

راہبر کے کمرے میں جا داخل ہوا۔ وہاں اس نے اپنے راہبر کو ایسے عالم معرفت میں

پایا کہ اس کے ذہن کا فیوز اڑ گیا۔

پھر نہ جانے کس نے اس کے ہاتھ میں وہ کتاب تھمادی۔ اس نے حضورؐ کی

سوانح کو پڑھا۔ اس کی اجڑی ہوئی دنیا کے تنکے پر پھر سے یک جا ہو گئے۔ اسلام جو اس

کی نگاہ میں ریزہ ریزہ ہو چکا تھا پھر سے استوار ہو گیا۔ خالد پھر سے مسلمان ہو گیا۔

حضورؐ کی سوانح پڑھ کر میں مسلمان تو نہ ہوا لیکن حضورؐ کے لیے محبت اور

احترام کی مشعل میرے دل میں ضرور روشن ہو گئی۔

نوجوانی میں ہی میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ اس عظیم انسان کو جا کر سلام

کروں۔ جس کی عظمت کو سبھی تسلیم کرتے تھے، جس کی انسانیت کے سبھی گن گاتے

تھے۔ اپنے بیگانے دوست دشمن سبھی۔

جس ماحول میں نے پرورش پائی تھی۔ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

اور عقیدت یوں بھی رچی بسی تھی۔ جیسے گندھے ہوئے آنے میں پانی۔ محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کا نام آتا تو لوگ اٹکیاں چوم کر آنکھوں پر لگاتے۔ محمدؐ کا تذکرہ ہوتا آنکھیں



بہر آتمیں 'دل دھڑکتے' محمد 'کانام سن کر لوگوں پر کیفیت طاری ہو جاتی' سر دھنتے 'حال کھینچتے' وجد کرتے۔

اللہ کانام چاہے لیے جاؤ۔ کچھ بھی نہ ہوتا، کچھ بھی نہیں۔

ان دنوں میں محسوس کرتا تھا کہ میں واقعی محمدن **Mohammadan** ہوں مسلم نہیں چونکہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لگاؤ ہے اسلام سے نہیں۔ اس میں میرا قصور نہ تھا۔ برصغیر کے سبھی مسلمانوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی۔ یہ وہ دن تھے جب مسلمانوں کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ

خدا گر محمد کو پیدا نہ کرتا  
قسم ہے خدا کی خدائی نہ ہوتی

پاکستان

پھر قیام پاکستان کے بعد میرے دل میں حضور اعلیٰ سے ایک نیا رشتہ ابھرا۔ اس رشتے کی نوید سب سے پہلے بھائی جان، جان محمد بٹ صاحب نے دی۔ جان محمد بٹ میرے اولین اور بنیادی رہبر ہیں۔ وہ بات بات پر فرمایا کرتے۔ ”مفتی جی آپ پاکستان کا غم نہ کھائیں۔ پاکستان جس نے بنایا ہے وہ خود اس کی رکھوالی کر لیں گے۔ آپ صرف اس بات کا خیال رکھا کریں کہ آپ کا کوئی قول یا فعل ایسا تو نہیں جو پاکستان کے لیے باعث نقصان ہو۔“

ایک روز میں نے بھائی جان سے پوچھا ”میں نے کہا پاکستان کے محفوظ ہونے کے متعلق آپ اتنے وثوق سے کیسے بات کر سکتے ہیں۔“

بھائی جان نے فرمایا ”ہمارے سرکار قبلہ ان بزرگوں میں سے تھے جو قیام پاکستان کے لیے کام کرنے پر مامور تھے ہمیں علم ہے پاکستان کے سر پر حضور اعلیٰ کا ہاتھ ہے۔“

اس روز میں نے ایسے محسوس کیا جیسے پاکستان کے توسط سے میں حضور اعلیٰ کے قدموں میں جا بیٹھا ہوں۔

پھر جب میرا تبادلہ کراچی ہو گیا اور وہاں میں قدرت اللہ سے متعارف ہوا۔ اور ہم دونوں آپس میں ملنے لگے تو جنگ کے ایک بزرگ کا خط موصول ہوا۔ لکھا تھا۔



ان دنوں جن صاحب سے آپ ملنے لگے ہیں۔ ان کو ہمارا سلام دیجئے۔  
 چند ایک ماہ کے بعد جنگ کے ان بزرگ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے  
 پوچھا کہ ”جن صاحب سے میں ملنے لگا تھا ان کو خصوصی سلام بھیجے کی کیا وجہ  
 تھی۔“ انہوں نے فرمایا۔ ”وہ صاحب حضور اعلیٰ کے ادنیٰ غلام ہیں اس لیے۔“

### ادنیٰ غلام

”ادنیٰ غلام؟“ بات میری سمجھ میں نہ آئی۔

جنگ والے بزرگ نے فرمایا۔ ”سرکار اعلیٰ کی شان نزالی ہے۔ غلاموں میں  
 جتنا ادنیٰ اتنا ہی ارفع۔“

اس وقت میں نے یوں محسوس کیا جیسے حضور اعلیٰ کے پاؤں میری آنکھوں  
 سے چھو رہے ہوں۔ یہ احساس قرب قدرت کے توسط سے تھا۔

اس کے بعد جب میری تعیناتی پریذیڈنٹ ہاؤس راولپنڈی میں قدرت اللہ  
 کے ماتحت ہو گئی تو ایک روز ایک شخص مدینہ منورہ سے صدر کے نام ایک پیغام لایا۔  
 یہ پیغام مسجد نبوی کے چابی بردار کی طرف سے تھا۔

آپ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ فوج میں بھرتی ہوئے۔ جنگ عظیم میں  
 ٹل ایٹ میں پہنچے۔ حضور اعلیٰ کی خدمت میں حاضری کا جذبہ جنون بن گیا۔ ایک روز  
 چپکے سے مدینہ منورہ کو عازم ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہیں کے ہو  
 رہے۔ خادم بنے پھر یہ عظیم اعزاز حاصل ہوا کہ مسجد نبوی کے چابی بردار بن گئے۔

### بھیڑوں کا رکھوالا

ان کا یہ پیغام صدر پاکستان کے نام تھا۔

فرمایا ”۱۹۴۷ء میں ہم نے خواب دیکھا۔ دیکھا کہ ایک پودا مسجد نبوی سے  
 پھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے بیل کی طرح دور بہت دور تک چلا گیا۔ اس کے پرلے سرے پر  
 سبز پتیاں نکل آئیں۔“

”کئی ایک سال کے بعد پھر وہی خواب دیکھا۔ دیکھا کہ اس پودے کے پرلے  
 سرے پر جو پتیاں پھوٹی تھیں وہ خشک ہو گئیں ہیں لیکن مسجد نبوی میں اس کی جڑوں کی  
 توں ہری ہے۔“



”کئی ایک سال کے بعد اب پھر وہی خواب دیکھا ہے۔ پر لے سرے کی خشک پتیاں پھر سے بری ہو رہی ہیں۔ مبارک ہو۔“

فرمایا۔ ”صدر پاکستان کو ہمارا پیغام دینا، کتنا بھیڑوں کا رکھوالا خود چھاؤں میں نہیں بیٹھتا۔“

اس پیغام کو سننے کے بعد میں نے محسوس کیا جیسے میں اس پودے کی ایک مرحھائی ہوئی پتی ہوں جس کی جڑیں مسجد نبوی میں ہیں۔

اس روز میں حضور اعلیٰ کی ایک بھیڑ بن گیا۔

اس وقت ان حضور اعلیٰ کی خدمت میں حاضری دینے جا رہا تھا۔

اور اس شخص کی معیت میں جا رہا تھا جسے حضور کا ایک ادنیٰ غلام ہونے کا شرف حاصل تھا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ جذبہ کی شدت سے میرا سینہ پھٹ جاتا۔ جسم کی پھپھوندیاں اڑ کر سڑک پر بچھ جاتیں۔ مٹی میں جذب ہو جاتیں اور پھر صدیوں اس راہ پر جانے والوں کے قدم چومتا رہتا۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا، کچھ بھی نہیں، دل بند، قلب بند۔ خالی۔ جیسے ساری کائنات کا خلا میرے سینے میں آگھسا ہو۔

عالم

اس خلا کی وجہ سے میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ احساس شرمندگی بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ اس قدر بڑھ گیا کہ میں نے جھوٹ موٹ سوچنا شروع کر دیا کہ میں تو مدینہ منورہ میں حاضری دینے کے جذبے سے سرشار ہوں۔ میں تو ہمیشہ سے حضور کا دل داہ رہا ہوں۔ ہمیشہ سے۔

میری اس منافقت پر۔ میرے روبرو ایک چہرا ابھرا۔ آخ تھوکی آواز سنائی دی۔ میرے منہ پر تھوک کا لمبہ آگرا۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے میں عالم تھا۔

عالم ایک عیاش تاجر تھا۔ دنیا کی سیاحت کے لیے پاکستان سے نکلا۔ انفاۓ پہلے سعودی عرب جا پہنچا۔ سوچا چلو چلتے چلتے عمرہ ہی کر لیں۔ مکہ معظمہ میں پہنچ کر اس نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ ایک غلیظ شے ہے۔ یہ احساس اس پر طاری ہو گیا۔ ہوتا



گیا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ لوگ حیرت اور نفرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ”تو یہاں۔۔۔۔۔ تو۔“ حقارت بھری آوازیں چاروں طرف گونجیں۔ پھر آخ تھو کی آواز آئی۔ اس کے منہ پر تھوک کا طبعہ آگرا۔ پھر چاروں طرف سے آخ تھو۔ آخ تھو کی چاند ماری ہونے لگی۔ عالم بھاگ اٹھا۔ سر پر پاؤں رکھ کر کتے سے بھاگا۔

”کہاں جاؤں، کہاں جاؤں۔“ وہ سوچنے لگا۔

مدینے شریف جانے والی ایک بس نے اسے اٹھایا۔

مدینے شریف میں داخل ہونے سے پہلے اسے خیال آیا اگر یہاں بھی پناہ نہ ملی

تو۔

اس پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ بس سے اتر گیا۔ ڈر تا ڈر تاپیدل شہر میں داخل

ہوا۔

شہر کے باہر حضورؐ خود کھڑے تھے۔ ”آجاؤ عالم۔“ حضورؐ نے فرمایا ”آجاؤ

نہیں۔“

عالم آج تک مدینے میں مقیم ہے۔

دفعاً ”مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ میں تو منافق ہوں۔ میرا قلب غلاطت سے

بھرا ہوا ہے۔ پھر میں کس منہ سے حضورؐ کی خدمت میں حاضری دے سکتا ہوں۔ حضورؐ

صرف عظیم انسان ہی نہیں وہ رسول اللہؐ بھی ہیں اگر انہوں نے مجھے رو کر دیا تو۔

”نہیں نہیں ایسا نہ کہو ایسا نہ کہو۔“ حمیدہ کو ر میری منتیں کرنے لگی۔

حمیدہ کو ر

حمیدہ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی تھی۔ ابھی وہ دس سال کی تھی کہ تقسیم

ہند عمل میں آگئی۔ سکھوں کے جتھے نے ان کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔

جاتے ہوئے حملہ آور سکھ حمیدہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں پہنچ کر حمیدہ کو ر

بن گئی۔ پھر تین سال کے بعد وہ لہنا سنگھ کی بیوی بنا دی گئی۔ اس کے گھر دو بچے ہوئے۔

اس کے باوجود وہ گھر حمیدہ کا گھر نہ بنا۔ حمیدہ ان بچوں کی ماں نہ بن سکی۔ لہنا سنگھ کی

والہانہ محبت اسے اپنا نہ سکی۔ دن رات ’صبح شام وہ اللہ سے دعا کرتی۔ یا اللہ مجھے اس

کال کو ٹھہری سے نکال۔







کچھ دیر تو میں مطمئن بیٹھا رہا پھر دوسو سوں نے پھر سے سراٹھایا۔ خیال آیا۔  
حمیدہ کا تو صرف جسم ناپاک تھا میری تو روح بھی ناپاک ہے۔ حمیدہ نے تو صرف جسم بچا  
تھا۔ میں نے تو ذہن اور روح دونوں ہی گروی رکھے ہوئے تھے۔

ترخیص ہی ترخیص

میراجی چاہتا تھا کہ میں قدرت سے پوچھوں کہ میرے دل میں دوسو سے کیوں  
اٹھ رہے ہیں؟

میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ پھلی سیٹ پر ڈاکٹر عفت کے ساتھ بیٹھے  
ہونے کے باوجود وہ ہم سے کوسوں دور تھے۔ پتہ نہیں وہ کہاں تھے۔ تھے بھی یا نہیں۔  
بہر طور نہ تو موٹر میں تھے نہ اس کالی سڑک پر تھے جو مدینہ منورہ کی طرف دوڑے جا  
رہی تھی۔

ایک بات بہر طور واضح تھی۔ قدرت کے چہرے پر دراڑیں پڑی ہوئی تھیں  
جیسے بارش کے دباؤ تلے کچی دیوار میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ ان کا چہرہ جگہ جگہ سے  
ترخا ہوا تھا، جیسے شیشے کا گلاس چور چور ہو رہا ہو۔

ارے۔ میں چونکا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس گلاس میں ایک تازہ ترخ  
نمودار ہو گئی۔ پھر جو میں غور سے قدرت کی طرف دیکھتا رہا تو مجھے پتہ چلا کہ ہر میل کے  
بعد ان کے چہرے پر ایک تازہ دراڑ پڑتی جا رہی تھی پتہ نہیں وہ کون سا دباؤ تھا جو ہر  
ساعت اس شدت سے بڑھا جا رہا تھا کہ قدرت کو چور چور کیے جا رہا تھا۔

میرے دل میں ترس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یا اللہ منزل تک پہنچتے پہنچتے اس  
مغص کی کیا کیفیت ہو جائے گی۔

پھر مجھے ہنسی آگئی۔ ”میں بھی کیسا پاگل ہوں کہ اس مغص کو رہبر بنائے بیٹھا  
ہوں۔ جسے اپنا ہوش نہیں۔ جو آپ لت پت کے اس عالم میں ہے۔ وہ مجھے کیا راستہ  
دکھائے گا۔“

سکر اور صحو

اس وقت میراجی چاہا کہ ممبر پر کھڑا ہو کر لوگوں کو تلقین کروں۔ ”اے  
لوگوں! ندی کو رہبر بنانا۔ کبھی بھول کر بھی سمندر کو رہبر نہ بنانا۔ اس لیے کہ ندی، ایک



سمت میں بہتی ہے۔ وہ تمہیں انگلی پکڑ کر ساتھ لے جائے گی۔ کہیں تو پہنچا دے گی۔ یہ تو نہیں کہ سمندر کی طرح آپ کو اس قدر پھیلا دے گی کہ نہ کوئی سمت رہے گی نہ کوئی بہاؤ نہ رخ۔“

”اے لوگوں! کسی ہیڈ کانسٹیبل سے تعلق استوار کرنا۔ ڈی آئی جی سے نہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل آپ کے چھوٹے چھوٹے کام کرے گا۔ آپ کی ٹھوس امداد کرے گا۔“

اے لوگوں! میں نے بھول کی کہ سمندر کو راہبر بنا لیا اور اب میں خس و خاشاک کی طرح لہروں کے رحم و کرم پر پڑا ہوں۔ نہ میری کوئی سمت ہے نہ منزل ہے۔“

پہلے بھی میں نے کئی بار قدرت سے پوچھ دیکھا تھا جب کبھی مجھ پر بالکل ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی جیسے اس روز مدینہ منورہ جاتے ہوئے طاری تھی۔ میں نے قدرت سے پوچھا تھا۔ مجھے بتائیے کہ ”عالم سکر کیا ہے“ عالم صحو کیا ہے۔ کبھی سرشاری کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی خلائی ”ایسا کیوں ہے؟“

”ایک ہی بات ہے۔“ قدرت نے جواب دیا تھا۔ ”سرشاری ہو یا خلائی کیفیت، سکر ہو یا صحو۔ یہ ایک ہی گاڑی کے دو پہنچے ہیں۔ صحو ہو تو سکر کی آرزو نہ کرو، صحو ہو تو دل میں طال نہ لاؤ۔ صحو ہو تو پڑا ہو۔ ہونے دیجئے۔ سرشاری ہو تو اسے اہمیت نہ دیجئے۔“

دفعتا ”ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔“ آئیے آئیے۔ ”رابطہ افسر گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔“ آپ کو ایک مقام دکھاؤں۔“

## جنات کا مسکن

ہم سب گاڑی سے باہر نکل آئے۔ سامنے پہاڑیوں کا ایک سلسلہ سا کھڑا تھا۔ سڑک کے پہلو میں ڈھلان پر ایک ٹوٹی پھوٹی سی چار دیواری کے اندر چند ایک پتھر کی سلیس سی بکھری پڑی تھیں۔ چند ایک پتھر یہاں وہاں زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اس قطعہ زمین پر عجیب سی وحشت چھائی ہوئی تھی۔ زمین کی ساخت عجیب سی تھی۔ مٹی کا رنگ بھی عجیب سا تھا۔ ہلکی ہلکی سرخی، زردی سے ملی جلی ہوئی تھی۔ کہیں زردی ابھری ہوئی تھی، کہیں سرخی۔ ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایک ویرانی۔۔۔۔۔ سرخ



ویرانی جیسے۔۔۔۔۔ جیسے اس مقام کو جن روند گئے ہوں۔ ”جنوں کا مسکن ہے کیا؟“ میں نے حسن سے پوچھا۔

”یہ شہدائے بدر ہیں۔“ وہ بولا۔ ”یہ شہدائے بدر کی قبریں ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جنگ بدر لڑی گئی تھی۔“

واقعی وہ جنات کا مسکن تھا۔ شہدائے بدر جن ہی تو تھے۔ ایثار و قربانی کے جذبے نے انہیں جن بنا دیا تھا۔ وہ قبریں نہیں لگتی تھیں۔ قبریں تو ان کی ہوتی ہیں جو فوت ہو جاتے ہیں۔ شہید تو فوت نہیں ہوتا۔ شہید کا جسم ہمیشہ گرم رہتا ہے، خون ہمیشہ کے لیے جاری رہتا ہے۔ شاید رستے ہوئے خون کی وجہ سے وہ میدان اور پہاڑیاں گلابی ہو رہی تھیں۔

دفعتا ”مجھے یاد آیا کہ وہ تو ہمارے محسنوں کا مسکن تھا۔ میرا سراحسان مندی اور شکرگزاری کے جذبات سے جھک گیا۔“

## شرمساری

۱۹۶۵ء کی جنگ کی یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔

لاہور کے مشہور و معروف حکیم اور دانش ور نیر واسطی صاحب ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران مدینہ منورہ میں مقیم تھے۔ جب واپس پاکستان پہنچے تو انہوں نے ریڈیو پاکستان سے جنگ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے۔ فرمایا

”لاہور کی وہ خاتون جو ۱۸ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہے اور روضہ پاک کی جالی کے پاس بیٹھی رہتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ۶ ستمبر کو میں نے حضور اعلیٰ کو اس قدر پریشان حال دیکھا جیسا پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔“

”ایک بزرگ جو روز روضہ اطہر پر مجھ سے ملتے تھے۔ ۶ ستمبر کو کہیں دکھائی نہ دیے۔ ایک مرید نے بتایا کہ آپ جہاد کے لیے پاکستان گئے ہیں۔“

”ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ جنگ بدر کے تمام شہید پاکستان پہنچ چکے ہیں تا کہ جہاد میں شامل ہو سکیں۔“

پھر اکتوبر ۶۵ء میں روزنامہ جنگ میں کئی خبریں اس موضوع پر شائع ہوئی تھیں جن میں بھارتی قیدیوں کے بیانات بھی شامل تھے۔ ان بیانات کے مطالعہ سے ظاہر تھا کہ بھارتی سپاہی پاکستان کی اس فوج سے خائف تھے جو نکواردوں سے لڑتی تھی اور



جس کی نکواروں سے بجلی کے شعلے نکلتے تھے۔

### شہداء بدر

آج میں ان شہداء کے حضور میں کھڑا تھا۔ شرم سے میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میں ان کی جانب سر اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا اس لیے کہ وہ ہماری مدد کے لیے اتنی دور سے جنگ میں شرکت کرنے کے لیے یہاں آئے تھے لیکن ہم نے ان کا ساتھ نہ دیا تھا۔ انہوں نے جنگ بندی کا حکم دے دیا تھا اور وہ حیرت سے ہمارا منہ تکتے رہ گئے تھے کہ یہ پاکستان نے کیا کر دیا۔

ان دنوں خوشاب کے بزرگ ایڈووکیٹ صاحب نے کئی ایک خط صدر کے نام لکھے تھے۔ جن میں بار بار تاکید کی تھی کہ جنگ بندی کو تسلیم نہ کرنا۔ قدرت اللہ ان دنوں ہالینڈ میں سفیر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی صدر ایوب کو خط لکھ کر مشورہ دیا تھا کہ جنگ بندی سے متعلق مذاکرات کو غیر معمولی طول دے دیا جائے۔ گفت و شنید میں جنگ بندی کے مقررہ وقت کو ٹال دیا جائے۔ اگر جنگ بندی ضروری ہو تو عارضی تعطل کے فوری بعد لڑائی از سر نو چھیڑ دی جائے۔

پتہ نہیں کیوں پاکستان کے سربراہوں کو ہمیشہ بزرگوں کی طرف سے مشورے اور ہدایات موصول ہوتی رہی ہیں۔

بہر حال ہمارے سربراہوں نے ذاتیات کی بناء پر ہمیشہ جنگ کو ٹالنا چاہا۔ صدر ایوب اقتدار ہاتھ سے جانے کے خوف سے جنگ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ جنرل یحییٰ مغربی پاکستان میں اپنی حکومت قائم رکھنے کی غرض سے ایسٹ پاکستان کو دشمنوں کے حوالے کرنے کا پہلے سے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔

پاکستان کو کوئی ایسا سربراہ نصیب نہ ہوا تھا جو مجاہدانہ شان سے اللہ کے نام پر جنگ کرتا۔ جو شہیدان بدر کی امداد پر ایمان رکھتا اور ان کا ساتھ دیتا۔

ہاں۔ شہیدان بدر کے روبرو میرا سر شرمساری کی وجہ سے جھکا ہوا تھا۔ پھر مجھے یاد نہیں پتہ نہیں ہم کب موٹر میں بیٹھے، کب موٹر چلی، کتنی دیر چلتی

رہی۔۔۔۔



## تبرکاتِ مدینہ

مدینہ

ڈاکٹر عفت کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”مفتی صاحب“ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”ہم مدینہ منورہ میں داخل ہو چکے ہیں۔“ ڈاکٹر کا اعلان سن کر میں چونکا ضرور لیکن یوں جنوں کا توں بیٹھا رہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے ہم مدینہ منورہ میں نہیں بلکہ کامونگے میں داخل ہو رہے ہیں۔

سڑک کے دونوں طرف عام سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ایک منزلہ مکانات۔ بازار میں لوگ کاروباری انداز میں چل پھر رہے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ پنجاب کا کوئی قصبہ ہو۔

ہماری گاڑی ایک چار منزلہ ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ رابطہ افسر باہر نکلے۔ ہوٹل کے مینجر سے باتیں کرنے کے بعد ہمارے پاس آئے بولے۔ ”آئیے میں آپ کو آپ کے کمرے دکھا دوں۔“

اگرچہ ہوٹل جس پر فندق التیسر (Fandaq Al Staisar) کا بورڈ لگا ہوا تھا، عمدہ سائل کا بنا ہوا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے پاکستان کا کوئی متوسط درجے کا ہوٹل ہو۔

جب ہم ہوٹل میں پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ قدرت اللہ کی بیعت حسب معمول ناساز تھی، شیشے کا گلاس چور چور تھا۔

قدرت بولے: ”مفتی صاحب آپ مسجد نبویؐ سے ہو آئیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“



اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اکیلا مسجد نبویؐ نہیں جاؤں گا۔  
یہ سوچ کر میں ہوٹل کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

بازار

سامنے ایک نام سا بازار تھا۔ زیادہ تر دکانیں یک منزلہ تھیں۔ تنگ، پرانی،  
دھواں آلود۔ عین سامنے کوئی بھاما بھاما دکان پر بیٹھا کلمے تل رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی  
دکان پر ایک کشمیری تنور میں کلمے لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی ایک کھوکھے میں کڑک چائے بن  
رہی تھی۔ کیتلیاں آگ پر رکھی ہوئی تھیں۔ دکان کے سامنے کرسیوں پر گاہک بیٹھے  
ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہمارے صوبہ سرحد میں کسی بس شاپ پر چائے کا ہوٹل  
ہو۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مکہ معظمہ سے چل کر ہم پاکستان کے  
کسی قصبے میں آگئے ہوں۔ میرا جی چاہا کہ چل کر دیکھوں تو سہی دوسرے بازار کیسے  
ہیں۔ بیڑھیاں اتر کر میں ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ ابھی بیس قدم ہی چلا تھا کہ ایک وسیع  
میدان نظر آیا جس میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ارے۔۔۔۔ میں نے مڑ کر دیکھا میدان کے ایک طرف مسجد نبویؐ کی اونچی  
بسی دیواریں کھڑی تھیں۔ وہی سنگ مرمر جو مکہ معظمہ کی مسجد پر لگا ہوا تھا۔ وہی اونچی  
محرابیں۔ وہی انداز تعمیر۔ چند ایک ساعت کے لیے میں وہاں کھڑا مسجد نبویؐ کے بیرونی  
منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اونچے محراب والے دروازے کی طرف چل پڑا۔

یہ دروازہ خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ عورتیں مسلسل آ جا رہی تھیں۔  
کبھی کبھی کوئی مرد بھی اس دروازے سے داخل ہو جاتا۔ عورتوں کی بھیڑ میں سے  
گزرتا۔ نہ تو عورتوں کو احساس ہوتا کہ ان میں مرد آگھا ہے نہ ہی مرد کو احساس ہوتا  
کہ وہ عورتوں کی بھیڑ میں آ پھنسا ہے۔ اور نہ ہی دروازے پر کھڑا دربان اسے ٹوکتا کہ  
اس دروازے سے داخل نہ ہو۔ ادھر دوسرے دروازے سے جا۔

ایٹمی آنکھیں

جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ باب نسواں پہ کھڑا وہ دربان نہ تھا بلکہ جو توں کا  
رکھوالا تھا۔



اس کا قد اونچا لمبا تھا۔ رنگ گندی تھا۔ چہرے پر ایک عجیب سی کرخٹلی اور سنجیدگی تھی۔ خدو خال سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ عرب نہ ہو بلکہ جہلم یا کیمبل پور کا جوان ہو۔ اسے قریب سے دیکھنے کے لیے میں محراب میں جا کھڑا ہوا اور بلا سوچے سمجھے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ میری نگاہ کو محسوس کر کے دفعتاً وہ چونکا جیسے کوئی کتا اس کی جائے نماز پر آبیٹھا ہو۔

دو سرخ چوٹے میری طرف لپکے۔

دو قرآلود شکرنی آنکھیں میرے سامنے معلق ہو گئیں۔ مسجد نبویؐ مدینہ منورہ بلکہ ساری کائنات ان سرخ آنکھوں کی اوٹ میں آگئی۔ ان سرخ آنکھوں نے میرے جسم، دل، قلب اور روح کو بلو کر رکھ دیا۔ یوں کیل دیا جیسے مصور کینوس کے ٹکڑے کو میخوں سے بورڈ پر کیل دیتا ہے۔ میں نے محسوس کیا جیسے میں قصائی کی دکان پر بکرے کی طرح دو سرخ کنڈیوں پر ٹنگا ہوا ہوں۔

صدیوں میں ان سرخ کنڈیوں پر ٹنگا رہا۔

پھر جو مجھے ہوش آیا تو محراب کی دیوار کا سہارا لے کھڑا تھا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ جسم سے گویا جان نکل چکی تھی۔ ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ دیر تک میں وہاں ڈھیر پڑا رہا۔ پھر سامنے اس لمبے تڑنگے جو تار کھوالے کو اپنے کام میں ہمہ تن مصروف دیکھ کر میری زائل شدہ یادداشت پھر سے لوٹ آئی۔ ”یا اللہ یہ کون شخص ہے جس کی آنکھوں میں اتنی طاقت ہے جیسے ان میں ایٹمی ذرات ٹوٹ رہے ہوں۔“

”یا اللہ اس درگاہ کی کیا عظمت ہو گی۔ جس کے ایک ادنیٰ کارندے کی آنکھیں ایٹمی توانائی سے مسلح ہیں“ ان جانے میں میں پھر اس جو تار کھوالے کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً اس نے پھر گردن موڑی۔ پشتر اس کے کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی ڈر کے مارے میں وہاں سے بھاگا حتیٰ کہ مسجد نبویؐ سے دور پہنچا۔ میرا سانس پھول گیا اور میں دم لینے کے لیے پتھر پر بیٹھ گیا۔

چیزیں ہی چیزیں

پھر جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو میں مسجد نبویؐ سے ملحقہ بازار میں کھڑا تھا۔ سامنے دکانیں ہی دکانیں ہیں۔ مال سے لدی ہوئی دکانیں۔ بائیں ہاتھ فٹ پاتھ پر جھلمل



جھلس کرتی ہوئی اشیاء کے ڈھیر لگے تھے۔ چیزیں ہی چیزیں، چیزیں ہی چیزیں۔ جس طرف نگاہ اٹھاتا ہوں۔ چیزوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ رنگ رنگ کی چیزیں۔ چمکتی ہوئی چیزیں۔ خوبصورت دل کش چیزیں۔ میڈان فرانس۔ میڈان اطالیہ، انگلینڈ۔ یو ایس اے۔ جگہ جگہ کی چیزیں۔ ملک ملک کی چیزیں۔ ہر قسم کی چیزیں۔ پارچہ جات، ریشم کھواب نائلون کے کپڑے۔ برتن، چینی، شیشے، پلاسٹک، پتھر کے برتن۔ گھڑیاں ہی گھڑیاں۔ رسٹ واپرز سے بھرے ہوئے چھابے، ٹائم پیس، کلاک، طرح طرح کی دیواری گھڑیاں، فرج ایر کنڈیشنز، کولر، پنکھے ہی پنکھے، ٹیبل فینز، پیڈل، مٹی کے تیل سے چلنے والے پنکھے، چھت کے پنکھے، دیواری پنکھے، پاؤڈر، لپ سٹک، خوشبو کی شیشیاں، لمبوتری شیشیاں، مائل کھواب ریشم کے ڈبوں میں رکھی ہوئی شیشیاں، تسمیوں کے ڈھیر، جاء نمازوں کے انبار۔

اس بازار کو دیکھ کر میری نگاہیں پھٹ گئیں۔ ذہن کو نہ جانے کیا ہوا۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ میں یہ بھول گیا کہ میں مدینہ منورہ میں ہوں اور مسجد نبویؐ کے دروازے پر کھڑے جو توں کے رکھوالے نے نظر بھر کو مجھے دیکھا تھا اور ساری کائنات الٹ پلٹ ہو گئی تھی کہ میرے جسم کی ہڈیاں اب تک چلاؤں چلاؤں کر رہی تھیں۔

### خریدار ہی خریدار

اس بازار میں سینکڑوں زائر خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ یوں مصروف تھے جیسے علی بابا کے غار سے سامان لوٹنے میں مصروف ہوں۔ جن میں خریدنے کی استطاعت نہ تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور گرسنہ نگاہوں سے چیزوں کے ڈھیروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حسرت بھری ہوس کے انبار لگے ہوئے تھے۔ مجھے مکہ معظمہ کی مارکیٹ یاد آگئی۔ مکہ معظمہ میں میں نے قدرت سے پوچھا تھا ”کیا مکہ میں بھی شیطان کی پہنچ ہے۔“ قدرت نے جواب دیا تھا کہ ”حرم شریف کو چھوڑ کر یہاں خود ابلیس سرگرم کار ہے۔ آئیے میں آپ کو دکھاؤں۔“ یہ کہہ کر قدرت مجھے مارکیٹ میں لے گئے تھے جو حرم کے باہر بہت ہی قریب بنی ہوئی تھی۔ وہاں بھی چیزوں کی اتنی ہی افراط تھی۔ خوبصورت جاذب نظر کار آمد سستی چیزیں۔ وہاں پہنچ کر میری آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ چونکہ وہاں بھی ہر وہ چیز موجود تھی



جسے خریدنے کی زندگی بھر مجھے آرزو رہی تھی اور میں وہاں کھو گیا تھا۔  
پھر قدرت نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مجھے جھنجھوڑا تھا اور کہا تھا ”دیکھ  
لیا آپ نے۔“ اور میں نے محسوس کیا تھا جیسے مارکیٹ کے اوپر خود ابلیس بیٹھا فاتحانہ  
انداز میں مسکرا رہا ہو۔

دفعاً ”کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے جھنجھوڑا۔ میں چونکا پھر  
مجھے یاد آیا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں سامنے ابلیس کے دانت نکلے ہوئے تھے اور  
وہ حقارت سے میرا منہ چڑا رہا تھا۔

غمے سے چھلانگ لگا کر میں چوک کے درمیانی تھڑے پر چڑھ گیا۔ دائیں ہاتھ  
میں میں نے مائیک کو پکڑ لیا۔ اور با آواز بلند چلانے لگا۔

### تہرکات مدینہ

”بھائیو! سنو! سنو! یہ تم کہاں کھڑے ہو۔ مسجد نبویؐ کی دیوار کے سایہ تلے  
چراغ کے زیر سایہ۔ تم تو گھر سے اس عظیم چراغ کے نور سے منور ہونے کے لیے اتنی  
دور سے چل کر آئے ہو۔“

”رک جاؤ، رک جاؤ، بھائیو! یہ تم کیا خرید رہے ہو۔ تمہارے عزیز واقربا نے  
تو کہا تھا کہ مدینہ منورہ کی سمجھیں لانا۔ یہ سمجھیں مدینہ منورہ کی تو نہیں۔ یہ سمجھیں تو  
انٹلی کی بنی ہوئی ہیں۔ شاید ان منکوں میں وہ ذرات بھی شامل ہوں جو رومن کروسیڈرز  
کے گھوڑوں کے سموں سے جھڑے تھے۔“

”نہ نہ یہ جائے نماز نہ خریدنا۔ یہ جائے نماز مدینہ شریف کے نہیں“ ان پر تو  
یورپ کی چھاپ لگی ہے۔ جب تم یہ جائے نماز وطن لے کر جاؤ گے اور اپنے عزیزوں  
کو تحفے کے طور پر دو گے تو وہ سمجھیں گے کہ یہ جائے نماز مدینہ منورہ کے بنے ہوئے  
ہیں اور صبح شام ان جائے نماز کے ہر تار کو عقیدت سے چومیں گے۔ آنکھوں سے  
لگائیں گے۔ بھائیو! اپنے عزیزوں کو دھوکا نہ دو۔ یہ جائے نماز نہ خریدو۔“

”بھائیو اس جھلمل جھلمل بازار میں کوئی بھی ایسی چیز موجود نہیں جو مدینہ  
منورہ یا مکہ معظمہ کی بنی ہوئی ہو۔ کوئی چیز نہیں جو سعودی عرب کی پاک سرزمین کی  
بنی ہوئی ہو۔ یہ جو کجوروں کے ڈھیر تم دیکھ رہے ہو جنہیں دکاندار مدینہ شریف کی



کھجوروں کا ہانکا لگا کر بیچ رہے ہیں۔ یہ بھی مدینہ منورہ کی نہیں۔  
 ”یہاں کوئی چیز مدینہ منورہ کی نہیں۔ یہاں کوئی چیز سعودی عرب کی بنی ہوئی  
 نہیں۔ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی اسلامی ملک کی بنی ہوئی ہو۔“  
 ”تم نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر تمبرکات مدینہ خریدنے کے لیے پیسے جوڑے ہیں  
 اور اب تم وہ پیسے یورپ کی بنی ہوئی مصنوعات پر خرچ کر رہے ہو۔ ایسی چیزوں کو خرید  
 کر تم ہر سال کروڑوں روپے مغربی سرمایہ داروں کی تجوریوں میں بھر دیتے ہو۔ یہاں  
 مدینہ منورہ کا صرف ایک تحفہ ہے۔ خاک پاک۔“

### سبز جنگلے کی سلاخیں

جب قدرت پہلی مرتبہ حج پر گئے تھے تو انہوں نے مدینہ منورہ پہنچ کر جذبہ  
 عقیدت سے مسحور ہو کر مسجد نبویؐ کے سامنے میدان سے چٹکی بھر مٹی اٹھا کر اپنی  
 آنکھوں میں ڈال لی تھی۔ ان کی آنکھیں بوٹی کی طرح سرخ ہو گئی تھیں اور پھر سوج  
 گئیں کہ تین روز کھل نہ سکیں۔ اس عالم میں وہ روز سوٹا ٹیک ٹیک کر مسجد نبویؐ میں  
 پہنچے اور پھر سارا دن سوچی ہوئی بند آنکھوں سے وہاں بیٹھ رہتے چونکہ بار بار مسجد سے  
 آنا اور وہاں جانا ان کے لیے بے حد مشکل تھا۔

میں نے قدرت سے کہا تھا ”یہ آپ نے کیا کیا یہ تو سراسر حماقت تھی۔“

”ہاں۔“ وہ بولے ”تھی تو حماقت؟“

”حماقت تھی تو کی کیوں؟“

”اس حماقت کی وجہ سے کتنا نقصان ہوا؟“

”نقصان؟“ انہوں نے پوچھا۔

”تین دن آپ سبز گنبد کو نہ دیکھ سکے۔“

”ہاں۔“ وہ بولے ”تین دن سبز گنبد کو نہ دیکھ سکا۔ لیکن ان تین دنوں کے

دوران مسلسل طور پر میری بند آنکھوں کے سامنے سبز جالی معلق رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے  
 وہ سوجن نہ ہو بلکہ سبز جالی کی سلاخیں ہوں۔“

خاک پاک

مدینہ منورہ کے قیام کے دوران میں نے بڑی کوشش کی۔ مسلسل کوشش کرتا



رہا کہ کسی طرح مجھے خاک پاک دستیاب ہو جائے۔

میں نے سن رکھا تھا کہ مدینہ منورہ میں خاک پاک کی نکلیاں ملتی ہیں جو ہدیہ ادا کرنے پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔

جگہ جگہ میں نے راہ گیروں سے، دکانداروں سے، زائرین سے پوچھا کہ خاک پاک کہاں سے ملے گی۔ جواب میں سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کسی شخص نے مجھے یہ نہ بتایا کہ وہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

آخر ایک روز مسجد نبویؐ میں بیٹھے ہوئے ایک زائر نے حامی بھر لی۔ بولا، 'میرے پاس تو نہیں لیکن مجھے علم ہے کہ وہ کہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ چونکہ وہ مقام میرے ڈیرے کے قریب ہے۔ لہذا اگر آپ چاہیں تو میں کل آتے ہوئے چند نکلیاں خرید لاؤں۔ آپ مجھے کل نماز عصر سے قبل مسجد سے باہر باب نسواں پر ملے اور اپنی چیز لے لیجئے۔'

شکرگزاری کے جذبات سے میرا دل تھلکنے لگا۔

اس رات رہ رہ کر مجھے خیال آتا کہ شکر ہے میں وطن جاتے ہوئے ایک چیز تو ایسی لے جا سکوں گا جو مدینہ منورہ کی ہے۔

اگلے روز باب نسواں کے باہر وہی زائر مجھ سے ملا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے با آواز بلند پوچھا۔ کیا آپ خاک پاک لے آئے۔ اس پر وہ گھبرا سا گیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے دوسری طرف لے گیا۔ جب وہ مجھے خاک شفا کی نکلیاں دے رہا تھا تو پیچھے سے سعودی پولیس کے سپاہی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر گھسیٹتے ہوئے اسے نہ جانے کہاں لے گیا۔ میں حیران کھڑا کھڑا رہ گیا۔ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بات کیا ہے۔

اسی شام میں نے اس کا تذکرہ قدرت اللہ کے رابطہ افسر سے کیا۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا، بولا، "مفتی صاحب یہاں کچھ لوگوں نے خاک پاک کی نکلیاں بنانے کا کاروبار شروع کر لیا تھا۔ اس پر سعودی حکومت نے خاک پاک بیچنے کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ اب یہاں خاک پاک بیچنا جرم ہے۔"

جذبہ انتقام

میں وہاں چوک میں کھڑا چیخ رہا تھا، چلا دہا تھا۔ میرے منہ سے کف جاری تھا۔



”بھائیو! یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس پر مدینہ منورہ کی چھاپ لگی ہو۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے حبرک سمجھا جاسکے۔ یہاں کی خاک پاک بھی مدینہ منورہ کی مٹی سے نہیں بنی ہوئی۔ وہ بھی جو دساور سے در آمد کی جاتی ہے۔ کوئی چیز بھی اس قابل نہیں جو تہرک کے طور پر وطن لے جائی جاسکے۔ جو مدینہ منورہ کی سوغات کہلانے کی مستحق ہو۔“

”بھائیو۔ سنو سنو!!!“

لیکن کوئی بھی میری بات نہیں سن رہا تھا۔ کسی کو احساس نہ تھا کہ چوک میں کھڑا ایک زائر ان سے مخاطب ہے۔ وہ دھڑا دھڑ چیزیں خریدنے میں مصروف تھے۔ وہ ان جائے نمازوں کو یوں ہاتھ لگا رہے تھے۔ جیسے اپنی انگلیوں پر انہوں نے آنکھیں بچھا رکھی ہوں۔ ان کے ہاتھ جذبہ احترام سے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ سب ان جاء نمازوں کا یوں طواف کر رہے تھے جیسے وہ خانہ کعبہ کے غلاف کے ٹکڑے ہوں۔

”اچھا تو تم میری بات نہیں سنو گے۔“ منہ سرخ ہو گیا۔ کپٹیاں تھرکنے لگیں۔

”اچھا تو خریدو۔ خریدو۔ یہ سب چیزیں جو تمہارے سامنے پڑی ہیں۔ مقدس و حبرک ہیں۔ انہیں اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگاؤ۔ چوم کر آنکھوں سے لگاؤ۔“

روشن منکے

”ہاں ہاں یہ تمہیں مدینہ منورہ کی مٹی سے بنی ہیں۔ یہ جائے نماز خانہ کعبہ کے غلاف سے کاٹے ہوئے ٹکڑوں سے بنے ہیں۔ یہ کھجوریں اس پتھر پر لگی تھیں جو سبز گنبد کے پچھواڑی لگا ہوا ہے۔“

”خریدو۔ خریدو۔ اب سب چیزوں کو سمیٹ کر لے جاؤ۔ یہ تمہارے گھروں کو حبرک بنا دیں گی۔ تمہاری زندگی میں برکت کا باعث ہوں گی۔ خریدو۔“

جذبہ انتقام جنون بن کر میرے ذہن پر سوار ہو گیا۔

میں نے ایک جست لگائی اور تمہیں کے ڈھیر کے قریب جا پہنچا۔ ”یہ اندھیرے میں چمکنے والے منکوں کی تمہیں جو ہیں چار درجن“ یہ سیاہ منکوں والی من درجن، براؤن منکوں والی آٹھ درجن۔ ابھی بانڈھ دو۔ ابھی۔ نہ نہ انہیں اخبار کے



کانڈ میں نہ لیٹو۔ احمق کیا تمہیں پتہ نہیں کہ یہ مدینہ منورہ کی تمسکین ہیں۔ انہیں  
 میری چادر میں ڈال دو۔ اور یہ جائے نماز۔ اور یہ کھجوریں اور یہ -----۔  
 مارکیٹ کے اوپر بیٹھے ہوئے ابلیس کے دانت یوں چمک رہے تھے جیسے وہ اٹلی  
 کے بنے ہوئے اندھیرے میں روشن ہونے والی تمسکیوں کے روشن منگے ہوں۔



## حجرہ مبارک

رات کو کسی نے میرا شانہ ہلا دیا۔ میں جاگ پڑا، اٹھ کر بتی جلائی۔ قدرت میرے سرہانے کھڑے تھے۔

”چلئے۔“ وہ بولے۔

”کہاں؟“

”مسجد نبویؐ کے کھلنے کا وقت ہو گیا۔“

”لیکن آپ کی طبیعت تو ناساز تھی۔“

”اب ٹھیک ہوں۔“

### باب جبرئیل

ہوٹل کی میٹھیوں اتر کر جب ہم نیچے نیچے تو سڑک سنسان پڑی تھی۔ مسجد نبویؐ کے صدر دروازے بند تھے۔ قدرت مسجد نبویؐ کی دیوار کے ساتھ ساتھ پوں چلے جا رہے تھے جیسے راستے سے پورے طور پر واقف ہوں۔ کچھ دور جا کر وہ رک گئے۔

”ادھر آجائیے۔“ وہ دیوار کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”یہ کونسی جگہ ہے؟“ وہ دیوار کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”یہ کونسی جگہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ باب جبرئیل ہے۔ اس دروازے سے حضرت جبرئیلؑ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے پاس آیا کرتے تھے۔“

وہ ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ رازین کی قطار لگی ہوئی



تھی۔ اندھیرے میں وہ اچھی طرح نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہم دونوں دیوار کے ساتھ قطار میں کھڑے ہو گئے۔

”یہ دروازہ کہاں کھلتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”حجرہ مبارک میں۔ یہاں نوافل پڑھنا افضل العبادت ہے۔“

کئی ایک منٹ ہم وہاں دیوار سے لگے کھڑے رہے۔ آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ قطار میں کھڑے زیادہ تر لوگ عمر رسیدہ ناتواں اور نحیف تھے۔ ان کی گردنیں ہل رہی تھیں۔ ہاتھوں میں کسبکس چل رہی تھیں۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ انداز میں انتہا کی خاکساری تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ ہم سب باری باری اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔۔۔۔۔ پتہ نہیں اندر داخل ہوتے ہی ان نحیف و نزار بڑھوں کو کیا ہوا۔ ان کی گردنوں نے ہلنا بند کر دیا۔ ٹانگوں نے لڑکھڑانا چھوڑ دیا۔ پتہ نہیں ان میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی؟۔۔۔۔۔ جس طرح کوئی دہلی پتلی آسیب زدہ لڑکی پر دفعتاً ”جن چڑھ جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے“ اکڑی ہوئی گردن ’چڑھی ہوئی لال سرخ آنکھیں اور وہ عالم دیوانگی میں ادھر ادھر دیکھتی ہے‘ اس میں اتنی قوت ابھر آتی ہے کہ چار آدمی بھی اسے سنبھال نہیں سکتے۔

### جذبہ ’جنون‘

حجرے میں داخل ہوتے ہی ان دس پندرہ نحیف و نزار بڑھوں پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے وہ سب کے سب جن بن گئے ہوں۔

اس دیوانگی میں شرکا عنصر نہ تھا، جارحانہ رنگ نہ تھا۔ صرف جذبے کی وارفتگی تھی جو جنون بن گئی تھی۔

حجرے میں داخل ہوتے ہی قدرت نے دیوار کے پاس کھڑے ہو کر نفلوں کی نیت باندھ لی، اس کے پاس ہی میں نے بھی دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔ دفعتاً پیچھے سے ایک دھکا آیا۔ میں ہوا میں اچھلا اور قلابازی کھا کر مقابل کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ چند ساعت کے لیے تو مجھے سمجھ ہی میں نہ آیا کہ ہوا کیا ہے۔ پھر یاد آیا کہ مجھے نفل پڑھنے ہیں۔ میں نے اٹھ کر پھر نیت باندھی۔ چند ساعت کے بعد میں نے اپنے کو



اوندھے منہ گرا ہوا پایا۔ ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا۔  
 کچھ دیر تو میں اپنے آپ کو سنبھالنے میں مصروف رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور  
 سوچنے لگا کہ از سر نو نیت باندھوں کہ نہیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ حجرے میں  
 نمازیوں کی کیفیت دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔ ”بیکار ہے۔“ میں نے سوچا۔ ”یہاں نفل پڑھنا  
 میرے بس کی بات نہیں، نہیں میں نفل نہیں پڑھوں گا۔ اس فیصلے کے بعد میں سرک  
 سرک کر کونے میں جا بیٹھا اور حجرے کا جائزہ لینے لگا۔

### مٹی کا پہلوان

حجرے کی کیفیت عجیب سی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں کلکتے کے ”  
 بلیک ہول“ میں بیٹھا ہوں اور اس ”بلیک ہول“ میں کہیں کوئی ہاتھی گھسا ہوا ہے۔ پھر  
 میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔

قدرت اس وقت فٹ بال کی طرح حجرے میں ادھر ادھر اچھل رہے تھے۔  
 ابھی اس دیوار سے ٹکرائے۔ اب اس دیوار کے پاس اوندھے منہ پڑے ہیں۔ لو وہ پھر  
 اٹھ بیٹھے اور یوں کھڑے ہو گئے جیسے نیت نہ ٹوٹی ہو، جیسے نماز جاری ہو جیسے کچھ ہوا ہی  
 نہ ہو، ارے وہ پھر دھڑام سے پیچھے کو گرے۔ ان کے پیچھے کھڑے سات آٹھ نمازی  
 سب کے سب لڑھک گئے۔ جیسے قریب قریب کھڑی اینٹوں کی قطار میں سے ایک اینٹ  
 گرے تو ساری اینٹیں گر جاتی ہیں۔

ارے وہ تو پھر کھڑے نفل پڑھ رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ قدرت  
 صرف جسمانی طور پر گرتے رہے اور یہ جسمانی تھپڑے ان کے ذہن پر کوئی اثر نہیں  
 رکھتے تھے۔ گرنے کے بعد وہ فناک سے یوں اٹھ کر کھڑے ہوتے جیسے مٹی کے پہلوان  
 ہوں۔ نہ وہ یہ دیکھتے تھے کہ دھکا کدھر سے آیا۔ نہ یہ دیکھتے کہ انہیں کہاں چوٹ لگی نہ  
 یہ دیکھتے کہ اب کہاں کھڑے ہیں۔ وہ تو یوں اٹھ کر ہاتھ باندھ لیتے۔ جیسے سجدے سے  
 اٹھے ہوں۔

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ انہوں نے پا کھنڈ چار کھا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ  
 ایک شخص چاروں طرف سے یوں دھکے کھائے، لڑکھرائے، قلابازیاں لگائے، دیوار سے



پنچا جائے، لیکن اس کی یکسوئی میں فرق نہ آئے، نماز جاری رہے، نیت نہ ٹوٹے۔  
میں نے خود دو مرتبہ فلا بازیاں کھائی تھیں۔ کئی منٹ میں جسم کو سہلا تا رہا تھا۔  
نماز کی بات چھوڑیے ایک بار تو میں نے اپنے آپ کو یہ سوچتے ہوئے پکڑ لیا تھا کہ اب  
کی بار جس نے مجھے دھکا دیا بدھ کر اس کی گردن دیبوچ لوں تیرے فلاں کے فلاں کے  
فلاں۔

### بدھ اور نروان

قدرت کے علاوہ وہاں دوسرے لوگ بھی نفل پڑھنے کی کوشش میں لگے  
ہوئے تھے۔ انہیں بھی دھکے لگتے تھے۔ وہ بھی لڑکھڑا کر گرتے تھے اور کوشش کرتے  
تھے کہ نیت نہ ٹوٹے لیکن ان کی توجہ بھٹک جاتی اور ادھر ادھر دیکھنے لگتے اور انہیں پھر سے  
نیت باندھنی پڑ جاتی تھی۔

پھر جو میں نے دیکھا کہ ایک تازہ دھکا کھانے کے بعد قدرت میرے قریب آ  
کھڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔

ان کے چہرے کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ چہرے پر اس قدر سکون تھا جیسے پہاڑ  
کے ویرانے میں سنولائن (Snow line) سے اوپر کسی کھوہ میں تن تنہا کوئی یوگی  
دھیان لگائے بیٹھا ہو۔ ان کے چہرے پر کوئی الجھن نہ تھی۔ فکر کی کوئی سلوٹ نہ تھی۔  
”زرردگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بڑے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے“  
بدھ ”ہوں جنہیں نروان حاصل ہو چکا ہو۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا  
ہے۔ یہ تقاضہ بشری کے منافی ہے۔ یہ لوگ جو اس افراتفری میں بھی دھیان لگائے  
رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، کیا بشری تقاضوں سے بے نیازی حاصل کر چکے ہیں؟

دفعتا ”مجھ پر انکشاف ہوا کہ صرف وہی لوگ اس حجرہ میں نفل ادا کر سکتے ہیں  
جنہیں اللہ نے Unison کی نعمت بخشی ہے۔ صرف وہی لوگ جو پہلے سے نوازے  
ہوئے ہیں۔ صرف وہی لوگ جنہیں پہلے ہی سے اللہ اور محمدؐ کی خوشنودی حاصل ہے۔

یا رسول اللہ! مجھ سے گنہگاروں پر یہاں نفل پڑھنے کے دروازے کیوں بند کر  
دیے گئے ہیں؟ مجھ سے دنیا دار جنہیں یک سوئی کی طاقت حاصل نہیں جو پہلے ہی سے  
نوازے ہوئے نہیں وہ اس نعمت عقلی سے کیوں محروم ہیں؟“



## اجلے اور میلے

”یا رسول اللہ! کیا تیری درگاہ میں بھی صرف اجلوں کو مزید اجلے ہونے کے مواقع میسر ہیں، کیا میلوں کو یہاں بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے؟“

اس حجرے میں میرے نفل پڑھنے کا کوئی امکان نہ تھا، ”ہٹاؤ“ میں نے سوچا۔

”زبردستی کرنے کا کیا فائدہ ہے؟“ کونے میں بیٹھ کر میں چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا، ان زائرین کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس دھکم پیل میں بھی اللہ کی طرف دھیان لگائے رکھنے کی طاقت رکھتے تھے۔ میں ان کی نگاہوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہاں مجھ ایسے لوگ بھی تھے جو نیت قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ پھر بھی زبردستی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ جو ٹوٹی ہوئی نیت کو زبردستی بندھی ہوئی نیت سمجھ رہے تھے۔ جو وہاں ستر ہزار نمازوں کا ثواب حاصل کرنے پر مصر کھڑے تھے جو خود پر دوزخ کی آگ حرام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

وہ سلام

”یا رسول اللہ!“ میرے دل سے ایک منت ابھر رہی تھی جسے دبانے کی شدید کوشش ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ ”یا رسول اللہ! یہاں میں ستر ہزار نمازیں اپنے نام کرانے کے لیے حاضر نہیں ہوا۔ بہشت میں اپنی جگہ محفوظ کرانے کے لیے یہاں نماز پڑھنے کا متمنی نہیں ہوں۔ میں تو صرف اس لیے یہاں نماز پڑھنا چاہتا ہوں کہ تیرے گھر کی دہلیز پر کھڑا ہو کر تجھے سلام کروں۔“

وہ سلام نہیں جو دوسرے پر سلامتی بھیجتا ہے۔ وہ سلام نہیں جو کتابوں میں لکھا ہوتا ہے۔ بلکہ وہ سلام جو ایک ادنیٰ عاجز مسکین فحخص ایک اعلیٰ اور ارفع ہستی کو جھک کر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کرتا ہے۔ میری آرزو ہے۔ اپنی عقیدت کا اظہار کروں۔ تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سجدہ کروں۔ تیری خوشنودی سے عظیم تر نعمت کیا ہو سکتی ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ترے قدموں میں کھڑا ہو کر نعرہ لگاؤں کہ اے عظیم ترین انسان! میں تو تنگ انسانیت ہوں، میں تجھے سلام کرتا ہوں تو جو میرا سلام قبول کر لے تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے اور تجھے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایسے



مخص کا سلام کیوں قبول کیا؟ جو انسانیت کے نام پر کلنگ کا ٹکڑہ ہے۔  
 "دفتنا" میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔ جو سلام پھیر چکے تھے اور میری طرف  
 بڑی شفقت سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ان کی مسکراہٹ میں حضور  
 اعلیٰ کا پیغام جھلک رہا ہو کہ "اے ممتاز! ہم نے تیرا سلام قبول کیا۔"  
 "آؤ اب چلیں۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔ فرط انبساط سے قدرت کی باچھیں  
 کھلی ہوئی تھیں۔ وہ چل پڑے اور میں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

باب جبرئیل سے زائرین کا ایک تازہ ریلا آیا اور ہم چشم زدن میں حجرے  
 سے باہر نکل گئے۔ میں نے دیکھا کہ ہم مسجد نبویؐ کے اس حصہ میں جا نکلے ہیں جو ترکی  
 کی تعمیر کا چھتا ہوا وسیع و طویل دالان ہے۔ جس میں یہاں وہاں قطار میں کئی ستون  
 کھڑے ہیں۔ قدرت دالان میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ مڑ گئے۔ ہمارے سامنے  
 مزار مقدس کا سبز جنگلا تھا۔

جنگل کے سامنے قدرت رک گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا پڑھنے لگے۔ میں نے بھی  
 ان کے پیچھے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا لیے۔ جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ حضور اعلیٰ کی  
 خدمت اقدس میں پیش کرنے کے لیے میرے پاس کوئی دعا نہیں۔

دعا

دعا کے معاملے میں میں عام مسلمانوں کی طرح بہت احمق واقع ہوا ہوں۔ نہ  
 جانے کیوں دعا مانگتے وقت میرے دل کی گہرائیوں سے یہ خیال ابھرتا ہے کہ دعا سنتے  
 وقت اللہ تعالیٰ تنک بخش مولوی صاحب کا روپ دھار لیتے ہیں۔ پہلے وہ ناک پر رومال  
 رکھ لیتے ہیں۔ پھر ہاتھ میں ایک چمٹی پکڑ لیتے ہیں۔ اور گندی 'غلیظ' ہوس بھری اور  
 ناجائز دعاؤں کو اس چمٹی سے اٹھا اٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ پھر ناک سے رومال ہٹاتے  
 ہیں۔ چمٹی ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور ہاتھ دھو کر بچی کچی صاف ستھری دعاؤں کا  
 جائزہ لیتے ہیں۔ ان میں سے بھی نامعقول دعائیں نکال کر پھینک دیتے ہیں اور پھر بقیہ  
 دعاؤں کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں کہ فرصت کے وقت ان پر غور کریں گے۔

لاشعور میں رچے بے ہوئے اس اعتبار کی وجہ سے مجھ ایسے عام گنہگار  
 مسلمانوں نے نہ تو کبھی دعا کے مفہوم کو سمجھا ہے۔ نہ مانگنے کے فعل کو جانا ہے۔ اور نہ



قبول کرنے والے کی عظمت کا راز پایا ہے۔

میری اپنی حالت یہ ہے کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے سے پہلے سوچتا ہوں کہ کہیں میں اتنا تو نہیں مانگ رہا کہ دینے والے پر بوجھ ہو جائے؟ کہیں ایسی چیز تو نہیں مانگ رہا جو ناجائز ہے جو غلیظ ہے، جس میں گناہ کا عنصر موجود ہے۔ کہیں اس دعا سے میری طبیعت ہوس کا بھید تو نہیں کھلتا؟ پھر میں عرض کرتا ہوں کہ یا اللہ! میں حریص نہیں ہوں، میں تجھ سے زیادہ نہیں مانگتا۔ صرف اتنا مانگ رہا ہوں جس کی مجھے اشد ضرورت ہے اور جسے دینا تیرے لیے بار نہ ہو گا۔

مانگنے والا اور دینے والا

اس کے ساتھ ہی میرے دل سے ایک ہلکی سی آواز آتی ہے۔ اتنی ہلکی سی کہ سنی نہیں جاسکتی۔

”یا اللہ دیکھ لے میں کتنا اچھا آدمی ہوں۔ میں نے تجھ پر بوجھ نہیں ڈالا۔ میں نے ایسی دعا نہیں مانگی کہ تجھے ناک پر رومال رکھنا پڑے، چمٹی اٹھانی پڑے، یا اللہ دیکھ لے ایسی دعا مانگ کر میں نے تجھ پر کتنا احسان کیا ہے؟“

غلام دین وانی

میرے ایک دوست ہیں 'غلام دین وانی'۔ انہوں نے ساری عمر نمازوں اور عبادتوں میں گزار دی ہے لیکن آج تک وہ ”دعا“ ”مانگنا“ اور ”دینے والے“ کے مفہوم سے واقف نہیں۔ وہ اتنی خست سے دعا مانگتے ہیں کہ میرے نزدیک ان کی دعا دینے والے کی توہین کا باعث ہو جاتی ہے۔

ان کی دعا کا متن کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ”یا باری تعالیٰ! بے شک مجھے زیادہ نہ دے لیکن اتنا تو دے کہ میرا گزارہ ہو جائے۔ یا اللہ! اور کیا عرض کروں۔ تو مالک ہے جیسے تیری مرضی۔“

میں نے بارہا غلام دین وانی کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ باری تعالیٰ کے حضور میں دعا مانگو تو اس پر قبول کرنا عاید کرنے کی کوشش کرو۔ یوں کہ ”یا باری تعالیٰ! میرا کام مانگنا تیرا کام دینا ہے۔ تو جو بن مانگے دیتا ہے مانگنے پر کیوں نہ دے گا۔ ضرور دے گا۔ یا باری تعالیٰ مجھے دے، اتنا دے کہ پھر مانگنے کی حاجت نہ رہے۔“ بارہا میں



نے وانی صاحب سے کہا ہے ”یا تو مانگو۔۔۔۔۔ دینے والے پر پورا بھروسہ کر کے مانگو اور یا نہ مانگو۔ یہ کیا ظلم کرتے ہو کہ مانگتے بھی ہو ساتھ یہ بھی تاکید کرتے جاتے ہو کہ زیادہ نہ دینا۔ پھر اپنی مسلسل تنگ دستی پر روتے بھی رہتے ہو۔ یہ کیا تک ہے کہ ایک طرف مانگتے ہو دوسری طرف دینا یا نہ دینا اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہو کہ آگے تو مالک ہے جو تیری مرضی۔“

### سچا منگتا

پہلی مرتبہ جب میں نے ایک شخص کو مانگتے ہوئے سنا تو حیران رہ گیا۔ داتا کا مزار تھا۔ ایک جنا دھاری فقیر آیا۔ یوں داخل ہوا جیسے مقروض کے گھر قرض خواہ آیا ہو۔ اس نے داتا کو لاکارا۔ ”تو جو داتا بنا بیٹھا ہے تو دے۔ دیکھ تیرے دوار پر مانگنے والا آیا ہے۔ دے۔ دس کروڑ روپے کا سوال ہے دس کروڑ روپے دس کروڑ روپے“

----- ”دس کروڑ روپے“ چلاتا ہوا وہ دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔

”ارے۔“ میں بھونچکا رہ گیا۔ ”یہ جنا دھاری ہو کر روپیہ مانگ رہا تھا۔ اپنی اس مانگ پر ندامت نہیں محسوس کر رہا تھا۔ ہمارے طرح داتا کو خیس مولوی نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ داتا ناک پر رومال رکھ لیں گے۔ ہاتھ میں چمٹی اٹھا لیں گے۔“

”ارے“ گویا میری آنکھیں کھل گئیں۔ زندگی میں میں نے پہلی مرتبہ سچا مانگنے والا دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ ایک ایسا شخص جو مانگنے کی عظمت سے واقف تھا۔ جو داتا کو داتا سمجھتا تھا۔

ہاں تو حضور اقدس کی جالی کے پاس کھڑے ہو کر قدرت کو دعا پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں نے بھی ہاتھ اٹھا لیے لیکن چند ساعت کے لیے میں خالی ہاتھ اٹھائے کھڑا رہا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا دعا مانگوں۔ دعا مانگنے میں میں کئی بار فاش غلطیاں کر جایا کرتا ہوں۔ لہذا ایسے وقت میں ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں جذبات طاری نہ ہو جائیں اور تنگ میں ایسی بات نہ کہہ دوں کہ بعد میں شرمساری سے اپنے آپ سے منہ چھپاتا پھروں۔

کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازیاں اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ



میں جذبات کی رو میں بہہ کر اللہ کے حق میں دعائیں مانگنے لگتا ہوں کہ ”یا اللہ تو اتنا اچھا ہے کہ اللہ تجھے خوش رکھے۔ اللہ تجھے عظمتیں بخشے“۔۔۔۔۔ پھر دفعتاً ”مجھے احساس ہوتا ہے کہ یہ میں کیا بک رہا ہوں۔ کیا میں باری تعالیٰ پر ایک اور اللہ مسلط کر رہا ہوں۔ اس پر اتنا شرمسار ہوتا ہوں کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پھر مجھے غصہ آنے لگتا ہے کہ میرے اللہ مجھ پر اتنی کرم فرمائیاں کرتے ہیں اور میں ان کے حق میں دعا بھی نہیں مانگ سکتا۔

حضور اقدسؐ کی خدمت میں کھڑے ہو کر میرے ذہن میں صرف ایک بات آئی سو میں نے عرض کر دی ”یا حضورؐ! میں اتنی دور سے چل کر اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی خدمت میں سلام عرض کروں آپ کی کتنی کرم نوازی ہے کہ حضورؐ نے مجھ ایسے کا سلام قبول فرمایا اللہ آپ کو مزید عظمتیں عطا فرمائے مزید رفعتوں سے نوازے۔ مزید قرب حاصل ہو۔“

دفعتاً ”مجھے خیال آیا کہ یہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ گویا عرش بریں سے کہہ رہا ہوں کہ اللہ آپ کو عرش بریں کے مرتبے سے نوازے۔“

”یا حضورؐ“ میں نے شرمساری سے عرض کی ”میری باتوں کا برانہ مانجئے میں بیوقوف ہوں جاہل ہوں۔“

عین اس وقت مجھے درود تاج یاد آ گیا اور میں حضورؐ کی حمد و ثناء میں اپنی محنت مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

## دھنکی

جنگلے کو پکڑے ایک صاحب دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ دوسرے صاحب کی آنکھوں سے خاموش آنسو رواں تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی روؤں۔ لیکن میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔

گذشتہ گناہوں پر سچے دل سے توبہ کی جائے تو رقت پیدا ہوتی ہے۔ رقت گویا ایک دھنکی ہے جو روح کو دھنک کر رکھ دیتی اور قلب میں ایک نئی پاکیزگی پیدا کر دیتی ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ مجھ پر بھی رقت طاری ہو، میری روح بھی دھنکی جائے، مجھ میں ایک نئی پاکیزگی پیدا ہو لیکن مجھ پر کبھی رقت طاری نہیں ہوئی شاید اس لیے کہ



میں نے سچے دل سے گزشتہ گناہوں پر کبھی اظہارِ ندامت نہیں کیا۔ کبھی اظہارِ توبہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مجھے اپنی معصیت کا احساس نہیں یا مجھے اپنے گزشتہ گناہوں پر ندامت نہیں۔

یقین جانیئے مجھے گناہ سے آلودہ ہونے کا شدت سے احساس ہے لیکن جب بھی مجھے توبہ کا خیال آتا ہے تو اندر سے ایک آواز آتی ہے کہ توبہ کرنے کا حق صرف اسے حاصل ہے جسے اپنے آپ پر اعتماد ہو۔ جو یقین سے کہہ سکے کہ آئندہ گناہ کا اعادہ نہ ہو گا۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔

سب سے بڑا انسان اور رسول اللہ

دفعتا" میری نگاہ قدرت پر جا پڑی۔ جنگلے سے ذرا پیچھے ہٹ کر وہ ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔

"یا اللہ۔ اتنی لمبی دعا؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان کی جانب دیکھا۔ "میرے اللہ! یہ قدرت کو کیا ہوا ہے؟" میرے سامنے قدرت نہیں ایک نحیف و نزار بوٹھا کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ ڈھلک گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک گل ہو گئی تھی۔ پیشانی پر بے شمار سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ منہ پر منوں عجز کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گردن خاکساری کے دباؤ تلے ڈھلکی ہوئی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے عجز و انکسار میں جان پڑ گئی ہو۔ "یہ دعائیہ انداز تو نہیں" میں نے سوچا۔ "رقت بھی نہیں۔ احساس معصیت بھی نہیں" پھر یہ عجز کیا ہے؟

جنگلے سے لپٹے ہوئے زائر نے ایک نعرہ مارا۔ میری توجہ اس کی جانب مرکوز ہو گئی۔

پھر جو دوبارہ میں نے قدرت کی طرف دیکھا تو وہ مزید بوڑھا ہو چکا تھا۔ ہر ساعت کے بعد ان کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتا" میں نے محسوس کیا کہ وہ دعا نہیں پڑھ رہے تھے، حمد و ثنا نہیں کر رہے تھے۔ ارے۔ شاید وہ حضوری میں کھڑے ہوں۔ میں نے پھر سے غور سے انہیں دیکھا۔ میرے دل پر ایک خوف طاری ہو گیا۔

جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت اور عظمت کو میں نے صرف سنا ہے



پڑھا جانا نہیں۔ قدرت کے عجز و انکسار کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ ضرور اس شخص نے حضورؐ کی عظمت و رفعت کو جانا ہے۔ ان کا انگ انگ اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ وہ اس لمحے میں بھی 'جائنے' کے عالم میں تھے۔ یہ محسوس کرتے ہی میرے جسم و روح میں خوف کی ایک پھریری سی چل گئی۔ "یا اللہ! تیرا رسول اتنا عظیم ہے۔ اتنا عظیم" اب تک میں دنیا کے عظیم ترین انسان کی خدمت میں حاضر تھا۔ لیکن اب جناب رسول اللہؐ کی خدمت اقدس میں ایسنا دہ ہو گیا۔ قدرت نے دعا ختم کر لی۔

"چلو چلیں۔" انہوں نے مجھے اشارہ کیا۔

"کیوں نہ ہم اس جگہ پر قبضہ جمالیں۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر ان پر شدید گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ "نہیں نہیں ایسا نہیں

سوچنا چاہیے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں دوسروں کو موقع دینا چاہیے۔" یہ کہہ کر قدرت مسجد کے دوسرے

حصے کی طرف چل پڑے۔ دور جا کر ہم دنوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ میں نے ان کی

جانب دیکھا۔ آہستہ آہستہ ان کی کیفیت نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ مسجد میں پہنچ کر ان پر

ایک عجیب سا سکون طاری ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ندی پہاڑی علاقے میں

سر پہنچتی، دوڑتی بھاگتی آتی ہے اور پھر میدان میں پہنچ کر اس کا پانی چاروں طرف پھیل

کر ساکن ہو جاتا ہے۔ اس روز سارا دن قدرت پر ایک عجیب سا سکون طاری رہا۔

اذان ہوتی تو وہ مسجد کی طرف چل پڑتے۔ "چلئے اذان ہو گئی۔" وہ مجھ سے کہتے۔ ان

کے انداز میں تڑپ یا بے قراری نہ تھی۔ انہیں یہ فکر بھی دامن گیر نہ تھی کہ نماز کے

لئے مسجد کے اندر جگہ ملے۔

مسجد نبویؐ نمازیوں سے بھر جاتی ہے تو لوگ مسجد کے سامنے میدان میں صفیں

بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہیں نماز ادا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بھیڑ

کے باوجود زبردستی مسجد میں گھس جاتے تاکہ مسجد کے اندر نماز پڑھیں۔

بے نیازی اور شور اشوری

سارا دن قدرت یا تو مسجد کے باہر نماز پڑھتے اور یا مسجد کے عوامی حصے میں۔



سارا دن وہ نہ تو مزار مقدس کی طرف جاتے نہ ترکی والان کی طرف۔ ”یا اللہ یہ کیا اسرار ہے؟“ صبح اتنی شور اشوری اور اب اتنی بے نیازی۔ ”بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔“

مدینہ منورہ میں پہنچ کر میری کیفیت ایسی تھی جیسے کوئی خالی ورق ہو، خالی برتن، جیسے شہ نہک گیا ہو اور خالی کھگاراہ گیا ہو۔

شام کو مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد جب ہم ہوٹل میں واپس پہنچے تو قدرت اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ دل پر ایک عجیب سی اکتاہٹ طاری تھی۔

کمرے میں پہنچا تو وہاں ایک صاحب بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ”آپ مفتی صاحب ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔  
”جی فرمائیے۔“

”میں مدینہ منورہ کی پاکستانی ڈسپنری کا ڈاکٹر ہوں“ وہ بولے۔  
”جی“ میں نے کہا۔

”میں شہاب صاحب کو ایک پیغام دینے آیا ہوں۔“  
”آپ ان سے خود مل لیں۔“

”نہیں نہیں“ وہ بولا۔ ”انہیں تکلیف نہ دیجئے۔ آپ میرا پیغام لے جائیے اور جواب میں جو وہ فرمائیں مجھے بتا دیجئے۔“  
”بہت اچھا۔ فرمائیے۔“

”ان سے کہئے کہ آج شب کو نماز عشاء کے بعد مسجد نبوی، خصوصی طور پر شاہ مراکو کے لیے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے کھلے گی۔ میں نے انتظام کر دیا ہے کہ اگر شہاب صاحب یا ان کے ساتھی مسجد نبوی میں جانا چاہیں تو بعد شوق چلیں۔ میں انہیں ساتھ لے چلوں گا۔“

سنہراموقع

”کیا کہا۔ مسجد نبوی، خصوصی طور پر کھولی جائے گی۔“

ہاں، وہ کہنے لگا آپ جہاں چاہیں نوافل ادا کر سکتے ہیں۔ جہاں چاہیں بیٹھ کر



تلاوت کر سکتے ہیں۔ "خوشی اور حیرت سے میری کنپٹیاں تھرکنے لگیں۔" تو کیا میں حجرہ مبارک میں نفل ادا کر سکوں گا؟" اس عظیم خوش خبری پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔  
میں بھاگا بھاگا قدرت کی طرف گیا۔ میں نے بڑے شوق سے انہیں یہ خوشخبری سنائی۔

جواب میں قدرت نے صرف اتنا کہا۔ "اچھا تو ڈپنری والے ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ وہ میرے پرانے واقف ہیں۔ چلئے میں انہیں مل لوں۔"  
قدرت ڈاکٹر سے بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک ان کا مزاج پوچھتے رہے۔  
آخر میں بڑی معذرت کے ساتھ کہنے لگے۔ "ڈاکٹر صاحب میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ افسوس کہ میں اس سنہری موقع کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔" ساتھ ہی انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مفتی صاحب بے شک آپ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ مسجد نبویؐ میں حاضری دے آئیں۔" میرا ذوق و شوق ٹھنڈا پڑ گیا۔ قدرت کے جواب نے گویا مجھ پر برف کی سل رکھ دی۔

"شکریہ ڈاکٹر صاحب" میں نے کہا۔ "میرے وہاں اکیلے جانے سے کیا ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میرے دل میں غصے کا ایک طوفان چلنے لگا۔ جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔ یہ ناسازگی طبیعت کا ڈھونگ کس لیے رچایا جا رہا ہے۔ یہ انجائینا کے دورے یہ Resistance کا ٹانگ۔ منافقت۔ منافقت۔ منافقت!

ساری رات مجھے غصے میں نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتا رہا اور قدرت کو برانہ کہنے کی شدید جدوجہد میں مصروف رہا۔

پھر پتہ نہیں میری آنکھ لگ گئی تھی یا ابھی نیم خوابی میں تھا کہ کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"کون ہے؟" میں چلایا۔

"میں ہوں۔" قدرت نے جواب دیا۔

"آپ؟"

"ہاں چلئے باب جبرئیلؑ کھلنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

اس وقت میرا جی چاہا کہ اٹھ کر دونوں شانوں سے انہیں اوپر اٹھاؤں اور



ہوٹل کی کھڑکی سے باہر پھینک کر ہاتھ جھاڑوں اور پھر آرام سے لیٹ کر سو رہوں۔  
اس اثنا میں قدرت نے جی جلا دی کمرہ منور ہو گیا۔ میں نے ان کی جانب  
دیکھا۔ ان کے چہرے پر اتنی معصومیت چھائی ہوئی تھی اور ان کا انداز اس قدر  
Appologetic تھا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ میں نے جلدی سے جو تا پہنا، ٹوپی  
رکھی اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

پھر حجرہ مبارک میں اپنے مخصوص کونے میں بیٹھا قدرت کے بیٹنے کا تماشہ دیکھ  
رہا تھا۔ اس روز زائرین کے شوق کی کیفیت کچھ زیادہ ہی جارحانہ تھی۔ پہلی رکعت میں  
انہوں نے چھ مرتبہ قلابازیاں کھائیں، دو بار دیوار سے ٹکرائے اور پھر سے ہاتھ باندھے  
کھڑے ہو گئے۔ پہلے روز میں حیرت ہمدردی اور تحسین سے قدرت کی طرف دیکھتا رہا  
تھا۔ آج انہیں بیٹے اور دھکے کھاتے دیکھ کر مجھے ایک انجانی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔  
”اچھا ہوا۔۔۔۔۔ اب تو جناب کی ناسازی طبع درست ہو گئی ہوگی۔۔۔۔۔“  
”بہت اچھے۔ جیسے کو تیسرا۔“

میں محسوس کر رہا تھا جیسے رات مسجد نبویؐ میں خصوصی حاضری سے انکار پر  
حجرہ مبارک ان سے انتقام لے رہا ہو۔

اس روز نوافل سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ میرے پاس آئے تو ان کی  
حالت قابل ترس تھی۔ منہ سو جا ہوا تھا۔ چہرہ ڈھلکا ہوا۔

”آئیے مفتی صاحب چلیں“ وہ بولے۔ پھر وہ سبز جنگلے کے پاس کھڑے دعا  
مانگ رہے تھے۔ اس روز حضوری اور تابناک تھی، حاضر کی آنکھیں چندھائی ہوئی  
تھیں۔ وہ مجسم ادب اور عجز بنا کھڑا تھا۔

اس روز میں یہ بھول گیا کہ میں بھی سبز جنگلے کے پاس کھڑا ہوں۔ میں یہ بھول  
گیا کہ حضور اعلیٰؐ کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کو میرے پاس کوئی دعا تھی یا نہیں۔  
قدرت وہاں کھڑے دعا پڑھتے رہے۔ اور میں ان کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔

شی

وہاں کھڑے کھڑے وہ ساٹھ سال کے ہو گئے۔ اسی سال کے ہو گئے۔ سو سال  
کے ہو گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ریڈر بیگرڈ کی شی کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، اور میں وہ تیز



رفتاری سے بوڑھی ہوئی جا رہی ہو۔ ساتھ ہی مجھے ایسے لگا جیسے قدرت کا مجھ پر جو ظلم تھا وہ ٹوٹ چکا ہے۔

”آئیے چلیں“ انہوں نے مرا بازو پکڑ کر مجھے جنمھوڑا۔ میں چونک پڑا۔ دو ایک ساعت کے لیے، سمجھ میں نہ آیا کہ میں کہاں ہوں اور قدرت مجھے کیوں کھینچ رہے ہیں؟

پھر جب ہم مسجد نبویؐ کے عمومی حصے کے ایک کونے میں جا بیٹھے تو مجھے ہوش آیا اور میں نے ایک بار پھر شدید غصے کا ریلا محسوس کیا۔

”کتنی ہڈیاں ٹوٹیں آپ کی؟“ میری بات میں بلا کی طنز تھی۔

”ہڈیاں“ وہ بولے ”نہیں تو۔“

”کتنے زخم آئے“ میں نے پوچھا۔

”زخم تو نہیں آیا کوئی۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”گرے تو آپ کئی بار تھے۔“

”اچھا۔ میں گرا تھا کیا؟“

”آپ کو یاد نہیں کیا؟“

”مجھے خیال نہیں آتا کہ میں گرا تھا۔“

”آپ کی نیت نہیں ٹوٹی ان حالات میں؟“

”کن حالات میں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”حجرہ مبارک میں جو حالات ہوتے ہیں ان حالات میں۔“

”حجرہ مبارک میں تو زائر عبادت کرتے ہیں۔“

”تو کیا اکھاڑے میں بھی لوگ عبادت کرتے ہیں؟“

آداب عالیہ

وہ مسکرا دیے۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی بے بسی تھی۔

”کل رات کو جب مسجد نبویؐ شاہ مراکو کے لیے خصوصی طور پر کھلی تھی۔

اس وقت آپ نے مسجد نبویؐ میں آنے سے کیوں انکار کر دیا تھا؟“

ان کے چہرے کی سلوٹیں سرک سرک کر یوں ڈھیلی پڑ گئیں جیسے معذرت



اور ندامت سے بھیک گئی ہوں۔

”دیکھیے نا“ وہ بولے ”کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

”کیا اچھا نہیں لگتا؟“

”اس طرح مسجد نبویؐ میں آنا کچھ اچھا نہیں لگتا“

”کس طرح؟“

”کسی خصوصی حیثیت سے۔ جب‘ جب مسجد نبویؐ خصوصی طور پر کھولی

جائے۔ صاحب حیثیت لوگوں کے لیے کھولی جائے۔ میں۔ میں۔ میں۔“ وہ اٹک اٹک

کر رک گئے۔ پھر سنبھل کر بولے۔ ”حضورؐ کی خدمت عالیہ میں حاضری دینے کے کچھ

واب ہونے چاہئیں۔“

”اللہ اکبر۔۔۔۔۔ اللہ اکبر۔“ مسجد نبویؐ کے مؤذن کی اذان گونجی۔



## مسجد نبویؐ

اس روز ۱۶ مارچ کا دن تھا۔ ۱۹۶۸ء میں مسجد نبویؐ میں ابھی فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی۔

اس روز بھی قدرت نے مجھے صبح کازب کے منہ اندھیرے میں جگا دیا تھا۔ پھر ہم دونوں باب جبرئیلؑ سے داخل ہو کر حجرہ پاک میں پہنچے تھے جہاں قدرت نفل پڑھنے میں مصروف ہو گئے تھے اور میں ایک کونے میں بیٹھ کر ان کی کیفیت دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت قدرت اس باکنگ گیند کی طرح تھے جو رے سے بندھی ہوئی ہوتی ہے اور جسے باکنگ کی مشق کرنے والے گھونے مارتے رہتے ہیں۔ وہ اچھلتی ہے۔ گھومتی ہے پھدکتی ہے۔ جھولتی ہے لیکن رے کے مرکز پر قائم رہتی ہے۔

حجرے میں لوگوں کا ہجوم قدرت کو چاروں طرف سے دھکے دے رہا تھا لیکن وہ نماز کے رے سے بندھے رہے۔۔۔۔۔۔ دھکے ٹھوکریں قلابازیاں ان کی نیت نہیں توڑ سکتی تھیں۔

حجرے میں نفل ادا کرنے کے بعد وہ باہر سبز جنگلے کے پاس بڑے اوبہ عجز اور انہماک سے دعائیں مانگتے رہے تھے۔ پھر ہم دونوں مسجد کے وسطی صحن میں جا بیٹھے تھے اور نماز فجر ادا کرنے کے لیے اذان کا انتظار کرنے لگے تھے۔

اس وقت مسجد نبویؐ میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ سو ڈیڑھ سو ہوں گے۔ وہ سب عبادت میں مصروف تھے اور اذان کا انتظار کر رہے تھے۔ دفعتاً "سبز گنبد کی طرف سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔



## باادب با ملاحظہ ہوشیار

مکہ معظمہ کی طرح مسجد نبویؐ کی اذان بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ وہ اٹھا کر بٹھا دیتی ہے۔ مسجد نبویؐ کے اکوستکس بھی (Acoustics) اس انداز سے قائم کیے گئے ہیں کہ آواز بڑے گیند کی طرح اچھلتی ہے۔ ایک سے زیادہ مؤذن اذان میں شرکت کرتے ہیں۔ ایک آواز اللہ اکبر ختم کر نہیں پاتی کہ دوسری آواز اسے پھر سے اٹھا لیتی ہے۔ یوں ایک ڈرامائی ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ دلوں پر Suspense کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے، جیسے ابھی خطیبوں کے ہوشیار خبردار کے آوازے ختم ہوتے ہی ظل الہی داخل ہو جائیں گے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اذان کے بعد اللہ تعالیٰ خود تشریف لا کر نمازیوں کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے تاکہ لوگوں کے سجدے صحیح معنوں میں سجدے بن جائیں۔

## مرد قدیم

ابھی مؤذن نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا ہی تھا اور مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگ چونکنے کے عالم میں ہی تھے کہ میری نگاہ اوپر کواٹھ گئی۔ اور وہ سامنے کھڑے تھے۔ وہ مجھ سے بہت دور تھے لیکن میں انہیں اس قدر قریب دیکھ رہا تھا جیسے میری آنکھوں پر زوم لنز (Zoom Lense) فٹ کر دیا گیا ہو۔

مجھے ایسے لگا جیسے مسجد نبویؐ کی چھت کے برابر اونچی ایک کتاب کھڑی ہو گئی ہو اور تاریخ اسلام کی اس کرم خوردہ کتاب کے جہازی اوراق سے نیچے اتر کر وہ مسجد نبویؐ میں داخل ہو گئے ہوں۔ ان کے چہرے اور لباس کی ایک ایک تفصیل واضح تھی۔ میرے سامنے ایک عرب کھڑا تھا جو آج کے جدید عرب سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ جس کے خدخال، طور طریقے، چال ڈھال پر قدامت کی مرثبت تھی۔ اس ماحول میں وہ یکسر منفرد تھا۔ منفرد و ممتاز۔

ان کا رنگ سانولا تھا۔ اس حد تک سانولا جیسے لوہے کے بنے ہوئے ہوں۔ بشرے پر وقار تھا، بنجیدگی تھی، مستعدی تھی، خرد مندی تھی، ہوشیاری تھی، معاملہ فہمی تھی، خود آگاہی تھی، جنگجویی تھی، عزم تھا، سپہ سالاری تھی۔



انہیں دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ منتظم ہیں، سردار ہیں، حکم دینے کے عادی ہیں۔

ان کا چہرہ نورانی نہیں تھا جیسے کونے میں بیٹھ کر عبادت کرنا ان کا شعار نہ ہو۔ ان کے بشرے پر علم کی جھلک نہیں تھی، خود ستائی نہ تھی جو عالم کے چہرے پر تنہو کی طرح تنی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ علم کے تخت پر جلوہ افروز نہیں تھے جیسے علماء ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کے انداز سے عمل مترشح ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سپاہی بازوؤں کے بل بوتے پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو۔ ان کے چہرے پر حواکھی یا سپردگی نہیں تھی۔

ان کے بشرے پر عجیب سی کرسنگی پھیلی ہوئی تھی۔ بے نام سا کڑا پن۔ اس کڑے پن میں محافظین مسجد نبویؐ کی جھلک موجود تھی۔

### محافظین حرم

پہلے دن جب میں نے محافظین حرم کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ ”ارے یہ کون ہیں؟“ میں نے قدرت سے پوچھا۔

”یہ مسجد نبویؐ کے محافظ ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”مسجد نبویؐ کے محافظ؟“

”ہاں۔“ قدرت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن یہ کونسی مخلوق ہیں؟“

”کیا مطلب؟“

”ان کے چہروں پر جذبات کی کوئی رمت نہیں، کوئی حرکت نہیں، جیسے منجمد ہوں، مقفل ہوں، سربستہ ہوں۔“

”دیکھ لیجئے“ قدرت نے کہا۔ ”ایسے ہی ہیں۔“

”دیکھ ہی تو رہا ہوں۔ آخر اس کی کوئی وجہ ہوگی؟“

”پتہ نہیں۔“ وہ بولے۔

”کیا انوار کی بارش احساسات کو منجمد کر دیتی ہے۔ کیا قرب کا تسلسل انسان کو

مرد آہن بنا دیتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں تو منجمد لوگ آکر پھل جاتے ہیں“



مقتل دل اپنے پٹ کھول دیتے ہیں، آہنی قلب بنے لگتے ہیں، خشک آنکھیں پر نم ہو جاتی ہیں۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ انوار کی رم رجم سیال بنا دیتی ہے لیکن انوار کی موسلا دھار اور مسلسل بارش پھر سے منجمد کر دیتی ہے۔

دیر تک میں سوچ میں کھویا رہا۔ پھر میں نے پوچھا۔

”آپ کو یقین ہے کہ یہ لوگ انسان ہی ہیں؟“

”کیا مطلب؟“ قدرت نے پوچھا۔

”شاید جن ہوں اور انسان کی شکل میں یہاں گھومتے پھرتے ہوں۔“

”آپ نے باب نسواں پر متعین پاپوش محافظہ کو غور سے دیکھا ہے کیا؟“

قدرت نے پوچھا۔

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو آتے ہوئے قدرت نے مجھ سے کہا تھا کہ مدینہ

منورہ مکہ شریف سے مختلف ہے۔

”آپ کا مطلب ہے کہ دونوں مسجدوں کی تعمیر میں فرق ہے۔“

”نہیں۔“ وہ بولے۔ ”تعمیر کی بات نہیں تاثیر کی بات کر رہا ہوں۔“

”تاثیر؟“ بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔

### قانون اور رحمت

”ماحول کے تاثرات مختلف ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ مکہ معظمہ قانون ہی

قانون ہے اور مدینہ منورہ رحمت ہی رحمت ہے“ قدرت نے وضاحت کی۔

میں پھر بھی نہ سمجھا۔ اس پر قدرت نے مجھے یہ واقعہ سنایا

”مکہ معظمہ میں بچوں کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ لیکن مسجد

نبویؐ میں بچے کھیلیں یا شور مچائیں تو انہیں کوئی نہیں روکتا۔۔۔ پاکستان کا ایک فوجی

افسر عمرہ کرنے کے لیے ایک مہینے کی چھٹی پر یہاں آیا تھا۔ مسجد نبویؐ میں اس نے دیکھا

کہ بچے شور مچا رہے ہیں۔ اسے بے حد غصہ آیا۔ کہنے لگا ”یہ سراسر بے ادبی ہے۔“

اس نے بچوں کو ڈانٹا۔ اس پر اس کے ساتھی نے جو مدینہ منورہ کی ڈپٹی ڈاکٹر تھا۔

اس کو منع کیا کہ بچوں کو نہ ڈاٹھیے۔ افسر نظم و نسق کا متوالہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی ان

سنی کر دی۔ رات کو اس موضوع پر دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا حضور اعلیٰؐ



یہ پسند نہیں کرتے کہ بچوں کو ڈانٹا جائے۔  
اسی رات افسر نے خواب دیکھا۔ حضور اعلیٰ خود تشریف لائے خشکیاں لہجے  
میں فرمایا ”اگر آپ مسجد میں بچوں کی موجودگی پسند نہیں کرتے تو مدینہ سے چلے  
جائیے۔“

اگلے روز پاکستان کے فوجی ہیڈ کوارٹرز سے ایک تار موصول ہوا جس میں اس  
افسر کی چھٹی منسوخ کردی گئی تھی اور اسے فوراً ”ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔  
”آپ کو اس واقعہ کا کیسے پتہ چلا۔“ میں نے قدرت سے پوچھا۔  
”مجھے ڈپنٹری کے ڈاکٹر نے بتایا جس کے پاس وہ افسر ٹھہرا ہوا تھا۔  
”یہ بتائیے کیا مدینہ منورہ میں بزرگ ہوتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں بہت“ وہ بولے۔

”مکہ معظمہ سے بھی زیادہ؟“  
”ہاں غالباً زیادہ“ لیکن یہ لوگ ظاہر نہیں ہوتے۔“  
”اگر آپ کو کسی بزرگ کا پتہ ہو تو ملوا دیجئے۔ میری بڑی خواہش ہے کہ  
مدینہ کے کسی بزرگ سے ملوں۔“  
”ہاں“ قدرت نے جواب دیا۔ ”ایک بزرگ کو میں جانتا ہوں۔“  
”کون ہیں وہ؟“

### پاپوش بابا

”وہ مسجد نبوی کے دروازے پر جوتوں کی رکھوالی کرتے ہیں۔ پاکستان کے  
ہیں لیکن اب مدینہ منورہ میں ہی مقیم ہو گئے ہیں۔“ ”آپ کو ان کی بزرگی کا کیسے علم  
ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”پچھلی مرتبہ جب میں مدینہ منورہ حاضر ہوا تھا تو میں نے دیکھا کہ باب نسواں  
سے باہر دہلیز پر ایک آدمی بیٹھا سردی میں ٹھنڈا رہا ہے۔ میں گھر جا کر ایک کوٹ اور  
ایک سویٹر اٹھالایا اور آکر اس آدمی کو پیش کیا۔ اس نے اسے قبول کیا۔ میں نے پوچھا  
”آپ کا ٹھکانا کون سا ہے۔“ ”بولا ”صبح و شام یہیں پڑا رہتا ہوں۔ آج تک مسجد نبوی  
میں داخل ہونے کی ہمت نہیں پڑی۔ جب حضور خود بلائیں گے تو حاضری دوں گا۔“



میں نے کہا ”مسجد نبویؐ میں جاتے کیوں نہیں؟“ بولا ”جانے لگتا ہوں تو احساس گناہ اس حد تک طاری ہو جاتا ہے کہ خود کو تادیکھنے لگتا ہوں۔ اس حالت میں داخل ہونے کی جرات کیسے کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا ”ٹھکانہ تو خیر ہو گیا۔ کھانے کا انتظام کیا ہے؟“ بولا ”یہاں اس کا ذکر نہیں۔ ایک ولی یہاں بلیوں کے لیے کھانا اکٹھا کرنے پر مامور ہے۔ سارا دن سر پر ٹوکری اٹھائے پھرتا ہے۔ جگہ جگہ سے کھانے کے ٹکڑے اکٹھے کرتا رہتا ہے اور پھر جب کھانے کے وقت وہ ٹوکری لے کر آتا ہے تو مدینہ کی ساری بلیاں میاؤں میاں کرتی ہوئی اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ جس شہر میں بلیوں کا اتنا انتظام ہے۔ وہاں انسان کیسے بھوکا رہ سکتا ہے۔“ میں نے اس سے پوچھا ”کیا تو اس ولی کو جانتا ہے جو بلیوں کی خوراک جمع کرنے پر مامور ہے۔“ وہ بولا ”میں نہیں جانتا۔ وہ سامنے باب نسواں میں جو شخص جو توتوں کی رکھوالی کرتا ہے وہ اسے جانتا ہے۔“ تو جو توتوں کے رکھوالے سے واقف ہے کیا۔“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں“ وہ بولا۔ ”میں یہاں دن رات جو پڑا رہتا ہوں میں نے اسے اکثر احکامات جاری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ شخص انتظامیہ کارکن معلوم پڑتا ہے۔“

جب میں پہلے روز مدینہ منورہ میں پہنچا تھا اس روز قدرت کی طبیعت ناساز تھی اور میں اکیلا مسجد نبویؐ کا باہر سے طواف کرتا رہا تھا۔ اس روز میں نے پاپوش چوکیدار کو غور سے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا ایٹم پھوٹ رہے تھے۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا جیسے میں ذبح کیا ہوا بکرا تھا جو قصائی کی دوکان پر سیخ سے ٹنگا ہوا ہو۔

میں نے قدرت کو اس ملاقات کی تفصیلات بتائیں تو ہنسنے لگے۔ بولے ”بزرگوں کو یوں دہقانوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہیں دیکھا کرتے۔“

”تو پھر کس طرح دیکھا کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے آداب ہوتے ہیں۔“

”مجھے تو آداب نہیں آتے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ یوں کریں کہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران جب بھی مسجد نبویؐ میں

داخل ہوں تو ہمیشہ باب نسواں سے داخل ہوں۔“

”وہ دروازہ تو عورتوں کے لیے مخصوص ہے اگر میں مسلسل اس دروازے



سے داخل ہوتا رہا تو کسی روز پٹ جاؤں گا۔ ممکن ہے پاپوش بابا خود اس بات پر ناراض ہو جائیں؟“

”نہیں نہیں۔“ قدرت نے کہا ”مناسب احترام اور عجز سے باب نسواں سے گزریے پاپوش بابا کو سلام کیجئے لیکن ممکنگی باندھ کر ان کی طرف نہ دیکھیے۔ اور جب آپ مسجد نبویؐ سے باہر آئیں تو ہر بار انہیں ایک ریال پیش کیجئے۔“

اس روز سے میرا یہ معمول ہو گیا کہ باب نسواں سے مسجد نبویؐ میں داخل ہوتا۔ آنکھیں جھکا کر پاپوش بابا کو سلام کرتا اور واپسی پر انہیں ایک ریال پیش کرتا۔ چونکہ دن میں کئی ایک بار مسجد نبویؐ میں جاتا تھا۔ لہذا دوسرے دن ہی پاپوش بابا نے بات بھانپ لی۔ انہوں نے غور سے مجھے دیکھا لیکن میں ان کی نگاہ سے اس قدر خائف تھا کہ میں نے اپنی نظریں ان کے قدموں پر مرکوز کیے رکھیں۔

”ہاں“ میں نے کہا ”میں نے باب نسواں کے پاپوش بابا کو ایک نظر دیکھا ہے۔ دوسری نظر ڈالنے کی مجھ میں ہمت نہیں پڑی۔“ قدرت ہنس پڑے۔

”کیا محافظان مسجد نبویؐ اور پاپوش بابا میں کوئی مناسبت نظر آئی؟“

”نہیں“ میں نے کہا ”پاپوش بابا کے چہرے پر کڑا پن ضرور ہے لیکن جمود نہیں خشونت ہے لیکن بے حسی نہیں۔“

### عرب سردار

مرد قدیم میں بھی کڑا پن ضرور تھا لیکن جمود کی جگہ ہوشمندی تھی، وقار تھا۔ اس وقار میں سرداری کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ ان کے مقابلے میں پاپوش بابا ایک کارکن نظر آتے تھے۔

حالانکہ مرد قدیم اور ہم میں بڑا فاصلہ تھا۔ وہ بیٹھے ہوئے نمازیوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے آرہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کی نگاہیں ہم دونوں پر مرکوز تھیں۔

وہ بڑے دب دے اور وقار سے چلتے ہوئے آرہے تھے۔ زائرین انہیں دیکھ کر آپ ہی آپ آگے سے ہٹتے جا رہے تھے۔ ان کے راستے میں کئی ایک جگہیں خالی پڑی تھیں۔ کئی ایک صفوں میں نمازی یوں پھیل کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دو، دو، چار، چار



نشستوں کی جگہ بن سکتی تھی۔ لیکن مرد قدیم کہیں بھی نہ رکے۔  
 میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں جھکائے بیٹھے تھے۔ لیکن جھکی جھکی  
 آنکھوں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بن دیکھے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔  
 ”آپ اس شخص کو دیکھ رہے ہیں کیا؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”کون شخص؟“ انہوں نے کھوکھلی آواز میں سوال کیا۔  
 ”وہ جو سامنے صفیں چیرتا ہوا آ رہا ہے۔“ قدرت نے آنکھیں یوں اوپر  
 اٹھائیں جیسے کچھ جانتے ہی نہ تھے۔

”دیکھنا آپ نے ‘عرب دکتے ہیں۔“

”ہاں“ وہ بولے ”بے شک عرب دکتے ہیں۔“

”لیکن آج کے عرب سے کتنے مختلف ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے تاریخ اسلام کے

بوسیدہ صفحات سے نکل کر آ رہے ہوں۔“

”ہاں۔“ وہ بولے ”یوں لگتا ہے جیسے وہ سیدھے ہماری طرف آ رہے

ہوں۔“

”نہیں“ قدرت نے کہا ”غالبا“ کوئی جگہ تلاش کر رہے ہیں۔“

اسی دوران میں مؤذن اذان کے اختتام تک پہنچ گئے تھے اور آخری اللہ اکبر

پر ڈرامائی کیفیت کا نقطہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اس پر مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگ سب نماز  
 کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

مسجد کے صدر دروازے سے جو ہمارے عقب میں تھا۔ نمازیوں کا ایک تازہ

ریلا داخل ہوا ان کے لیے جگہ بنانے کی غرض سے پچھلی صفوں کے لیے نمازی اگلی

صفوں میں داخل ہونے لگے۔ بہت سے لوگ پچھلی صف سے نکل کر ہماری صف میں

آنے لگے۔

پچھے سے ایک ہاتھ میرے کندھے پر آپڑا۔ میں نے کنکھیوں سے بائیں جانب

دیکھا۔ کوئی شخص میرے اور قدرت کے درمیان زبردستی گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک ہاتھ سے قدرت کو دائیں طرف دھکیل رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے بائیں

طرف۔







قدیم

انہوں نے سلام کرنے کے لیے بائیں ہاتھ منہ موڑا مگر میں انہیں کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ان کی آنکھوں سے شفقت بھری نگاہ مجھ پر پڑی، کرم فرمائی کی ایک پھوار سی مجھ پر گری اور میں بھیگ گیا اس قدر بھیگ گیا کہ نہ وہ غصہ رہا نہ غم نہ کھجڑی نہ ابل۔

کرم ہی کرم

چاہیے تو یہ تھا کہ رد عمل کے طور پر میں احساس ندامت سے بھیگ جاتا لیکن ان کی توجہ کا اثر اس قدر شدید تھا کہ ندامت کو بھی ساتھ ہی بہا کر لے گیا۔

جب میں نے دور سے انہیں دیکھا تھا تو وہ مجھے مرد آہن نظر آئے تھے، ان کے چہرے پر وقار بھی خشونت تھی لیکن اب، اب جب کہ قریب بیٹھ کر میں نے انہیں محسوس کیا تو وہ سراسر شفقت تھے۔ ان کے وجود سے شفقت کی شعاعیں یوں نکل رہی تھیں جیسے زمین سے کشش ثقل کی لہریں نکلتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں، بازوؤں اور آنکھوں سے جذبہ ہمدردی کے بھجکے اٹھ رہے تھے۔

”یا اللہ یہ کیا اسرار ہے۔ اس پر وقار، خود آگاہ سپہ سالار کو قریب آ کر کیا ہو گیا، کیا یہ ان کی شخصیت کی چوتھی سمت ہے لیکن یہ تو باقی سمتوں کی نفی کر رہی ہے۔ ظاہری سمت تو ہٹ کر رہنے کا احساس دلا رہی تھی لیکن یہ سمت قریب بلا رہی ہے۔ قریب اور قریب اور قریب۔“

اس قرب میں ایک عجیب سی لذت تھی۔ میں نے اپنا آپ اس لذت کے حوالے کر دیا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں کسی شفقت کے سمندر کے ساحل پر لینا ہوں اور لہروں کا بہاؤ بڑے پیار سے مجھے چھوتا ہے اور پھر وہ لہریں مجھے اپنی گود میں بھینچ لیتی ہیں۔ سارا سمندر سمٹ کر ماں کی گود بن گیا تھا۔

دعا پڑھنے سے پہلے مرد قدیم نے جیب سے ایک لکڑی نکالی۔ اسے بعد احترام آنکھوں سے لگایا، چوما اور پھر ہاتھ دعا کے لیے پھیلا دیے۔ دعا کے بعد کرم فرمائی کے اس سمندر میں گویا جوار بھانا اٹھنے لگا۔ انہوں نے بازو پھیلا کر مجھے آغوش میں لے لیا اور قریب تر کھینچ لیا۔ پھر انہوں نے دایاں بازو پھیلا یا اور قدرت کو کھینچ کر قریب تر کر



لیا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اپنے بائیں ہاتھ سے مجھے تھکنے لگے۔

## نچڑتارس گلا

ان کے بازوؤں سے گویا سمریزم کی لہریں نکل رہی تھیں۔ ان کے لمس سے ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک بے نام سا سکون۔ ایک بے نام سی فرحت جیسے انڈے کو اکیو بیٹر میں رکھ دیا گیا ہو۔

نماز کے بعد وہ دس پندرہ منٹ ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ اس عرصے میں ان کے بازوؤں 'ہاتھوں' انگلیوں اور نگاہوں نے ایک طوفان برپا کیے رکھا۔ کبھی وہ میرے لیے جگہ بناتے کبھی میرے حاجی بیگ کو یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دیتے۔ کبھی میری کمر کو تھکتے۔ کبھی میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتے۔

ان کی توجہ تلے میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے خشک رس گلے کو شیرے میں ڈال دیا گیا ہو اور اس کا ذرہ ذرہ مٹھاس سے بھر کر نچڑنے لگا ہو۔ ان کی توجہ ہم دونوں پر ایک سی تھی اور اس وقت ہم دونوں مٹھاس سے نچڑ رہے تھے۔ میں نے قدرت کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے عجز سے سرشاریوں میں بیٹھے تھے۔ دلہن لباس عروسی میں سر جھکائے بڑے معصوم انداز میں بیٹھی ہوتی ہے لیکن اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسے علم ہے 'وہ جانتی ہے' سمجھتی ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔

میں آج تک قدرت کی زبان سے کچھ نہیں جان سکا۔ جب بھی جانا ان کی آنکھ سے جانا 'نگاہ سے سمجھا۔ یہ درست ہے کہ نگاہ ساری بات نہیں بتاتی۔ تفصیلات سے نہیں نوازتی۔ لیکن بنیادی طور پر نفی اثبات کی جھلک کو ضرور واضح کر دیتی ہے۔

عورت کے متعلق عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ نہ کہہ دے تو مطلب ہوتا ہے شاید۔ اگر وہ شاید کہے تو مطلب ہوتا ہے ہاں۔ اور اگر وہ ہاں کہہ دے تو سمجھ لو وہ عورت ہی نہیں۔

اسی حساب سے میں نے قدرت کے متعلق بھی چند اصول وضع کر رکھے ہیں۔ اگر وہ زبان سے کہیں پتہ نہیں تو مطلب ہے کچھ کچھ پتہ ہے۔ اگر وہ کہیں شاید ایسا ہی ہو تو مطلب ہے ایسا ہی ہے اور اگر وہ کہیں ہاں مجھے پتہ ہے تو یقیناً جانو وہ قدرت نہیں کوئی اور شخص ہے یہ تو قدرت کی زبان کی بات ہوئی۔



ویسے عام طور سے زبان انسان کا واحد عضو ہے جو جھوٹ بول سکتا ہے جو بات پر پردہ ڈالنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مرد قدیم کی موجودگی میں قدرت سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن میں کافی آنکھ سے ان کے تاثرات کو دیکھ رہا تھا۔

## رد عمل

مرد قدیم کے متعلق ہم دونوں کے رد عمل ایک سے بھی تھے اور مختلف بھی۔ میرے رد عمل میں حیرت کا عنصر تھا لیکن قدرت کے رد عمل میں حیرت کا عنصر نام کو نہ تھا۔ خوشی اور انبساط ہم دونوں میں یکساں تھی لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ میری خوشی والہانہ تھی، والہانہ خوشی مقابلتا "سطحی ہوتی ہے۔ قدرت کی خوشی میں عمق گہرائی تھی۔ ان کے اظہار میں ضبط تھا۔ ہم دونوں کے رویے میں بنیادی فرق یہ تھا کہ قدرت جانتے تھے کہ جانتے ہیں اور میں جانتا تھا کہ نہیں جانتا۔

قدرت کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں لیکن ان کے عجز کی گہرائی سے پتہ چلتا تھا کہ مرد قدیم کا مرتبہ کتنا بلند ہے۔ قدرت کی گہری خاموش ملفوف خوشی سے ظاہر تھا کہ اے آمدنت باعث آبادی ما۔

نماز کے بعد مرد قدیم نے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیے اور میرا ہاتھ پکڑ کر پر جوش مصافحہ کیا۔ پھر وہ قدرت سے مصافحہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ اٹھ بیٹھے اور بڑے وقار سے مسجد نبوی کے ترکی برآمدے کی طرف چل پڑے۔ ان کی چال میں وہی وقار تھا وہی ٹھہراؤ تھا، وہی خود اعتمادی تھی۔

چونکہ اس وقت نمازی بیٹھے ہوئے تھے لہذا انہیں جاتے ہوئے دور تک میں دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں میں پھر سے وہی "زوم" لگ گیا تھا۔ مسجد میں بیٹھے ہوئے باقی لوگ سب کے سب فوکس سے باہر نکل کر دھندلا گئے تھے۔ صرف ایک شخص پیش پیش تھا۔

برآمدے کے قریب جا کر انہوں نے مڑ کر ہماری جانب دیکھا۔ وہی مرد آہن، مستعد، خردمند، معاملہ فہم، جنگجو، خود آگاہ، قدیم سردار۔

انہیں دور کھڑے دیکھ کر مجھے شک پڑنے لگا کہ یہ وہ شخص نہیں جو کچھ دیر پہلے







”تو پھر چلتے کیوں نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ مسکرا دیے۔

”آپ کا مطلب ہے کہ آج آپ باب جبرئیل نہیں جائیں گے“

”آج ہم براہ راست مسجد نبویؐ میں جائیں گے۔ جب اذان ہوگی“ قدرت

نے جواب دیا۔

”لیکن حجرے میں نفل کیوں نہیں پڑھیں گے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہمارا کام ہو چکا ہے۔“ قدرت بولے۔

”کون سا کام؟“ میں نے پوچھا۔

”مطلب ہے کہ جو ہم کو کرنا تھا کر لیا ہے۔“

”پھر بھی وہاں جانے میں کیا حرج ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولے ”مناسب نہیں۔“

”مناسب کیوں نہیں؟“

”خوا مخواہ وہاں جا کر بھیڑ کرنا مناسب نہیں۔ یہ تو دوسروں کے راستے میں

حارج ہونے کے برابر ہوگا۔“

”تو کیا سبز جنگلے کے پاس دعا بھی نہیں کریں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولے۔ ”مناسب نہیں۔“

دو ایک ساعت تو میں مناسب اور نامناسب کے اس نئے زاویے پر حیران

رہا۔ پھر مجھے وہ دن یاد آگیا۔

## آداب حاضری

اس دن اتفاقاً ”قدرت مجھے لاہور میں مل گئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ داتا

صاحب کو سلام کرنے کے لیے حاضری دوں۔ میں نے قدرت سے پوچھا۔

”آپ کو کوئی مصروفیت تو نہیں؟“

بولے ”نہیں۔“

میں نے کہا ”تو چلئے داتا صاحب چلیں۔“

بولے ”آپ اکیلے ہو آئیں۔“



میں نے قدرت سے پوچھا ”کیوں“ جب آپ کو کوئی مصروفیت نہیں تو پھر جانے میں کیا حرج ہے؟“

قدرت کہنے لگے ”ایسے بڑے دربار میں ایسے تو نہیں جاسکتے مگر سر پر ٹوپی رکھی پاؤں میں جو تاپہنا اور چل پڑے۔“

”سہاری دنیا جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے میری بات کو ان سنا کر دیا کہنے لگے۔ ”بزرگوں کے روبرو جانے کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ حاضری دینے کے آداب ہوتے ہیں۔ عرض کرنے کے آداب ہوتے ہیں۔“ پھر مجھے محترمہ عطیہ کی بات یاد آگئی

محترمہ عطیہ صاحبہ پہلی مرتبہ عمرہ کر کے آئیں تو میں نے انہیں یہ سعادت حاصل کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ برسمیل تذکرہ کہنے لگیں

”مدینہ منورہ میں حاضری دینے کا مزا نہیں آیا۔“

میں نے پوچھا ”جی وہ کیوں؟“

کہنے لگیں۔ ”حضورؐ کی خدمت میں حاضری کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ انہیں ملحوظ خاطر رکھے بغیر حاضر ہونے میں وہ مزا تو نہیں۔ اب تو مجبوری تھی اس لیے میں نے مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر عہد کیا تھا کہ انشاء اللہ ایک بار پھر حاضری دوں گی۔ باقاعدہ طور پر حاضری دوں گی۔“

ضرور قدرت اسی باقاعدگی اور انہیں آداب کو پیش نظر رکھ کر کہہ رہے تھے۔

قدرت اور میں ہم دونوں فرد تھے ایک ساتھ حج کرنے آئے تھے ایک جگہ رہتے تھے۔ ایک ساتھ حاضری دیتے تھے لیکن ان کی حاضری اور میری حاضری میں کتنا فرق تھا۔

خوشبو

میں نے سوچا اگر صاف بات کر دوں تو قدرت پہلو بچا جائیں گے۔ لہذا کیوں نہ برسمیل تذکرہ بات کروں۔

میں نے کہا ”مجھے تو رات بھر نیند نہیں آئی۔“



”کیوں؟“ وہ بولے۔

”مرد قدیم آنکھوں کے سامنے کھڑے رہے۔“

”اچھا“ وہ بولے۔

”آپ کو ان کا خیال نہیں آیا کیا؟“

”آیا تھا۔“ وہ بولے۔

”کیسے آیا؟“ میں نے انہیں چھیڑا۔ ”عجیب بات ہے وہ بزرگ نہیں دکتے

تھے۔ پھر کیا تھے وہ؟“

”اچھے لوگ تھے۔“ قدرت نے جواب دیا۔

”کتنے اچھے تھے بھلا؟“

اس پر قدرت چھلک گئے، بولے ”انہیں رخصت ہوئے ۲۴ گھنٹے ہو چکے ہیں

لیکن ان کی خوشبو ابھی تک جوں کی توں باقی ہے۔“

اس کے ایک سال بعد جب ہم اسلام آباد میں بیٹھے تھے، قدرت، عفت،

محترمہ عطیہ اور میں، تو مجھے قدرت کا یہی جملہ یاد آگیا۔

میں نے عطیہ صاحبہ سے کہا کہ مسجد نبویؐ میں ہمیں ایک ایسے بزرگ سے

ملنے کی سعادت حاصل ہوئی جن کی خوشبو قدرت کے لیے کئی ایک دن قائم رہی۔

”سچ۔“ عطیہ نے شدت اشتیاق سے پوچھا۔

”سچ“ میں نے کہا ”چاہے پوچھ لیجئے ان سے۔“ عطیہ نے قدرت کی طرف

دیکھا۔ قدرت نے کچھ کہے بغیر سر اثبات میں ہلا دیا۔

”کون تھے وہ؟“ عطیہ نے پوچھا۔

قدرت نے کچھ منہ سے کہے بغیر ہاتھ ہلا کر ”اللہ جانے“ کا اشارہ کیا۔

## مراقبہ

”یہی تو میں آپ سے پوچھنے کے لیے بے قرار تھا۔“ میں نے عطیہ سے کہا۔

اب آپ جو یہاں تشریف لائی ہیں تو ذرا دیکھ کر بتائیے تو سہی کہ وہ کون بزرگ تھے۔“

عتیہ نے قدرت کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ یہ بھانپ کر کہ قدرت کو

کوئی اعتراض نہیں باادب بیٹھ گئیں۔ سر جھکا لیا اور مراقبہ میں چلی گئیں۔



کچھ دیر کے بعد عطیہ نے سر اٹھایا۔ ان کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں انبساط کی بھیر تھی۔ بولیں ”وہ بزرگ جو مسجد نبویؐ میں آپ کے پاس تشریف فرما تھے۔ شہدائے بدر میں سے تھے۔ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔“

قدرت نے سر جھکا لیا۔

پتہ نہیں مجھے اس وقت کیا ہوا میں نے بے سوچے سمجھے کہا۔ ”میں تو سمجھا تھا شاید وہ شہدائے بدر سے بھی بڑے تھے۔“

میری بات سن کر قدرت پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ رنگ زرد ہو گیا۔ چہرہ یوں ٹوٹ گیا جیسے ٹھوکر لگنے پر شیشہ کا گلاس چور چور ہو جاتا ہے۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ انہوں نے التجا بھری آواز میں کہا ”ان سے بڑے تو خود حضور اعلیٰؐ ہیں۔“



## مینارِ عظیم

### جنبے دی بوٹی

اس روز سارا دن میرا وجود مرد قدیم سے یوں بھرا رہا جیسے اتار، دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔ جدھر بھی نگاہ اٹھاتا انہیں رو برو پاتا۔ سارا دن میں بازار کی خاک چھانتا پھرا۔ ہر بازار میں دور سامنے سے مرد قدیم آتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ہر دوکان پر وہ دوکاندار کی پشت پر کھڑے نظر آتے۔

مرد قدیم سے میرا وجود اس قدر بھاری ہوا تھا کہ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کسی سے ان کی بات کروں۔ کسی کو بتاؤں کہ حضورؐ نے مجھ پر کتنا کرم فرمایا تھا۔ کسی سے ان کا تذکرہ کروں۔ لیکن کس سے بات کرتا۔ وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ اس روز میں مدینہ منورہ میں گویا اکیلا تھا، تن تھا۔ وہ بھڑوہ شور و شغب میری نگاہ میں دھندلا چکے تھے۔ گرد و پیش مدھم پڑ چکے تھے۔

قدرت اور ڈاکٹر دونوں ہی فجر کی نماز کے بعد کالی موٹر میں بیٹھ کر نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ جاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ہم ایک ضروری کام کے لیے جدہ جا رہے ہیں۔ شام تک واپس لوٹ آئیں گے۔ پتہ نہیں انہیں جدہ میں کیا کام تھا۔ میں نے بہتیرا پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن قدرت کی گم سم شخصیت سے بات اخذ کر لینا ممکن نہیں۔ پوچھو تو جواب تو وہ دے دیتا ہیں لیکن اس جواب سے بات کھلتی نہیں بلکہ الجھ جاتی ہے۔

شام کے وقت جب قدرت واپس آئے تو وہ بہت خوش خوش نظر آتے تھے۔ آتے ہی پوچھنے لگے "کہئے مفتی صاحب دن کیسے گزرا؟"



”بہت برا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ وہ چوٹے۔

”سارا دن مرد قدیم کی نذر ہو گیا۔ سارا دن نہ انہوں نے کچھ دیکھنے دیا نہ

سوچنے دیا، نہ محسوس کرنے دیا۔“

ابھی ہم مرد قدیم کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ مدینے کی پاکستانی ڈپٹی

کے ڈاکٹر آگئے۔ کہنے لگے۔ ”آج پھر مسجد نبویؐ رات کو خصوصی طور پر کھلے گی۔ اگر

آپ چاہیں تو زیارت اور عبادت کے لیے تشریف لے چلیں۔“

”آج کس کے لیے کھلے گی؟“ ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

”کل تو مراکو کے شاہ کے لیے کھلی تھی ناں، آج پاکستانی علماء کے وفد کے لیے

کھلے گی۔“ انہوں نے جواب دیا۔

### سفارت پاکستان

۱۹۶۸ء میں پاکستانی علماء کے ایک وفد کو حج پر مدعو کیا گیا تھا۔ اس وفد میں

ہمارے چند علمائے دین شامل تھے۔

جب میں پہلی مرتبہ جدہ کے سفارت پاکستان میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سفارت

کے عملے کی نگاہیں صدر دروازے کی طرف مرکوز ہیں۔

سفارتی عمارت پاکستانی زائرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ وہ سب التجا بھری

نگاہوں سے عملے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کاغذات تھے جو وہ عملے کی

خدمت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر آہ و زاری سے بھیگی ہوئی

معروضات تھیں۔ ان کے چہرے حزن و ملال کی تصویر تھے۔

ایک کہہ رہا تھا میری عرض سن لیجئے جناب والا۔ دوسرا کہہ رہا تھا، حضور مجھے

یہاں کھڑے تین دن ہو چکے ہیں۔

تیسرا زار و قطار روئے جا رہا تھا۔ غالباً وہ کہہ کر تھک گیا تھا زبان سے عرض

حال کرتے کرتے ہار گیا تھا اور اب الفاظ نے آنسوؤں کی شکل اختیار کر لی تھی۔

ایک صاحب بڑے جلال میں یوں ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر ٹہل رہے

تھے جیسے چڑیا گھر میں شیر غصے اور بے بسی کے عالم میں جنگلے کے پیچھے چکر کاٹتا ہے۔



چند ایک لوگ میٹرک ہو رہے تھے۔ کبھی رونے لگتے۔ کبھی اپنی لاچاری اور بے بسی پر ہنسنے لگتے۔

پاکستانی سفارت کا ملحقہ میدان حاجت مندوں اور پریشان حال زائرین سے کچا کھج بھرا ہوا تھا لیکن سفارت کا عملہ دور اپنے اپنے کمروں میں بند چھپا بیٹھا تھا۔ عملے کا کوئی اہل کار اگر کسی خاص ضرورت کے تحت باہر نکلتا تو حاجت مند دوڑ کر اس کے گرد حلقہ بنا لیتے پھر منتوں آہ و زاری اور ہچکیوں سے فضا بھر جاتی اور پھر اہلکار کی کرخت آواز گونجتی۔ ”ہٹ جاؤ، پیچھے ہٹ جاؤ۔“

اہل کاروں کی نگاہیں صدر دروازے پر مرکوز تھیں کہ کب علماء کا وفد آئے اور وہ وفد کے رو برو دست بستہ حاضر ہو کر احکامات بجالائیں۔

سفارت پاکستان کے عملے کو حکم موصول ہوا تھا کہ علمائے پاکستان کے وفد کے لیے چشم براہ رہیں، ان کی خاطر و مدارت میں کوتاہی نہ ہو۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ شکایت نہ ہو۔

سفارت پاکستان کا عملہ فرض شناس عملہ تھا۔ اپنے فرض کو پورا کرنے کے لیے وہ بے تاب تھے۔ وفد کے لیے اس حد تک چشم براہ تھے کہ اراکین وفد کے علاوہ انہوں نے ہر کسی کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

سفارت کے میدان میں کھڑے عام زائرین ان کی نگاہ میں رکاوٹیں تھیں۔ ان خواجہ خواہ کی رکاوٹوں کو دیکھ کر انہیں غصہ آتا تھا۔ جس کا وہ دل کھول کر اظہار کرتے تھے۔ زائرین کو ڈانٹتے تھے، تمسخر اڑاتے تھے۔ انہیں حقارت سے دیکھتے تھے۔

ایک کہتا تھا ”ہٹائیے جی، یہ تماشہ تو روز لگا رہتا ہے۔“  
دوسرا کہتا ”میاں دس بیس ہوں تو کوئی ان کی بات سنے یہاں تو ہزاروں ہیں اور جو ان کے کام کر بھی دو تو مزید ہزاروں آپنچیں گے۔ یہ سلسلہ تو لامتناہی ہے۔“

علماء کا وفد

ادھر وفد کے علمائے کرام تھے۔ یہ احساس ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا کہ وہ عام زائر نہیں بلکہ خصوصی مہمان ہیں اور پاکستانی سفارت اور سعودی حکومت صرف اس واسطے چشم براہ کھڑے ہیں کہ ان کے آرام اور آسائشوں کا خیال رکھیں چونکہ وہ



خصوصی ہیں۔

اگر آپ کو یہ احساس ہو جائے کہ آپ خصوصی ہیں اور دو ملکوں کے اہل کاروں کا واحد کام آپ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے تو لازماً "ذاتی آرام اور آسائش کے متعلق آپ کے خیالات میں ایک عظیم الشان وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور آپ کی خوشنودی آسانی سے حاصل ہونی ممکن نہیں رہتی۔

بہر حال وفد کی شکایات لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ انہیں شکایت تھی کہ سفر کرنے کے لیے انہیں جو کار مہیا کی گئی ہے۔ وہ کالے رنگ کی نہیں تھی۔ اس پر جھنڈا انہیں لگا ہوا، اس کا انجن روٹرز رائس کا نہیں۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ مکہ شریف کی سڑک پر سفر کرتے ہوئے گرد اڑتا ہے۔ وضو فسق ہو جاتا ہے۔ پاکیزگی میں فرق آ جاتا ہے۔

ایک کہتا ہم تو کھیر آرد خرما سے ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔ اور یہ انڈا ٹوسٹ لاجول ولاقوۃ۔ دوسرا کہتا ہمیں قیمہ پسند نہیں۔ اس کے کوفتے بنا دیے جائیں تو البتہ۔ تیسرا کہتا یہ چائے وائے اپنے کام کی نہیں۔ ہاں دودھ کا گلاس ہو تو بہتر رہے گا۔ اور اس میں بالائی ڈال دی جائے تو مضائقہ نہیں۔

یہ خصوصی مہمان اپنے آپ کو سعودی عرب کے قانون سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ جب سعودی عرب کی چوکیاں انہیں روک کر ان سے کوائف پوچھتیں تو وہ غصے میں آجاتے۔ کتنے بے خبر ہیں یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہم مہمان خصوصی ہیں اور ملک کا قانون ہم پر لاگو نہیں ہوتا ہے۔

مدینہ منورہ کی حدود میں داخل ہوتے وقت میں نے دیکھا کہ وفد کی ایک گاڑی رکی کھڑی ہے اور چوکی کے کارندے منتیں کر رہے ہیں کہ حضور قانون کے مطابق داخلہ پر مقررہ رقم کی ادائیگی ضروری ہے۔ چونکہ آپ خصوصی مہمان ہیں۔ آپ اس سے مستثنیٰ ہیں لیکن یہ صاحب جنہیں آپ مہمان بنا کر ساتھ لائے ہیں۔ ان کی ادائیگی ضروری ہے۔

دو ایک ارکان تو کارندوں کی منت سماجت کو اپنی توہین سمجھ رہے تھے۔ ایک رکن قرآنی زبان میں اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ دوسرے کہہ رہے تھے "تم نے ہماری گاڑی کو روکنے کی جسارت کیوں کی؟"



وفد کے اس رویے کو دیکھ کر چوکی کے کارکنوں نے ایک طرف جا کر باہمی مشورہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ قابل ادا محصول وہ سب اپنی ذاتی جیبوں سے ادا کریں اور مہمان وفد سے کچھ نہ کہیں۔ جب ہماری گاڑی چلی تو وہ سب آپس میں چندہ جمع کرنے میں مصروف تھے۔

اس رات مسجد نبویؐ خصوصی طور پر علماء کے اس وفد کے لیے کھولی جا رہی تھی۔

### عام حاضری خاص حاضری

ڈاکٹر کے ڈاکٹر نے بڑے احترام سے قدرت کو مخاطب کیا، کہنے لگے ”کل تو آپ کی طبیعت خراب تھی اس لیے موقع سے فائدہ حاصل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آج پھر موقع دیا ہے۔ اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہو تو آج حرم میں تشریف لے چلے۔ آج پھر مسجد نبویؐ خصوصی طور پر علمائے پاکستان کے وفد کے اعزاز میں کھل رہی ہے۔“

قدرت نے بڑی لجاجت سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ”جدہ کے طویل سفر کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ مسجد نبویؐ میں حاضری دے سکوں۔“

ڈاکٹر عفت اور میں حیرت سے قدرت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قدرت اتنی بڑی نعمت کو کیوں ٹھکرا رہے ہیں۔ آخر وہ مسجد نبویؐ میں خصوصی حاضری کے اس موقع پر کیوں ہچکچا رہے تھے۔ کیوں پہلو تہی کر رہے تھے؟ جب ڈاکٹر صاحب مایوس ہو کر چلے گئے تو عفت اور میں دونوں ہی قدرت پر برس پڑے۔ ”آخر وفد کے ساتھ مسجد میں حاضری دینے میں کیا حرج ہے۔ آپ جانے پر رضامند کیوں نہیں ہوتے؟“

عفت بولیں ”کل جو آپ نے ناسازئی طبع کی بات کی تھی وہ تو محض بہانہ تھا۔ آج بھی آپ سفر کی کوفت کا بہانہ لے بیٹھے ہیں۔“

ہم دونوں کا جارحانہ رویہ دیکھ کر قدرت کے چہرے پر مجبوری اور بے بسی کی گھنائیں اٹھ آئیں۔ ”نہیں۔“ وہ بڑی منت سے بولے۔ ”میں ان حالات میں حاضری



نہیں دے سکتا۔“

”کن حالات میں؟“ ڈاکٹر عفت نے پوچھا۔

”ان حالات میں۔“ انہوں نے ملتجیانہ انداز سے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ عفت نے پوچھا۔

”میں مسجد نبویؐ میں ایک عام فرد کی حیثیت سے حاضری دے سکتا ہوں،

خصوصی فرد کی حیثیت سے نہیں۔“ انہوں نے اٹک اٹک کر کہا اور کرسی سے اٹھ

کھڑے ہوئے۔ اس وقت ان کا بند بند آبدیدہ تھا۔

”آپ خود نہیں جاتے تو ہم پر بندش کیوں ڈال رہے ہیں آپ؟“ عفت

بولیں۔

نال میرے کوئی چلے

قدرت تڑپ کر مڑے ”نہیں نہیں“ بولے ”میں آپ پر بندش ڈالنے والا

کون ہوں، آپ شوق سے جائیں۔ مفتی صاحب آپ بھی ساتھ جائیں۔ ضرور

جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔

”میں تو ضرور جاؤں گی۔“ ڈاکٹر عفت نے کہا ”کیوں مفتی صاحب آپ چلیں

گے ناں؟“

”ہاں میں ضرور جاؤں گا“ ضرور جاؤں گا۔ میں حجرہ مبارک میں سجدہ کروں

گا۔ میں مقدس جالی کو تھام کر کھڑا رہوں گا۔ میں اس مقام کو بوسہ دوں گا جہاں حضورؐ

کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ میں اس دہلیز کو آنکھوں سے لگاؤں گا جس پر پاؤں

رکھ کر حضورؐ داخل ہوا کرتے تھے۔“

ڈاکٹر عفت کی اس دعوت پر میرے جسم کا بند بندنا چنے لگا، والہانہ خوشی سے

ناچنے لگا۔ انہوں نے میری کیفیت کو دیکھا اور مطمئن ہو کر چلی گئیں۔ فرط انبساط میں

میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور مسجد نبویؐ کے کھلنے کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔

پر کسی نے چپکے سے میرے کان میں کچھ کہا، میں چوک پڑا۔ اٹھ بیٹھا۔ لیکن

وہاں کوئی نہ تھا۔ میں پھر لیٹ گیا۔ چند ساعت کے بعد پھر وہی آواز آئی۔

”نال مرے کوئی چلے۔“



ارے ' میں پھر چونکا۔ پھر شاہ حسین کا وہ شعر میری آنکھوں کے سامنے گویا  
رقص کرنے لگا

میں وی جانا ڈھوک را بنخن دی نال مرے کوئی چلے!  
وہی آواز جو میں حج کے دوران کئی بار سن چکا تھا۔ جب مکہ شریف میں  
قدرت کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو بارہا میرے دل میں آیا تھا کہ میں اکیلا حرم شریف  
میں حاضری دے آؤں لیکن مجھ میں ہمت نہ پڑی تھی۔ مجھے وہاں کون جانتا ہے؟ اتنی  
عظیم بارگاہ میں داخل ہو جاؤں۔ نہ نہ میری کوئی حیثیت بھی ہو۔ اس وقت شاہ حسین  
نے میری رہنمائی کی تھی۔

نال مرے کوئی چلے

پھر جب ہم مدینہ شریف میں پہنچے تھے تو قدرت نے کہا تھا آپ مسجد نبویؐ ہو  
آئیں میں اس حالت میں نہیں ہوں کہ حاضری دے سکوں اور میں خوشی خوشی مسجد تک  
پہنچا تھا لیکن اندر داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی تھی اور میں مسجد کے گرد طواف کرتا رہا  
تھا۔

پھر اس روز جب قدرت جدہ گئے ہوئے تھے تو مجھ میں اتنی ہمت نہیں پڑی  
تھی کہ از خود اکیلا مسجد نبویؐ کے عمومی حصے میں داخل ہوتا۔ میرے جسم اور روح کا بند  
بند شاہ حسین کے اس مصرعے کا ورد کرتا رہا تھا۔

میں انہی سوچوں میں پڑا تھا کہ ڈاکٹر عفت تیار ہو کر آئیں بولیں۔ ”چلئے مفتی  
صاحب مسجد نبویؐ کے خصوصی طور پر کھلنے کا وقت ہو گیا۔“

پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور انجانے میں میں  
رونے لگا۔

نال مرے کوئی چلے

اس پر عفت قہقہہ مار کر ہنس پڑیں پھر بولیں ”تم دنوں ہی سر پھرے ہو“ اور  
اکیلی مسجد کی طرف چل پڑیں۔

رات کو جب وہ مسجد سے واپس آئیں تو میں بڑے اشتیاق سے ان کے پاس جا  
بیٹھا۔ ”کیسے کیسا رہا؟“ میں نے پوچھا۔

بولیں ”سبحان اللہ طبیعت خوش ہو گئی جہاں جی چاہا کھڑے ہو کر نفل پڑھے“



جہاں جی چاہا بیٹھ کر تلاوت کی۔ سبحان اللہ کیا شان ہے مسجد پاک کی۔“

”وہ بھی وہیں تھا کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولیں۔

”انہوں نے بھی نوافل ادا کیے؟“

ڈاکٹر ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں۔ ”وہ تو بات بات پر بحث کرتے رہے‘ بات بات

پر جھگڑتے رہے۔“

”کس بات پر؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک نے کہا آئیے باجماعت نفل ادا کریں‘ دوسرا بولا میں امامت کروں‘

تیسرا بولا نہیں میں امامت کروں گا۔ ایک نے کہا‘ میں تمہارے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا۔

دوسرے نے کہا تجھے امامت کرنے کا کوئی حق نہیں اس لیے کہ تیرا عقیدہ فاسق ہے۔

اس پر ان کی جھج جھج ہونے لگی اور میں ایک طرف ہو کر عبادت میں مصروف ہو گئی۔“

## قدرت کی واپسی

اسی رات قدرت بولے ”کل عفت اور میں واپس پاکستان جا رہے ہیں۔ آج

ہم جدہ اس غرض سے گئے تھے کہ واپسی کے لیے سیٹوں کا انتظام کر لیں۔ اتفاقاً دو

سیٹیں مل گئی ہیں۔ سعودی حکومت کی مدد سے کل ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

رات جدہ میں قیام کریں گے۔ پرسوں صبح پاکستان کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ انشاء

اللہ۔“

”اور میں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ یہاں قیام کریں۔ چار ایک دن کے بعد جب یہاں سے دوسرے

مہمان رخصت ہوں گے تو آپ ان کے ہمراہ جدہ پہنچ جائیے۔ میں نے رابطہ افسر غنی

صاحب کو کہہ دیا ہے وہ آپ کی ضروریات کا خیال رکھیں گے۔ واپسی پر سیٹ ملنی بہت

مشکل ہوتی ہے۔ کوشش کیجئے کہ جلدی مل جائے۔ یہ سب لوگ آپ کی مدد کریں

گے۔ ہاں ایک تکلیف کیجئے کہ آتے ہوئے ایک محترمہ کو اپنے ساتھ لیتے آئیے۔“

”کون محترمہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ڈاکٹر عفت کی ایک دوست ہیں۔ پڑھی لکھی عمر رسیدہ خاتون ہیں۔“



وہ مجھے کہاں ملیں گی؟“

”وہ جدہ میں مقیم پاکستانی سفیر کے گھر ٹھہری ہوئی ہیں۔ جدہ پہنچ کر آپ سفیر صاحب سے مل کر تفصیلات طے کر لیں۔“

اگلے روز سارا دن قدرت اور میں مسجد نبویؐ میں داخل نہ ہوئے۔ ہم نے تمام نمازیں مسجد نبویؐ کے مقابل کے میدان میں ادا کیں۔

مسجد میں نماز کے وقت اتنی بھیڑ ہو جاتی ہے کہ نمازیوں کے لیے جگہ نہیں رہتی اس لیے وہ مسجد سے باہر ملحقہ میدان میں مٹلے بچھا کر قطاریں بنا لیتے ہیں اور وہیں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں۔

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد جب ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے تو بھیڑ سے نکل کر ایک آدمی نے مجھے سلام کیا۔ وہ درمیانی عمر کا عرب تھا۔ میلے لباس پر جا بجا پوند لگے ہوئے تھے۔ چہرے سے عسرت ٹپک رہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے کچھ دوں۔ چونکہ میرا خیال تھا کہ وہ بھکاری ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

قدرت نے میرا بازو پکڑ لیا۔ کہنے لگے ”جلد بازی نہ کیجئے۔“

”کچھ دینے میں حرج کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

قدرت مسکرا دیے۔ بولے ”آپ اسے بھکاری سمجھتے ہیں کیا؟“

”تو اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ مدینہ منورہ سے واقف نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

درویشوں کا شہر

”یہ بھکاریوں کا شہر نہیں درویشوں کا شہر ہے۔ ممکن ہے یہ شخص جسے آپ

بھکاری سمجھ رہے ہیں درویش ہو۔ ایسا درویش جو آپ کو ہفت اقلیم کی بادشاہت بخش سکتا ہو۔“

اس وقت دفعتاً مجھے خیال آیا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں میں نے

کوئی بھکاری نہیں دیکھا تھا۔

”یہاں بھکاری نہیں ہوتے کیا؟“ میں نے پوچھا۔



”نہیں۔“ وہ بولے۔

”حاجت مند نہیں ہوتے؟“

”ہوتے ہیں۔“ وہ بولے۔ ”فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں حاجت مند غنی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہاں غنی حاجت مند کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہمارے ہاں حاجت مند ہاتھ پھیلاتے ہیں، یہاں دینے والے حاجت مند کی منت کرتے ہیں کہ میری پیش کش قبول فرما کر مجھ پر احسان کریں۔“

وہ درویش جسے بھکاری سمجھا تھا میرے قریب آگیا۔ اس نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بڑے پیار سے تھکنے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں ”خشم سمرقند و بخارا را“ کی واضح جھلک تھی۔

”مدینہ منورہ شہر سے کوئی بھی واقف نہیں ہے۔ کوئی بھی واقف نہیں ہو سکتا۔ یہ شہر کسی کو نظر نہیں آتا۔ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا۔ چونکہ یہ شہر ایک عظیم مینار کے سائے میں چھپا ہوا ہے۔ جدھر بھی دیکھو، جدھر بھی نظر اٹھاؤ، عظیم مینار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم جو سراٹھا کر اس عظیم مینار کی بلندی کا جائزہ بھی نہیں لے سکتے، تم اس شہر کو کیا دیکھو گے؟“

ان دیکھا شہر

پچھلی مرتبہ مجھے یہاں ایک درویش ملا تھا، قدرت نے کہا: انہوں نے مجھے بتایا،  
کہنے لگے۔

”یہاں بڑے بڑے اولیا، قطب اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتے کہ وہ سراٹھا کر  
دیکھیں۔“

قدرت مسکرانے لگے ”وہ درویش سچ کہتے تھے، مدینہ منورہ کو آج تک کسی نے نہیں سمجھا۔ کسی نے نہیں جانا۔ یہاں جو بھی آتا ہے اس کی توجہ حضورؐ کی طرف لگی ہوتی ہے۔ سب کی نگاہیں حضورؐ کی طرف اٹھی ہوتی ہیں۔ سب کے دل حضورؐ کے لیے دھڑکتے ہیں۔ سب دلوں کا فوکس حضورؐ پر مرکوز ہے۔ صرف حضورؐ فوکس میں ہیں۔ باقی سب کچھ دھندلا ہیں۔ آؤٹ آف فوکس۔ حضورؐ ایک عظیم مینار ہیں اور یہ شہر اس مینار کا سایہ ہے۔“



## مانگنا اور قبول کرنا

صرف یہ ایک شہر ہے جہاں سچا ”دین“ عملی طور پر رائج ہے۔ دوسرے شہروں میں حاجت مند مانگتے ہیں، انہیں مل بھی جائے تو دینے کا فعل عمل میں نہیں آتا۔ یہاں دینے کے متوالے ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیتے ہیں۔ منتیں کر کے دیتے ہیں کہ قبول کرو تو کرم ہو گا۔

”اس شہر میں کوئی گنہگار نہیں۔ معصیت کا احساس اس شہر میں خوش قسمتی کا نشان ہے۔ چونکہ معصیت نہ ہو تو رحمت کیسے جوش میں آئے؟“

اس روز قدرت بڑی ترنگ میں تھی۔ وہ بولے جا رہے تھے۔ غیر از معمول بولے جا رہے تھے۔

قدرت بہت کم گو فحش ہیں۔ ان کا یوں بولے جانا میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ میں نہ ہوں یا جیسے انہوں نے پی رکھی ہو۔ وہ بولے جا رہے تھے۔ وہ مدینہ منورہ میری نگاہ میں سمٹتا جا رہا تھا۔ سمٹتا جا رہا تھا اور عظیم مینار ابھرتا آ رہا تھا۔ ابھرتا آ رہا تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا۔ جسے وہ عظیم مینار ساری کائنات کا احاطہ کر لے اور اس مینار کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔

اللہ اکبر۔ اللہ اکبر

مسجد نبویؐ سے عصر کی اذان گونجی۔



## واپسی

اگلے دن قدرت اور ڈاکٹر عفت کالی موٹر میں بیٹھ کر رخصت ہونے لگے تو میرا دل بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے جب قدرت نے پہلی بار مجھ سے کہا تھا کہ وہ واپس پاکستان جا رہے ہیں اور مجھے مدینہ منورہ میں چار ایک دن اکیلا رہنا ہو گا اور پھر سعودی حکومت کے دیگر مہمان زائروں کے ساتھ جدہ جانا ہو گا تو میں گھبرانے کی بجائے الٹا خوش ہوا تھا کہ مجھے حضور اعلیٰ کے قدموں میں رہنے کے لیے کچھ دن اور مل جائیں گے۔

### اکیلا

لیکن قدرت کے رخصت ہو جانے کے بعد دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔

لیکن اکیلا رہنے کی تو میری عادت ہے۔ اگر دن میں چند ایک گھنٹے میں اکیلا نہ گزاروں تو مجھے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ زندگی بھر میں اکیلا رہا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ساتھی میسر نہیں آئے۔ اس لیے نہیں کہ مفرد خیالات کا حامل ہوں اور لوگ مجھے سمجھ نہیں پاتے۔ بلکہ اس لیے کہ اکیلا پن میرے لیے یوں ہے جیسے بچے کے لیے چوسنے والی مٹھائی کی ٹکیہ ہوتی ہے۔ مجھے اکیلے پن میں ایسا اطمینان حاصل ہوتا ہے جو محفل میں حاصل نہیں ہوتا۔ چاہے وہ محفل ان ساتھیوں کی ہی کیوں نہ ہو۔ جن کے دم کرم سے میری زندگی پر بہا رہے۔

پھر مدینہ منورہ میں تنہائی کو تو ایک عظیم نعمت ہونا چاہیے تھا۔

کوئی جاننے والا نہ کوئی پوچھنے والا نہ کوئی انتظار کرنے والا ہو۔ مسجد نبویؐ میں بیٹھ کے باوجود ایک فرد واحد بیٹھا ہو، سامنے سبز گنبد ہو۔ نیچے سبز جالی ہو اور جالی کے



بیچے حضورؐ خود جلوہ افروز ہوں۔ اس سے بڑھ کر کوئی جنت ہو سکتی ہے بھلا۔  
پھر مجھے یہ احساس کیوں ہوا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ  
اس قوت کے انخلاء کے بعد جس کے قرب سے ان جانے میں میں متناطیس بنا ہوا تھا۔  
میں پھر سے زنگ آلود پتھر میں بدل گیا تھا۔

در اصل جب سے قدرت نے کہا تھا کہ میں حجرہ مبارک میں نہیں جاؤں گا۔  
جب سے قدرت نے سبز جنگلے پر حاضری دینی چھوڑ دی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ  
انہیں رخصت کر دیا گیا ہے اور میرا سلام منظور کر لیا گیا ہے۔ تب سے ہمارا کوئی مرکز  
نہ رہا تھا۔

### طلب اور منزل

منزلوں کو پالینا کتنی بڑی قیامت ہے۔ سب کچھ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔  
خود منزل بھی۔ مجھے ایسے لگتا ہے جسے طلب سے عظیم تر کوئی منزل نہیں۔ طلب اور  
جدوجہد۔ شاید یہ بشریت کا تقاضا ہو۔

جتنی دیر ہماری توجہ باب جبرئیل پر مرکوز رہی۔ جتنی دیر ہمیں حجرہ مبارک  
میں حاضری دینے کی لگن رہی۔ جتنی دیر سبز جنگلے کے قریب کھائے ہو کر حضورؐ کو سلام  
کرنے کا جنون قائم رہا۔ مدینے کا شہر تو کیا ساری کائنات سبز گنبد کی اوٹ میں دیکھی بیٹھی  
رہی۔

پھر جب قدرت کو رخصت کر دیا گیا تو ان کے لیے حجرہ مبارک میں جانا نا  
مناسب ہو گیا۔ جب سے مجھے احساس کہ میرا سلام قبول کر لیا گیا ہے تو میرے لیے  
حاضری بے معنی ہو کر رہ گئی ہے چونکہ میری حاضری کا مقصد صرف ایک تھا کہ حضور  
اعلیٰؐ کی خدمت میں سلام عرض کروں۔ دل کا سلام۔ روح کا سلام۔ سارے وجود کا  
سلام۔

کاش کہ حضور اعلیٰؐ قدرت کو رخصت کی اجازت نہ دیتے۔ کاش کہ حضور  
اعلیٰؐ میرا سلام قبول نہ فرماتے اور ہم دونوں ہر صبح باب جبرئیل پر دروازہ کھلنے کا انتظار  
کرتے۔ حجرہ مبارک میں دھکے کھاتے اور پھر سبز جنگلے کو پکڑ کر میں اپنے سارے وجود  
سے اس عظیم ترین انسان اور اللہ کے رسولؐ کی خدمت میں سلام عرض کرتا رہتا۔



یونہی ہفتے گزر جاتے، مہینے گزر جاتے، صدیاں گزر جاتیں۔  
 قدرت سچ کہتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ لوگوں کو اس کا شعور نہیں کہ اللہ  
 سے کیا مانگیں۔ وہ بن سوچے سمجھے مانگتے ہیں۔ انہیں شعور نہیں کہ کس مقام کو اپنی  
 منزل قرار دیں۔ ذہن میں کسی چیز کو مقصد تصور کریں۔

میں خود بہت بڑا احمق ہوں۔ سر زمین حجاز کو روانہ ہونے سے پہلے اگرچہ میں  
 قطار حج میں شمولیت کے لیے حاضری دینے آیا تھا لیکن میرے دل میں حج کی آرزو نہ  
 تھی۔ میرے دل میں صرف ایک آرزو تھی۔ ایک مقصد تھا کہ خانہ خدا میں پہنچ کر  
 اپنے اللہ سے حضور میں نواؤں مدینہ منورہ میں سبز جنگلہ کو پکڑ کر حضور اعلیٰ کو سلام  
 عرض کروں۔ اس سے عظیم تر مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔

### خوشنودی

میری دانست میں خوشنودی سے بڑی مانگ اور کوئی نہیں۔ اللہ کی خوشنودی،  
 رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی، بزرگوں کی خوشنودی۔

اور میری سمجھ کے مطابق حصول خوشنودی کا واحد طریقہ عجز، احترام، خلوص  
 اور محبت بھرا سلام ہے۔ اگر سلام قبول ہو جائے تو حصول خوشنودی مکمل ہو جاتی ہے۔  
 پتہ نہیں کیوں۔ میرے دل میں جنت کی آرزو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر اللہ  
 جنت دے دے تو مضائقہ نہیں لیکن اس کی آرزو کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ دوزخ کا ڈر  
 میں شدت سے محسوس کرتا ہوں لیکن دوزخ سے بچنے کے لیے ثواب کمانے کی آرزو  
 نہیں رکھتا۔ مجھے اس آرزو سے دوکانداری کی بو آتی ہے۔ میرے ذہن میں نیکی،  
 خواہش ثواب سے بے تعلق چیز ہے۔ بے مقصد بے نیاز۔

مجھے یہ آرزو بھی نہیں کہ اللہ والا بن جاؤں یا بزرگی مل جائے یا مست ہو  
 جاؤں۔ مجھے مراتب کی طلب نہیں۔ میری دانست میں عام انسان بذات خود ایک عظیم  
 مرتبہ ہے مجھے صرف ایک آرزو ہے کہ میرا رخ مثبت رہے۔ انسان کی طرف اللہ کی  
 طرف۔

اسی لیے حاضری سے میرا مقصد صرف سلام عرض کرنا تھا۔ حصول خوشنودی

تھا۔



اگر آپ کسی بادشاہ کو سلام کرنے کے لیے حاضری دیں اور بادشاہ کہے جاہم نے تیرا سلام قبول کیا تو باقی کیا رہ گیا کچھ بھی نہیں۔ اب آپ کس منہ سے شاہ کے حضور ایستادہ رہیں گے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مزید حاضری کا کوئی بہانہ نہ رہا، جواز نہ رہا۔ لہذا مدینہ منورہ کا شہر جو پہلے سبز گنبد کی اوٹ میں دبکا بیٹھا تھا۔ باہر نکل کر میرے گرد و پیش پھیل گیا۔ مدینہ منورہ خالی مدینہ رہ گیا۔ مسجد نبویؐ خالی رہ گئی اور نماز احساس حضوری کی جگہ ادائیگی فرض رہ گئی۔ تکمیل کا اعتبار کس قدر خوف ناک چیز ہے۔

وہ مدینہ منورہ جس کا نام سن کر میرا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ اب میرے سامنے ایک عام شہر کی طرح تھا۔ ایک تجارتی شہر، بدیشی مال سے لدی ہوئی دکانیں، جھلمل جھلمل کرتی ہوئی اشیا۔ نگاہ میں ہنوس کے دیے روشن کرنے والے کیاب تھے، خریداروں کا انبوه، تاجروں کی کھلی زوہ ہتھیلیاں۔

قدرت کے رخصت ہونے کے بعد پورا ایک دن تو میں ہوٹل کے پتنگ پر یوں پڑا رہا جیسے پلاسٹک کے غبارے سے پھونک نکل جائے تو وہ چھپھرا بن جاتا ہے۔

## چالیس نمازیں

دن بھر سوچتا رہا کہاں جاؤں۔ کیا کروں۔ میرے وہ نئے ساتھی جن کے ساتھ میں نے مدینہ سے بدہ جانا تھا۔ میری طرح بستروں پر پڑے ہوئے تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بھی مدینہ منورہ سے رخصت ہو چکے تھے۔ انہیں بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائیں، کیا کریں۔

وہ دونوں پڑھے لکھے دانشور تھے۔ لہذا وہ حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے میں وقت گزارتے تھے۔ وہ مدینہ منورہ میں صرف اس لیے مقیم تھے کہ ابھی ان کی چالیس نمازیں پوری نہیں ہوئی تھیں۔

پتہ نہیں اس کا ماخذ کیا ہے لیکن زائرین میں یہ خیال عام ہے کہ مدینہ منورہ کے قیام میں چالیس نمازیں ادا کرنا ضروری ہے۔

میرے دونوں نئے ساتھی اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ کب ان کی چالیس نمازیں پوری ہوں اور وہ جدہ کو عازم سفر ہوں۔



وہ دونوں بیستر نمازوں کی گنتی میں صرف کرتے تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ وہ مسجد نبوی میں تیس نمازیں ادا کر چکے ہیں۔ دوسرا کہتا تھا نہیں ہم تو بیس نمازیں ادا کر چکے ہیں۔ آپس میں روز بلائیں جھگڑا ہوتا، بحث ہوتی پھر سے گنتی کی جاتی۔ ایک کتاب پر سوں مصر کی نماز پڑھ کر رخصت ہو سکتے ہیں۔ دوسرا کہتا نہیں عشاء پڑھنے کے بعد چالیس نمازیں پوری ہوں گی۔

### اجازت رخصت

ان دونوں اصحاب کے ساتھ ایک معمر خاتون بھی تھی جو فجر سے پہلے مسجد نبوی میں جا بیٹھتی تھی۔ اور عشاء پڑھنے کے بعد واپس آتی۔ اس خاتون نے کبھی نہ سوچا تھا کہ کتنی نمازیں پڑھنی باقی ہیں نہ ہی اس نے اپنے ساتھیوں کی بحث میں کبھی حصہ لیا تھا۔

جب بھی وہ بحث چھیڑتے تو خاتون تسبیح اٹھا لیتی اور ذکر میں مصروف ہو جاتی۔ اسے چالیس نمازیں پوری کرنے کا فکر نہ تھی۔ اس کے برعکس اسے ایک اور ہی لگن لگی تھی۔ جس میں وہ سرشار رہتی تھی۔ دو ایک بار اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

”یہ حاضری بھی کوئی حاضری ہے۔ حاضری تو وہ ہوتی ہے جب حضور کے قدموں میں آکر بیٹھ جاؤ اور جب تک حضور خور رخصت کی اجازت نہ دیں بیٹھے ہی رہو تین ماہ کے بعد اجازت ملے چاہے ایک سال لگ جائے۔“

پھر محترمہ پر رقت طاری ہو جاتی اور اس کی تسبیح کے منکے بھیک جاتے۔ معمر محترمہ کی باتیں سن کر میرے دل میں بیسیوں سوال ابھرتے۔ ”ہم دونوں زائر تھے۔ مدینہ منورہ کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ ہمارے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے۔ وہ مدینہ منورہ میں مقیم تھی، میں مدینہ شہر میں آوروں تھا۔ وہ مسجد نبوی میں وقت گزارتی تھی، میں بازار میں اشیاء بینی کرتا تھا۔ وہ رخصت کے لیے اجازت کی طالب تھی، میں حاضری کے احساس سے ہی بیگانہ تھا۔ پھر رخصت کی اجازت کا سوال کیسے پیدا ہوتا؟ وہ از خود آئی تھی، میں لاشی کے سارے پینچا تھا اور اب اس لاشی سے بھی محروم ہو چکا تھا۔“



پھر قدرت کے متعلق دل میں کئی سوال اٹھتے۔ ”کیا قدرت کو علم تھا کہ چالیس نمازیں ادا کرنے سے پہلے مدینہ منورہ سے رخصت نہیں ہونا چاہیے پھر وہ ہیں نمازیں ادا کرنے کے بعد کیوں چلے گئے تھے۔ کیا انہیں رخصت ہونے کی اجازت مل گئی تھی؟ کیا مرد قدیم اجازت کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔“

اس روز لیٹے لیٹے ہر ایہوں کی گنتی سنتے سنتے میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس حد تک ماؤف کہ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ مرد قدیم کا واقعہ میرے ذہن کا تخیل ہے اور بس شاید قدرت نے مجھے پٹا ناز کر رکھا ہو۔ شاید اس کی حیثیت تماشا گر کی ہو اور میرے تمام تر گذشتہ محسوسات کی حیثیت رکھتے ہوں۔

### ریورس گینٹر

قدرت نے کہا تھا کہ حج کے اثرات واپسی پر مرتب ہوتے ہیں اور حج کے دوران یا بعد میں رجعت کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ کئی ایک بزرگ صرف اس ڈر کے مارے حج پر نہیں جاتے کہ رجعت کی زد میں نہ آجائیں۔ کہیں مجھے بھی ریورس گینٹر تو نہیں لگ گیا تھا۔

چارپائی پر لیٹے لیٹے سینکڑوں خیالات میرے ذہن میں آتے۔ پھر اندر سے آواز آتی کہ یہ شک و شبہات جو تمہیں دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ تمہیں ریورس گینٹر لگ چکا ہے۔

پھر ایک اور آواز آتی۔ اگر ریورس گینٹر لگ گیا ہے تو پھر کیا ہوا۔ یہ احسان کیا کم ہے کہ مجھے حاضری دینے کا موقعہ عطا کیا گیا۔ مجھے کالے کوٹھے کے گرد والہانہ چکر لگا کر اللہ کو منانے کی خوشی نصیب کی گئی۔ اس عظیم ترین انسان کے حضور اس دروازے سے حاضری دینے کا اعزاز حاصل ہوا جہاں سے حضرت جبرئیلؑ تشریف لایا کرتے تھے۔

رجعت ہو گئی ہے تو کیا ہے۔ رجعت ماٹھے پر نکلی ہوئی تو نہیں ہوتی۔ رجعت ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اب میں حاجی ممتاز مفتی ہوں اور حاجی صرف وہی فرد نہیں ہوتا جس کا حج قبول ہو جائے۔ حاجی وہ ہوتا ہے جو مقدس مقامات سے گھوم پھر آئے۔ ان خیالات نے میری ہمت بندھائی۔



پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ رجعت کا خوف بالکل بے معنی ہے۔ رجعت تو جب ہوتی ہے جب کوئی متحرک ہو، آگے کی جانب بڑھ رہا ہو۔ اگر کوئی پہلے ہی زمین میں کھبے کی طرح گڑا ہو تو رجعت کیسی۔ رجعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تو خواستواہ ڈر رہا ہوں۔

اس درویش نے کہا تھا جہاں سونا ہے وہیں چور ہے۔ میرے پاس سونا چھوڑ بیٹل بھی نہیں پھر چور کا خطرہ کیسا؟ راہزن کا ڈر کیوں؟

### اشیاء کا ناچ

اگلے روز یہ سوچ کر میں اٹھ بیٹھا اور مدینے کے شہر میں گھومنے پھرنے لگا۔ مدینے کی مارکیٹ کی دوکانوں نے مجھے دیکھا تو آپس میں خوشی بھری کھسر پھسر کرنے لگیں۔ پھر انہوں نے زیر لب تبسم سے ایک دوسری کے ہاتھ پکڑ لیے اور وہ میرے ارد گرد دائرہ بنا کر راک اینڈ رول ناچنے لگیں۔ چیزیں شلفوں سے باہر نکل آئیں اور مجھ سے گویا آنکھ مچولی کھیلنے لگیں اور میں بھول گیا کہ میں زائر ہوں کہ میں حاضری دینے کے لیے وہاں مقیم ہوں، میری آمد کا مقصد کیا ہے اور میری منزل کیا ہے۔

آہا کتنی اچھی ہے یہ کیتلی۔ اتنی ہلکی اتنی خوبصورت اتنی سستی۔ ارے یہ یہ کپڑا۔ بالکل وہی کپڑا جسے پہننے کی آرزو میری بیوی عرصہ دراز سے دل میں رکھائے بیٹھی ہے۔ اور یہ رنگ رنگ کے منکے۔ میری بیٹی انہیں دیکھ کر کھل اٹھے گی۔ ”تھینک یو ڈیڈی۔“ اور یہ جو فرانس کے بنے ہوئے جاء نماز ہیں ان سے میں اشفاق اور بانو کو ٹر خاسکوں گا۔ بشیر کا کیا ہے۔ وہ تو سادھو آدمی ہے البتہ مودی۔۔۔۔۔ ہاں مودی کے لیے کچھ ہونا چاہیے۔

میرے قریبی عزیز اور دوست سب میرے ارد گرد آ جمع ہوئے اور پھر ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر بازوؤں کو جھلاتے ہوئے اس زرق برق بازار میں یوں گھومتے گئے جیسی جاٹ موٹی میلے میں گھومتے ہیں۔

### لذت خریداری

قدرت کے جانے کے بعد میں دو دن مدینے میں مقیم رہا۔ سارا دن بازاروں میں دیوانہ وار گھومتا، چیزوں کی قیمتیں پوچھتا، پھر ہوٹل کی طرف بھاگتا، بوائے ایک



ہاف سیٹ چائے اور پھر ڈائننگ روم کی میز پر بیٹھ کر اپنی نقدی گنتا۔ ممکن ضروری اخراجات کو جوڑتا، کتنے پیسے بھس گئے جو میں خرچ کر سکتا ہوں۔ پھر چیزوں کی قیمتیں جوڑتا۔ پھر دفعتاً خیال آیا، کہیں جدے پہنچ کر کوئی ہنگامی خرچ نہ پڑ جائے۔ کوئی ٹیکس، کوئی فیس، کوئی ٹول، پھر ایک اضطراب مجھے چاروں طرف سے آگھیرتا۔ اگر رقم کم ہو گئی تو۔۔۔ تو میں کس سے مانگوں گا۔

لیکن اگر کوئی ہنگامی خرچ نہ پڑا اور رقم پہنچ گئی تو۔۔۔ تو وہ ضائع ہو جائے گی۔ شاید ایسا کپڑا ایسی کیتلی، ایسی قمیض جدے میں نہ ملے۔

پھر میں از سر نو بازار کی طرف اٹھ بھاگتا اور چیزوں کے انبار کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتا شاید کوئی اور کپڑا مل جائے ایسا ہی مگر سستا۔ شاید کیتلی کی جگہ کوئی اور چیز مل جائے۔ دیوار نہ وار میں بازار میں گھومتا اور نئی چیزوں کی قیمتیں پوچھتا۔ پھر وہی ہوٹل بوائے ہاف سیٹ چائے، پھر سے نقدی گنتا، چیزوں کی قیمتیں جوڑتا، ٹھہرو لیکن اگر۔۔۔ اور پھر بازار کی طرف اٹھ دوڑتا۔

بازار میں بھاؤ پوچھنے اور قیمتیں جوڑنے کے دوران مسجد نبویؐ سے اذان گونجتی۔ ایک ساعت کے لیے میں چونک اٹھتا جیسے مجرم جرم کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو اور کچھری کا پیادہ حاضری کے سن پکار رہا ہو۔

نماز

بازار سے میں مسجد نبویؐ کی بیرونی گراؤنڈ میں پہنچ کر جائے نماز بچھاتا اور پھر اللہ اکبر کہہ کر وہیں نماز داغ دیتا۔

یہ میری پرانی عادت ہے۔ نماز کے دوران میرے ذہن میں دور کی باتیں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بھولے ہوئے نام یاد آ جاتے ہیں، بھولی بھری چیزیں یاد آ جاتی ہیں۔ بڑے بڑے نکتے ذہن میں آتے ہیں، بڑی بڑی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

لیکن وہاں تو صرف ایک مسئلہ درپیش تھا، کم نقدی سے زیادہ سے زیادہ چیزیں خریدنا اور اس مسئلے کو حل کرنے کا موزوں ترین وقت نماز تھا۔

نمازوں کے دوران میں از سر نو حساب جوڑنا شروع کر دیتا۔ اگر دکاندار



پلاسٹک سیٹ کی قیمت میں سے پانچ ریال کم کر دے۔ اللہ اکبر۔ پھر میں دوسری چیزیں بھی خرید سکوں گا۔ پلاسٹک کا سیٹ میں اپنی محبوبہ کو تحفہ دوں گا۔ اللہ اکبر۔ یہاں کے واقف کار کہتے ہیں۔ یہ دوکاندار ہیں مانگتے ہیں اور سات پر سودا طے ہو جاتا ہے۔ سع اللہ لمن حمد۔

نماز کا جمعہ کا کرنے کے بعد میں پھر بازار میں جا پہنچا۔ اور پھر وہی بھاؤ پوچھتا، نقدی گنتا اور حساب جوڑتا۔

ارے دوکان پر بیٹھے ہوئے ایک پاکستانی حاجی کو علانیہ حساب جوڑتے ہوئے دیکھ کر دفعتاً "مین نے محسوس کیا کہ میں اکیلا نہ تھا۔ اس مشغل میں دوسرے لوگ بھی میرے ساتھی تھے۔

دراصل میری نگاہ حرص سے اس قدر چپ چپ کر رہی تھی کہ میری توجہ صرف چیزوں پر محدود تھی۔ میں نے لوگوں کی طرف غور سے دیکھا ہی نہ تھا، الثا میں تو لوگوں سے ڈر رہا تھا کہ کہیں ان کو علم نہ ہو جائے کہ مسجد نبویؐ سے ملحقہ بازار میں ایک زائر ایسا بھی ہے جو یہ بھول چکا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں مقیم ہے کہ وہ مسجد نبویؐ سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اس قدر دور ہے کہ اس کا مطمح نظر چیزوں کی خرید و فروخت ہے۔ میں وہاں سبز گنبد کے سایہ میں چھپ کر جرم کر رہا تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں لوگوں کو علم نہ ہو جائے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

لیکن پاکستانی حاجی کو سرعام اپنی نقدی کو جوڑتے اور مطلوبہ اشیاء کی قیمتیں جمع کرتے ہوئے دیکھ کر میرے دل سے بوجھ اٹھ گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بازار میں بسھی لوگ مشغل میں مصروف ہیں۔

میرے دونوں نئے ساتھی جو صرف نمازیں پوری کرنے کی خاطر مدینہ میں رکے ہوئے تھے۔ عرصہ دراز سے خرید و فروخت سے فارغ ہو چکے تھے۔

مدینہ منورہ میں پہنچتے ہی انہوں نے اس فریضہ کو سرانجام دینے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اب ان کے پاس مزید نقدی نہ تھی۔ اس لیے وہ حریصانہ نگاہوں سے بازار میں گھوما پھرا کرتے تھے۔

آوارگی

جب بھی وہ مجھے بازار میں مل جاتے تو مجھے دیکھ کر ان کی باچھیں کھل جاتیں۔



”نہ نہ یہ نی سیٹ نہ خریدنا“ وہ چلاتے ”یہ تو بڑا منگاہے۔ اس نکلوالی دکان پر ایک سٹائیٹ بک رہا ہے اور ڈیزائین میں وہ اس سے زیادہ خوبصورت ہے یہ تو ایران کا بنا ہوا ہے اور وہ۔۔۔ وہ تو خالص پیرس کا ہے۔ چلو ہم تمہیں ساتھ لے چلتے ہیں۔“

پھر وہ مجھے ساتھ ساتھ لے پھرتے ’نئی نئی چیزیں دکھاتے‘ میرے لے دوکانداروں سے جھگڑتے ’بھاؤ کم کرتے‘ اپنی نگرانی میں پیکنگ کراتے۔

جب میری شاپنگ ختم ہو جاتی تو ہم تینوں دوسرے خریداروں کو مشورے دیتے۔ انہیں ساتھ ساتھ لے پھرتے ’چیزیں دکھاتے‘ ان کی بناوٹ پر بحث کرتے اور آخر کار دوکاندار سے بھاؤ پر جھگڑا کرتے۔

چیزیں خریدنے میں کتنی لذت ہوتی ہے چاہے وہ پرانی ہوں۔

دو روز کے بعد ہم مدینہ منورہ سے رخصت ہو رہے تھے۔ مقرر محترمہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی چونکہ اسے رخصت کی اجازت مل گئی تھی۔ میرے دونوں ساتھی خوش تھے کہ انہوں نے چالیس نمازیں پوری کر لی تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خموشی کے آنسو بہاؤں یا غم کے۔ نہ تو میں نے چالیس نمازیں پوری کی تھیں نہ ہی مجھے اجازت ملی تھی۔



# سفارت پاکستان

اگلے روز ہم مدینہ منورہ سے رخصت ہو رہے تھے۔

## وداع

یہ وداع مکہ معظمہ کے وداع سے کتنا مختلف تھا۔ مکہ معظمہ سے تمام زائرین ایک ہی دن وداع ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی حیثیت وداع انبوہ کی ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ میں زائرین کے ٹولے آتے رہتے ہیں جاتے رہتے ہیں۔ اس لیے مکہ معظمہ سا عظیم الشان وداع کا منظر پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک اللہ والوں کا تعلق ہے۔ ان کے وداع میں خوشی کا عنصر ہوتا ہے چونکہ وہ اجازت کے بغیر رخصت نہیں ہوتے اور اجازت کامل جانا حصول خوشنودی کا پیغام ہوتا ہے۔

ہمارا قافلہ صرف چار افراد پر مشتمل تھا۔ وہ بھی خوش تھے اور چاہتے تھے کہ پر لگ جائیں اور اڑ کر وطن پہنچ جائیں۔

## سفارش خروج

جدہ کے سفر کے دوران میرے ہمراہی زیادہ تر سیٹ کی بکنگ کی باتیں کرتے رہے۔ انہیں فکر دامن گیر تھی کہ شاید جلد سیٹ نہ ملے۔ انہیں اس مقدس سرزمین پر زیادہ دیر رکنا نہ پڑے۔ ان کی خواہش تھی کہ جدہ پہنچتے ہی بکنگ ہو جائے۔ اگر نہ ہوئی تو۔۔۔ کسی کی سفارش کام آسکتی ہے۔

”کیا واپسی کی سیٹ سفارش سے ملتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سفارش سے بھی مل جائے تو اسے خوش قسمتی سمجھئے۔ لوگ مہینوں پڑے



رہے ہیں کوئی پوچھتا نہیں۔" ایک نے جواب دیا۔

دوسرا ہمراہی بولا۔ "آپ کے پاس کوئی سفارش ہے کیا؟"

"نہیں تو۔" میں نے جواب دیا "مجھے یہاں کون جانتا ہے۔"

دفعتا "پہلا ہمراہی چلایا۔" آپ کی بات بن جائے گی۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ نے اپنے ساتھ ایک خاتون کو لے جانا ہے نا۔" اس نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد آیا۔ قدرت اللہ جاتے ہوئے تاکید کر گئے تھے کہ خاتون کو

ہمراہ لائیے۔" دوسرا بولا۔ "میرے سامنے انہوں نے کہا تھا۔"

"کون خاتون؟"۔۔۔ "خاتون کی بات میں بالکل بھول چکا تھا۔"

"وہ خاتون جو پاکستان کے سفیر کے گھر ٹھہری ہوئی ہیں۔" پہلے ہمراہی نے

جواب دیا۔

"ہاں ہاں مجھے یاد آ گیا قدرت نے کہا تھا اس خاتون کو ساتھ لے کر آنا۔ لیکن

اس کا سفارش سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ دونوں قہقہہ مار کر ہنسے بولے۔ "خاتون جو سفیر کی مہمان ہے خود آپ کی

سفارش بن جائے گی۔"

بھگوڑا

جدہ میں رابطہ افسر غنی نے مجھے جدہ پبلیس میں ٹھہرا دیا اور خود رخصت ہو گیا۔

دو ایک گھنٹے میں تن تنہا اس چھوٹے سے "کیوبیکل" میں پڑا رہا۔ پھر دفعتا "مجھے خیال

آیا کہ اگر ہوٹل کے مینجر نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو تو میں اسے کیا جواب دوں۔

میں حکومت سعودیہ کا مہمان تو نہیں تھا۔ وہ مہمان جس سے میں منسلک تھا رخصت ہو

چکا تھا۔ فرسٹ میں میرا نام تو نہیں تھا۔ اگر مینجر نے آکر کہا کہ تو مہمان نہیں بہروپا

ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر انہوں نے بل مانگا تو میں کہاں سے ادا کروں گا، لیٹے

لیٹے میں گھبرا گیا۔

علاوہ ازیں وہ کراہت نچا تھا چونکہ سارا ہوٹل ایئر کنڈیشن تھا۔

ایئر کنڈیشن کی وجہ سے میرا دم گھٹا جا رہا تھا۔ پھر میرے دل میں بے



ہوئے اندرونی ڈر اور خوف نے کمرے کو اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس ٹھن کی وجہ سے میرا وہاں رات بسر کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

ویسے بھی میری شدید خواہش تھی کہ آٹھ دس دن ایک عام زائر کی طرح بسر کروں۔ میں نے اس کا اظہار رابطہ افسر سے بھی کیا تھا لیکن رابطہ افسر مہمانداری کے فرائض کی تکمیل کے خیال سے مصر تھا کہ میں آرام و آسائش سے جدہ پیلس میں قیام کروں۔ مہمانداری کے جذبے کی شدت کی وجہ سے اس نے اس قدر اصرار کیا تھا اور اس کے اصرار میں اتنا خلوص تھا کہ میں انکار نہ کر سکا تھا۔

رابطہ افسر کے رخصت ہونے کے بعد جدہ پیلس کی دیواریں مجھ پر تنگ ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ایئر کنڈیشنز کے شور نے میرا گلا دباننا شروع کر دیا۔ ہوٹل کی ادائیگی کے ڈر سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ ماحول کی ٹھن نے مجھے زچ کر دیا۔ حتیٰ کہ میں مجبور ہو گیا۔

آدمی رات کے وقت میں نے اپنا بستر سر پر اٹھایا ہاتھ میں سوٹ کیس پکڑا اور چوروں کی طرح ڈر تا ڈر تا کاریڈار میں داخل ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اس وقت تمام بیرے ڈائننگ ہال میں مصروف تھے۔ اس لیے کسی نے مجھے روکا نہیں۔

ہوٹل سے باہر نکل کر جب میں نے ایک راہ گیر سے مسافر خانے کا راستہ پوچھا تو اس کا جواب سن کر دفعتاً "مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک غیر ملک میں ہوں۔ ساری رات میں نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا گھومتا رہا اور پھر رات کے پچھلے پہر نہ جانے کیسے خود بخود مسافر خانے پہنچ گیا۔

مسافر خانہ چارہ منزلہ بیرک نما عمارتوں پر مشتمل تھا جن میں نہ جانے کتنے وسیع و عریض کمرے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ایک کشادہ کمرے میں زمین پر بستر بچھا کر پڑ رہا۔

میرا خیال تھا کہ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ میں اپنی بکنگ کرا لوں۔ اور بکنگ کرانا کیا مشکل بات ہے۔ بس سفیر صاحب کے گھر سے رابطہ پیدا کرنا ہو گا اور محترمہ سے کہنا کہ سفیر صاحب سے کہہ کر سیٹ ریزرو کرالیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

یہ تو صرف ایک دن کا کام ہے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں آرام سے مسافر خانے کے زائرین کا جائزہ لوں گا۔ اسی لیے اگلے روز صبح سویرے اٹھتے ہی



میں پاکستانی سفارت خانہ میں جا پہنچا۔

فورا "سفر صاحب سے ملو ادیں گے اور پھر ان کی سفارش سے بنگ ہو جائے گی اور ہم دو ایک دن کے اندر اندر کراچی پہنچ جائیں گے۔"

جناب عالی۔ اے جناب عالی

پاکستانی سفارت خانے پہنچ کر میں نے بڑی شان سے بلڈنگ کا جائزہ لیا۔ بلڈنگ کے بیرونی احاطہ نما صحن میں پچاس ساٹھ پاکستانی کھڑے تھے۔ وہ بڑی حسرت سے سفارت خانے کی بلڈنگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دفتر کی عمارت کے سامنے دو تین چڑھسی سٹولوں پر بیٹھے تھے تاکہ کوئی سائل دفتر میں داخل نہ ہو سکے۔ میں نے سائلوں پر سرسری نگاہ ڈالی اور پھر سیدھا دفتر کی طرف ایک امتیازی شان سے بڑھا۔

میں سائل تو نہیں۔ میں کوئی عرضی لے کر تو نہیں آیا، مجھے کوئی سرکاری کام نہیں۔ مجھے یہ لوگ کیوں روکنے لگے۔ جونہی میں چڑھسیوں کے قریب پہنچا وہ تو سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا وہ میری تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے ہیں لیکن جب وہ میرے رستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تو میں گھبرایا۔

"دیکھیے مجھے سفر صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ "ادھر جا کر بیٹھ جائیے" ایک احاطہ نما صحن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ابھی چھوٹے صاحب آکر بات کریں گے۔" میں نے اپنی آمد کے متعلق مزید تفصیلات بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہی۔ لیکن ان کارکنوں کے تیور دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔

دو ایک گھنٹے میں بیرونی احاطے میں چھوٹے صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی نہ آیا تو میں نے پھر کسی سے بات کرنے کا ارادہ کیا۔ ان چڑھسیوں سے بات کرنا بے کار تھا۔ یہ ان پڑھ لوگ بھلا بات کو کیا سمجھیں گے۔ ہاں اگر دفتر کا کوئی آدمی ہو تو اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ دفتر سے ایک بابو نکل کر باہر آ رہا ہے۔ میں نے دوڑ کر اسے جالیا۔ "جناب ولا! مجھے سفر صاحب سے ملنا ہے۔"

بابو نے رک کر بڑے غور سے میرا جائزہ لیا اور پھر مسکرا کر آگے چل پڑا۔

ارے جواب بھی نہیں دیا۔ کمال ہے۔ کچھ تو کہتا۔ اوہو غلطی میری ہے۔ میں

نے اس نکتے کی وضاحت نہیں کی کہ مجھے سفر صاحب سے کوئی سروکار نہیں ہے۔



اتنے میں ایک صاحب گیٹ سے داخل ہوئے اور سفارت کی طرف بڑھے۔  
میں نے بھاگ کر اسے السلام علیکم کہا اور پھر اپنا مقصد بیان کرنے کی کوشش  
کی لیکن پھر اس کے کہ میں اپنی بات ختم کر سکتا اس نے بیرونی احاطے کی طرف اشارہ  
کیا اور آگے چل پڑا۔

### صحرا نوردی

دو روز میں سفارت خانے کے احاطے میں صحرا نوردی کرتا رہا اور ہر آتے  
جاتے کو کہتا رہا کہ مجھے سفیر صاحب سے ملنا ہے میں سائل نہیں ہوں، میرا کوئی ذاتی کام  
نہیں ہے۔

پھر سفارت کے تمام اہل کار مجھ سے واقف ہو گئے۔ پہلے تو وہ میری بات سن  
کر مسکرا دیتے تھے پھر جو نہی میں قریب پہنچتا وہ خود کہتے: ”آپ نے سفیر صاحب کو ملنا  
ہے نا ذاتی کام سے نہیں۔ آپ احاطے میں انتظار کریں چھوٹے صاحب ابھی آ کر بات  
کریں گے۔“

دو روز کے بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ سفیر صاحب سے ملنا مہم جوئی کے  
مترادف ہے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے محسوس ہوا کہ کسی سے ملنا اس قدر مشکل ہو  
سکتا ہے۔

پاکستان میں بڑے بڑے اہل کاروں سے ملا تھا۔ مجھے علم تھا کہ بڑے لوگوں  
سے ملنا ایک دشوار کام ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ لوگ جو ملاقات کے انتظام کراتے  
ہیں۔ ملنے والے کی بات تو سنتے ہیں۔ بات کا معقول جواب دیتے ہیں۔ چلو معقول نہ  
سی لیکن جواب تو دیتے ہیں۔ بات تو سنتے ہیں۔ مجھے خود ”صدر گھر“ میں ایک چھوٹا  
اہل کار ہونے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ سائلوں سے ملنے کے مواقع ملے ہیں لیکن  
ایسی کیفیت تو میں نے کہیں نہیں دیکھی تھی۔

### فون نمبر

تیسرے روز دفعتاً ”مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ فون کو آزماؤں۔ شاید فون سے  
بات بن جائے۔“

لیکن سفارت کا فون نمبر کیسے حاصل ہو؟ سفارت کا فون نمبر حاصل کرنے کے



لے تیرے روز پھر سفارت خانے جا پہنچا۔ وہاں جس صاحب سے فون نمبر پوچھا وہ مسکرا کر کہتا "ہاں مجھے علم ہے آپ سفیر صاحب سے ملیں گے۔" اور پھر آگے بڑھ جاتا، سارا دن میں سفارت میں گھومتا پھرتا رہا۔ شام کو ناکام مسافر خانے میں لوٹ آیا۔

مسافر خانے میں آوارہ پھرتے ہوئے دفعتاً "میری نگاہ بڑے بڑے بورڈوں پر جا پڑی جو بارکوں پر لگے ہوئے تھے۔" "وزارت معلومات۔" "وزارت حج۔" "وزارت خوراک۔" "وزارت رسل و رسائل۔" "ارے مسافر خانے کے اردگرد سعودی عرب کی تمام تر وزارتوں کے دفتر موجود تھے اور سعودی کارندے مسافروں کی سہولت اور آسانی کے لیے سرگرم کار تھے۔ میں دفتر معلومات کی طرف لپکا۔" جناب والا مجھے سفارت پاکستان کا فون نمبر چاہیے۔" کاؤنٹر پر کھڑے عرب نے فون ڈائریکٹری نکالی اور سفارت کا نمبر دیا۔

چوتھے روز میں نے سفیر صاحب کو فون کیا۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری بولے کہ سفیر صاحب بے حد مصروف ہیں۔ اس روز میں سارا دن ہر گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد فون کرتا رہا اور جواب ملتا رہا کہ سفیر صاحب بے حد مصروف ہیں۔ اس روز سارا دن میں ٹیلیفون بوتھ میں کھڑا رہا۔

پانچویں دن میں فون پر سیکرٹری صاحب کو اپنی پوری کہانی سنانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بولے "آپ یہاں آجائیں میں کوشش کروں گا کہ آپ کو ان سے ملا دوں ویسے مشکل ہے چونکہ وہ بے حد مصروف ہیں۔"

چھٹے روز میں سارا دن سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھا رہا کہ کب سفیر صاحب کی مصروفیت ختم ہو اور سیکرٹری صاحب میرا تذکرہ کر سکیں۔

پھر دفعتاً "مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ سفیر صاحب کے گھر ٹیلیفون کروں وہ محترمہ وہیں تو ہوں گی۔"

سفیر صاحب

سیکرٹری صاحب نے فون گھر لگا دیا۔ وہ خاتون فون پر آگئیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ مجھ پر برس پڑیں بولیں "ارے صاحب آپ نے تو حد کر دی چھ روز سے ہم آپ کی تلاش میں سرگرداں ہیں، جدہ پبلس والوں نے کہا وہ یہاں سے روپوش



ہو گئے ہیں۔ رابطہ افسر غنی صاحب کو مکہ معظمہ سے بلوایا گیا۔ چار روز وہ آپ کو تلاش کرتے رہے جگہ جگہ ڈھونڈ کی لیکن آپ نہ ملے۔“

اس وقت میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑوں اور اسے بتاؤں کہ میں کہاں تھا۔ لیکن سیکرٹری کے تیور دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔

میں نے کہا، ”محترمہ اس وقت میں پی ایس صاحب کے پاس بیٹھا ہوں، آپ سفیر صاحب کو فون کریں کہ وہ مجھ سے مل لیں۔“

چند ایک منٹ کے بعد سفیر صاحب کا چہرہ اسی بھاگا بھاگا آیا، بولا ”بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔“

وہ ایک مختصر سا کرا تھا۔ جس میں ایک میز اور چار ایک کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میز پر کوئی فائل نہ تھی۔ ویسٹ باسکٹ میں کانڈ کا کوئی ٹکڑا نہ تھا۔ سارے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا کہ بڑے صاحب کو کسی کام سے دور کا تعلق ہے۔

بڑے صاحب کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ بڑے اخلاق سے مجھے بٹھایا اور اتنی محبت سے میری روپوشی کا گلہ کرنے لگے کہ میں گھبرا گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی بڑے صاحب تھے جن کو ملنے کے لیے میں چار روز سفارت میں جوتے چٹھاتا پھرا تھا۔ دو روز ٹیلی فون بوتھ میں ایستادہ رہا تھا۔ اور ایک دن پی۔ ایس کی حضوری میں بیٹھا رہا تھا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی صاحب تھے جو بے حد معروف تھے، جنہیں بات سننے کی فرصت نہ تھی، بات کرنے کی فرصت نہ تھی۔

بڑے صاحب کو ملنے سے پہلے میں نے بارہا سوچا تھا کہ جب میں ان سے ملوں گا تو یہ کہوں گا وہ کہوں گا، لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھ میں ایک عجیب سا احساس جاگا۔ میں وہ ہوں جو سفیر صاحب سے مل رہا ہوں۔ ان سفیر صاحب سے مل رہا ہوں جنہیں ملنے کے متمنی ہفتوں سے باہر کے احاطے میں کھڑے چھوٹے صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور پھر صرف مل ہی نہیں بلکہ میری آمد پر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا ہے، میرے ہاتھ پر ان کے ہاتھ کا لمس ابھی تک گرم ہے۔



”آپ پی آئی اے میں حسینی صاحب کو ملیں۔ میں انہیں فون کر دوں گا“ جلد  
بنگ ہو جائے گی“ انشاء اللہ۔“ سفیر صاحب نے کہا۔

### میری طرف دیکھو

سفارت سے باہر نکلتے ہوئے میں نے اہل کاروں اور سائلوں پر حقارت بھری  
نگاہ ڈالی۔ ”اے لوگوں میری طرف دیکھو۔ میں وہ ہوں جو سفیر صاحب سے مل کر آیا  
ہے۔ میں وہ ہوں جس سے سفیر صاحب نے مصافحہ کیا ہے۔ بے شک میرا ہاتھ سونگھ کر  
دیکھ لو“ اس میں ابھی تک سفیر صاحب کے دست مبارک کی بو ہے۔ ہٹ جاؤ میرے  
راستے ہے ہٹ جاؤ۔ باادب با ملاحظہ ہو شیار۔“



## مسافر خانہ

مسافر خانے کی زندگی عجیب زندگی تھی۔ مسافر خانے کے فراخ کمروں، برآمدوں، سیڑھیوں اور گھجوں پر ہزاروں مسافر پڑے ہوئے تھے۔ زمین پر بستر لگائے، سرانے مٹلے بچھائے، ہاتھوں میں تسبیحیں لٹکائے ہزاروں مسافر مقیم تھے۔ عرب، مصری، افریقی، ایرانی، پاکستانی، انڈونیشی اور بھارتی ہر ملک کا آدمی موجود تھا۔

### کارواں سرائے

اگرچہ دیکھنے میں وہ مسافر خانہ معلوم نہیں ہوتا تھا کیوں کہ وہاں کسمپرسی کی کیفیت نہ تھی۔ اتنی بھیڑ کے باوجود وہاں انتظامات کے انہار لگے ہوئے تھے۔ لاکھوں مسافر دھڑا دھڑبے دریغ گندگی پھیلا رہے تھے لیکن کارکن اس قدر سرگرم تھے کہ منٹوں میں پھر سے جگہیں صاف کر کے رکھ دیتے اور حیران کن بات یہ تھی کہ کسی کارکن نے کبھی کسی مسافر سے نہیں کہا تھا کہ گندگی مت پھیلاؤ۔ وہ خاموشی سے آتے اور بات کیے بغیر صفائی کر دیتے۔ ان کی اس سرگرمی کار کو دیکھ کر تکلی مسافر کو یہ احساس نہ ہوتا تھا کہ اسے چھلکے، لفافے اور لٹریچریوں اور ادھر ادھر نہیں پھینکنا چاہیے جب کہ جگہ جگہ ڈسٹ بن دھرے ہوئے تھے۔

تاہم وہ مسافر خانہ صحیح معنوں میں کارواں سرائے تھا۔ کتابوں میں تذکرے ضرور پڑھے تھے لیکن اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اس سے پہلے میں نے زندگی بھر کبھی کارواں سرائے کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔

ہر دس بیس منٹ کے بعد سینکڑوں لوگوں کا قافلہ بستر اٹھائے، سوٹ کیس



لٹکائے مسافر خانے سے نکل کر نیچے میدان نما صحن میں جا بیٹھتا اور پھر بسوں میں لد کرنے جانے کہاں چلا جاتا۔

ہر دس بیس منٹ کے بعد مسافر خانے کے صدر دروازے سے سینکڑوں آدمیوں کا قافلہ داخل ہوتا اور میدان نما صحن میں آ بیٹھتا، پھر وہ اپنا اپنا سامان اٹھائے میڑھیاں چڑھ کر ان کمروں اور برآمدوں میں سما جاتے۔

آنے جانے والوں کا یہ تانتا ایک عجیب سا سماں پیدا کر رہا تھا۔

جس کمرے میں میں مقیم تھا، اس کا جغرافیہ صبح کچھ اور ہوتا، دوپہر کچھ اور شام کو کچھ اور۔ کبھی وہ ایرانیوں سے بھرا ہوتا کبھی بھوروں سے کبھی افریقیوں سے اور کبھی مصریوں سے۔ اکثر بار ایسا بھی ہوتا کہ جب میں ہاتھ روم سے واپس آتا تو اپنا کمرہ پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

وہاں میرے سوا شاید کوئی اور فرد اکیلا نہ تھا۔ لوگ ٹولیوں میں آتے تھے، ٹولیوں میں گھومتے تھے، ٹولیوں میں کھاتے تھے۔

## کھانا

کھانے کے اوقات پر عجیب سماں ہوتا تھا۔ کوئی بیٹھا بھنے پنے چبا رہا ہے، کوئی سوکھی ڈبل روٹی توڑ رہا ہے، کوئی روٹی پر چٹنی یا اچار رکھے ہوئے ہے۔ بیشتر لوگ تربوز سے روٹی کھاتے تھے۔ ایسے اہتمامی بندوبستی قافلے بھی مسافر خانے میں آ کر قیام کرتے تھے جو اپنا مٹی کا ساتھ لیے پھرتے تھے۔ ایسا قافلہ آ جاتا تو مسافر خانے کے اس کمرے کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ جس میں اسے قیام کے لیے جگہ ملتی۔ ان کے آتے ہی پلیٹیں چل پڑتیں۔ مرغ سے بھرے قاب پلاؤ کی طشتریاں حرکت میں آ جاتیں۔ اس وقت مجھے ایسے لگتا جیسے وہ مسافر خانہ نہ ہو بلکہ کوئی عالی شان ہوٹل ہو، جیسے ہم زائر نہ ہوں بلکہ پکٹرز ہوں۔

کھانے کے وقت میں مسافر خانے کے باہر لگے ہوئے کھوکھے پر جا کھڑا ہوتا۔ مجھے دیکھ کر کھوکھے والا ایک چھوٹی ڈبل روٹی نکالتا، اس کا پیٹ چاک کرتا اور اس میں ایک ابلا ہوا انڈا اور ایک ٹماٹر کاٹ کر بھر دیتا۔ پھر وہ اس پر نمک مرچ چھڑکتا اور اسے میرے ہاتھ میں تھما دیتا۔ یہی میرا ناشتہ تھا۔ یہی لچ تھا اور یہی ڈنر۔



## پاکستانی زائرین

کہتے ہیں پردیس میں کوئی فرد واحد نہ ہو لیکن پتہ نہیں کیسے مجھے فرد واحد ہونے میں ایسی لذت آرہی تھی کہ جواب نہیں۔ کوئی مجھے پوچھتا نہ تھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہ ہوتا تھا، کوئی مجھ سے بات نہیں کرتا تھا، نوکتا نہ تھا، دیکھتا نہ تھا، گنتا نہ تھا۔ کتنی آزادی تھی۔ کسی رابا مرا کارے نہ باشد۔

پہلے پہل میں نے سوچا تھا کہ کسی ایسے کمرے میں جا رہوں، جہاں پاکستانی مقیم ہوں۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں نے سارے مسافر خانے کا جائزہ لیا تھا۔ کرا کر اگھو ماتھا۔

آخر ایک کرا ایسا مل گیا جس میں پاکستانی مسافر بیٹھے تھے۔ پرلے کونے میں چند خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ دروازے کے عین درمیان میں چند مرد بیٹھے تھے۔ باقی کرا خالی پڑا تھا یعنی جہاں پچاس زائرین کے سونے کی جگہ تھی وہاں صرف دس زائر بیٹھے تھے۔ میں کمرے میں داخل ہونے لگا تو انہوں نے مجھے روک لیا۔

”کون ہو تم؟ کہاں جانا ہے؟ کس ملک کے ہو۔ ساتھ کوئی ہے یا اکیلے ہو۔ کیا یہاں ٹھہرو گے؟“

چاروں طرف سے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

## فرد واحد

پھر ایک صاحب بولے: ”میاں کسی اور کمرے میں جگہ ڈھونڈو یہ ریزرو کرا ہے۔ ایک ساعت کے لیے میری پاکستانیت جوش میں آگئی۔ جی چاہا کہ سینہ تان کر کھڑا ہو جاؤں۔ اور گرج کر کہوں ”تم مجھے روکنے والے کون ہو۔ دیکھ لوں گا میں تمہیں۔“ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ فرد واحد میرے اندر سے ابھرا۔ میرے کان میں بولا: ”بیوقوف کسمپرسی کی جنت چھوڑ کر اس کیوں، کس لیے اور کون کے دوزخ میں کیوں آتا ہے؟ پاگل ہے کیا؟“

پاکستانی زائرین کے کمرے کو دیکھنے کے بعد جب میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو کیا دیکھا ہوں کہ اس جنت میں تازہ پھول کھل گئے ہیں۔ تازہ نہریں بننے لگی ہیں اور چاروں طرف سے آوازیں آرہی ہیں۔ ”بادب با ملاحظہ فرد واحد تشریف لارہے



ہیں۔“

## لوٹ کا مال

مسافر خانے کی زندگی اس قدر رنگ و لہجیوں سے بھری ہوئی تھی کہ عام حالات میں کسی زائر کا جی نہ چاہتا کہ وہ اسے چھوڑ کر جائے۔ وقت یہ تھی کہ اس وقت ہر زائر جلد از جلد وطن پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ عزیزوں، رشتہ داروں اور دوستوں سے گھرے لگاؤ جو حج کے مقدس مصروفیت کی وجہ سے دب گئے تھے۔ پھر سے پھن اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ ادھ چھوڑی مصروفیات ذہنوں میں بھڑوں کی طرح بھوں بھوں کرنے لگیں۔ سلیم کے ابا کے سر پر یہ دھن سوار ہو گئی کہ کب وہ گھر پہنچے اور سلیم کی امی کو ان مقدس مصروفیتوں کا تذکرہ سنائے جو سر زمین حجاز میں انہوں نے بتائی تھیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ اڑ کر سلیم کی امی کے پاس پہنچیں اور اسے بتائیں کہ اس مقدس سر زمین کو چھوڑنے کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال سارے زائرین وطن پہنچنے کے لیے یوں بے قرار تھے جیسے ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے بعد چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اپنی گٹھڑیاں لے جائیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ زائر مال کی جگہ ثواب کی گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے تھے جو وہ حرمین سے لوٹ کر لائے تھے۔

ایک روز حرم شریف میں بیٹھے ہوئے میں نے ایک معمر میر صاحب سے پوچھا۔ میں نے کہا: ”میر صاحب آپ سارا دن نفل ہی پڑھتے رہتے ہیں۔“

## ستر لاکھ نمازیں

میر صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا بولے ”میاں آپ کو نہیں پتہ ایک رکعت نماز جو حرم شریف میں ادا کی جاتی ہے۔ ستر لاکھ رکعتوں کے برابر ہوتی ہے۔ ستر لاکھ رکعتیں پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔ میاں یہاں تو ثواب کی لوٹ پٹی ہوئی ہے، پھر ہم کیوں محروم رہیں“

میر صاحب کی بات سن کر چاہیے تو یہ تھا کہ میرے دل میں نفل پڑھنے کی خواہش پیدا ہوتی مگر ہوا یہ کہ مجھے خیال آیا کہ ایک آدمی باقاعدہ بلا ناغہ نمازیں پڑھے تو وہ سال میں ۱۸۲۵ نمازیں پڑھے گا اور ساٹھ سال میں ایک لاکھ نو ہزار پانچ سو نمازیں پڑھے گا۔ حرم شریف میں ایک رکعت نماز پڑھ لینے کے بعد مزید نمازیں پڑھنے کی



حاجت نہیں رہتی۔ خواجواہ ثواب کی بوجھل گٹھڑیاں اٹھائے پھرنے سے فائدہ؟ اس خیال کے آتے ہی میں اللہ کے کوشے کی طرف بھاگا تھا اور اس کے پھیرے لینے لگا تھا۔ مسافر خانے میں مقیم زائرین اپنا پیشعروت نمازیں پڑھنے، نفل ادا کرنے، تسبیح چلانے اور جلد از جلد وطن پہنچنے کے ذہنی فکر اور عملی تک و دو میں گزارتے تھے۔ سارا سارا دن وہ بحرِی اور ہوائی جہازوں کے دفتروں کے سامنے شیطان کی آنت سے لپے کیوں میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کھڑے کھسکیں چلاتے رہتے۔ ”سبحان اللہ، سبحان اللہ، سبحان اللہ، یا اللہ اس مصیبت سے نجات دلا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔“

پھر شام کو مسافر خانے میں پہنچ کر وہ نفل ادا کرنے میں وقت گزارتے۔ ”اللہ اکبر، یا اللہ نکال مجھے اس اندھیری کوٹھڑی سے۔ یا اللہ جہاز جلدی چلے۔ یا اللہ اس جہاز میں مجھے سیٹ مل جائے۔ اللہ اکبر۔ سبحان ربی.....“

پھر ہم سب پر ایک اور قیامت ٹوٹی تھی وہ یہ کہ ہم سب حاجی بن گئے تھے۔

### یا حاجی یا حاجی

گیارہ ذوالحجہ کو قربانی دینے کے بعد دفعتاً ”منیٰ کی ساری فضا یا حاجی یا حاجی کی آوازوں سے گونجنے لگی تھی۔

یہ آوازے سب سے پہلے ان مقامی لوگوں نے لگانے شروع کیے تھے جو قینچیاں اور استرے اٹھا کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور بازاروں، سڑکوں، راستوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے مکہ معظمہ اور منیٰ کے تمام ہر سی حجام بن کر بیٹھ گئے ہوں۔ آٹھ لاکھ زائرین کے بال کاٹنے ایک عظیم کاروبار تھا۔ عین ایک دن میں ایک کروڑ ریال کمانے کا موقع تھا۔

ان حجاموں نے زائرین کو متوجہ کرنے کے لیے یا حاجی یا حاجی کے آوازے لگانے شروع کیے تھے۔ پہلے تو میں حیران ہوا کہ یہ لوگ ہمارے ہیں چونکہ میرے ذہن میں یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ میں حاجی بن چکا ہوں۔

اس روز سے جدہ سے خروج تک جب بھی کوئی یا حاجی کہہ کر مجھے بلاتا تو میں ادھر ادھر دیکھنے لگتا کہ یا اللہ یہ شخص کسے پکار رہا ہے۔ پھر جب وہ قریب آ کر میرا بازو



پکڑ لیتا تو میں سمجھتا بے چارے کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

جدہ کے مسافر خانے میں قیام کے دوران میں نے بڑی کوشش کی کہ اپنے آپ کو یقین دلاؤں کہ میں نے حج کر لیا ہے اور اب میں حاجی ہوں۔

حج پر جانے سے پہلے میں اکثر دیکھا کرتا تھا کہ لوگ کس طرح عزیز و اقرباء کو حج پر روانہ ہوتے وقت الوداع کہنے آتے ہیں۔ ایک زائر کو رخصت کرنے کے لیے بیسیوں ہنگامہ بٹا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دل تقدیس بھرے جذبات سے دھڑکتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر پاکیزگی کے انبار لگ جاتے ہیں۔ زائر خشوع و خضوع اور سبحان اللہ۔ سب تعریف اللہ کے واسطے ہے کا سا انداز طاری کرنے میں شدت سے مصروف رہتے ہیں۔

پھر جب وہ حاجی بن کر لوٹتے ہیں تو ان کی آنکھ میں ایک فاتحانہ چمک ہوتی ہے جسے شکر الحمد للہ اور هذا من فضل ربی کا ورد بھی دھندلا نہیں سکتا۔ پھر گردنوں میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے ہیں۔ بغل گیریاں ہوتی ہیں۔ سینے سے سینے ملائے جاتے ہیں۔ تقدیس بھری نگاہوں سے حاجی صاحب کا طواف کیا جاتا ہے۔ قدموں پر پتھاور ہونے والی نظریں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔

اس منظر کو دیکھ کر بارہا میرا جی چاہا تھا کہ میں بھی کسی روز حاجی بن کر آؤں۔ حج پر جانے کی خواہش میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی لیکن حاجی بن کر آنے کی خواہش میرے دل میں ہمیشہ دبی ہوئی تھی۔

یقین جاتیے جدہ کے مسافر خانے میں میں نے بڑی کوشش کی کہ انداز میں وقار، پاکیزگی، تشکر اور آنکھ میں فاتحانہ چمک پیدا کروں۔ میں کئی ایک دن مشق کرتا رہا تاکہ واپسی پر مستند حاجی بن سکوں۔

### مستند حاجی

مسافر خانے میں دس روز کا قیام میرے لیے مستند حاجی بننے کا زریں موقع تھا۔ چونکہ قدرت جاچکے تھے اور میں اکیلا رہ گیا تھا۔ قدرت کے ساتھ آتا تو یقیناً "مجھے مستند حاجی بننے کا موقع نصیب نہ ہوتا۔"

میں نے کئی ایک بار قدرت کی واپسی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ دو بار عمرہ ادا کر کے آئے تھے اور ہم سب پھولوں اور کیمروں سے لیس ان کے خیر مقدم کے لیے



ایئرپورٹ پہنچے تھے۔ جہاز ہمارے سامنے اترا۔ مسافر باری باری باہر نکلے لیکن ان میں قدرت نہ تھی۔

آدھ گھنٹہ ہم ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ پھر ان کے پی۔ اے سے معلوم ہوا کہ وہ جہاز کے عقب سے گھوم کر وی آئی پی روم کے گرد لہبا چکر لگا کر انجینئرنگ شیڈ سے باہر نکل کر اپنی کار میں یوں چوروں کی طرح آ بیٹھے تھے جیسے عمرہ کر کے نہیں بلکہ سونا سمل کر کے آئے ہوں۔

بہر حال میں نے بڑی کوشش کی۔ دن رات کوشش کرتا رہا لیکن نہ تو مجھ میں مستند حاجی صاحب کا سا انداز پیدا ہوا نہ میں دل میں یہ یقین پیدا کر سکا کہ واقعی حج کر چکا ہوں۔

جب بھی میں اپنے دل میں یہ ایمان پیدا کرنے کی کوشش کرتا کہ میں حاجی ہوں تو مطاف میرے روبرو اکھڑا ہوتا۔ ”تو؟۔۔۔“ تو جو طواف کا ایک چکر بھی نہ لگا سکا۔ تو حاجی کیسے ہو سکتا ہے۔ ”ساتھ ہی حکیم سے تحقیر بھرے قہقہوں کی آواز آتی۔ پھر نورانی چہرے ابھرتے۔ انہوں نے ناک انگلیوں سے بند کیے ہوتے۔ ”لا حول ولا قوۃ۔ لا حول ولا قوۃ۔“

پھر حجرۃ العقبہ دانت نکالتا۔ ”مجھ سے پتھر کھا کے گیا ہے اور اب حاجی بننا چاہتا ہے۔“ پھر میری نگاہوں تلے خانہ خدا ابھرتا اور میں دیوانہ وار اس بھدے بے ڈھبے کوٹھے کی طرف بڑھتا۔ ”تو بتا تو کیوں نہیں بولتا۔ تو دلوں کا حال جانتا ہے تو میرا واحد گواہ ہے۔“ کوٹھے کے والی کے چہرے پر Divine unconcern کی ایک دبیز تہ چڑھ جاتی اور سنجیدگی سے وہ کہتا: ”ہم اس معاملے میں دخل نہیں دیں گے۔ یہ شریعت کا معاملہ ہے۔“

جدہ کے مسافر خانے میں کئی توپیدائشی حاجی تھے۔ وہ حج نہ بھی کرتے تو بھی حاجی ہی نظر آتے۔ کئی حاجی برتاؤ کی تکمیل کے لیے اپنے انداز میں آخری کلیاں ٹانگ رہے تھے۔ ابھی سے بتوں کی صورت حال اس امر کی شاہد تھی کہ وہ اپنے کو The chosen سمجھنے لگے ہیں۔

جس طرح ۱۶ سال کی ایک الہو کنواری سہاگ رات بسر کرنے کے بعد جب جاگتی ہے تو ساری دنیا کی طرف ”ہم جانتے ہیں“ کی سی نگاہ اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے۔ اسی



طرح مسافر خانے کے بیشتر حاجی ”ہم جانتے ہیں“ کی سی نگاہوں سے گرد و پیش کو دیکھ رہے تھے۔

## خروج

سفر صاحب کے کہنے کے مطابق جب میں حسینی صاحب سے ملنے کے لیے پی آئی اے کے دفتر میں گیا تو وہاں رنگ ہی اور تھا۔

اس سڑک پر تمام ایئر لائنز کے دفاتر تھے۔ ان دفتروں کے سامنے مسافروں کی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ کئی دنوں سے ایئر لائنز کے سامنے مارے مارے پھر رہے تھے۔ گھنٹوں قطار میں کھڑے ہونے کے بعد لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوتا۔ بنگ کے متعلق شام کو چار بجے اعلان کیا جائے گا۔ شام کو چار بجے پھر بھیڑ لگ جاتی اور گھنٹے کے بعد اعلان ہوتا کہ پلین کی روانگی کل پر ملتوی ہو گئی ہے، صبح نو بجے معلومات حاصل کریں۔

ایئر سروس کے دفتروں میں، سمندری جہازوں کے بنگ آفسوں میں، ہوائی اڈوں اور بندرگاہ پر لوگوں کے ٹھٹھ لگے تھے۔ وہ سب حسرت زدہ نگاہوں سے ہر جاتے ہوئے شپ اور پلین کی طرف دیکھتے اور آہیں بھرتے اور پھر آسمان کی طرف دیکھتے، ”یا اللہ تو رحیم ہے کار ساز ہے، ہماری مشکل آسان کر!“

بیس دن پہلے جب یہی لوگ اس سرزمین پر اترے تھے تو وہ دعائیں مانگ رہے تھے ”یا اللہ ہماری مشکل آسان کر!“ وہ انتظار کرتے کرتے اکتا چکے تھے۔ انہیں صرف ایک دھن لگی تھی کہ پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر وطن پہنچ جائیں۔

## ہٹ جاؤ

۲۶ مارچ کو جب ایئر پورٹ کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا کہ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو وے پر کھڑے جہاز میں اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھیں۔ اس وقت لاؤنج میں سینکڑوں لوگ حسرت زدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

میری چھاتی تن گئی، گردن اکڑ گئی، ہٹ جاؤ باادب بالملاحظہ، میں ان میں سے ہوں، جن کی سیٹ بک ہو چکی ہے، جن کا ایر و پلین مختصر ہے، میں وہ خوش قسمت فرد ہوں جو اس ”مصیبت“ سے چھٹکارا پا چکا ہے اور اپنے وطن کو عازم ہے۔



پھر جہاز میں بیٹھے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ”جب میں پنڈی پہنچوں گا تو ایک جم غفیر میرے استقبال کے لیے منتظر ہو گا۔ لوگ میری بلائیں لیں گے۔ میرے ہاتھ چو میں گے۔ میرے پلو کو آنکھوں سے لگائیں گے۔ مجھ پر پھول پتیوں کی بارش کریں گے۔ میری گردن ہاروں سے لد جائے گی۔ یا حاجی، یا حاجی!“

پھر زندگی بھر لوگ ”یا حاجی“ کی زیارت کو آیا کریں گے اور محفل میں بیٹھ کر میں کھنکار کر کہوں گا ”سبحان اللہ، سبحان اللہ کیا سماں تھا۔ نور ہی نور، نور ہی نور“ اور جب ہم اس پاک سر زمین سے واپس آنے لگے تو ہماری آنکھوں سے اشک رواں تھے اور دل جدائی کے غم سے نڈھال تھے۔“

Handwritten notes in Urdu script, mostly illegible due to fading and bleed-through from the reverse side of the page.



## خروج

جو نہی طیارہ فضا میں ابھرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے وہ کھڑی ہے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پہلے تو میں حیران ہوا۔ یا اللہ یہ کونسی مخلوق ہے۔ گذشتہ اٹھارہ بیس دنوں میں کوئی عورت میری نگاہ سے نہیں گزری تھی۔

### سنڈیاں ہی سنڈیاں

ویسے زائرین میں لاکھوں کی تعداد میں عورتیں تھیں۔ حرمین میں 'منیٰ میں' عرفات میں 'بازاروں میں' سڑکوں پر ہزاروں عورتیں تھیں لیکن انہیں دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ عورتیں ہیں۔ وہ بذات خود بھولی بیٹھی تھیں کہ وہ عورتیں ہیں۔ انہوں نے اپنا ازلی مشن "میری طرف دیکھو" میں عورت ہوں "تیاگ رکھا تھا۔ سرزمین حجاز پر قدم رکھتے ہی نہ جانے انہیں کیا ہوا تھا۔ گویا بھڑوں میں نہ تو ڈنک رہا تھا اور نہ بھوں بھوں کرنے کی صلاحیت۔ پتہ نہیں کس قانون کے تحت بھڑ پھر سے سنڈیوں میں بدل گئے تھے۔ لاکھوں سنڈیاں سرزمین حجاز پر رنگ رہی تھیں۔

### گلیور اور بالشتیہ

بھوں بھوں کی آواز سن کر میں چونکا۔ یا اللہ یہ کیسی آواز ہے۔ سارا جہاز اس کی بھوں بھوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے سراٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ ڈنکوں کی ایک بوچھاڑ پڑی۔

اس وقت میری کیفیت گلیور کی سی تھی۔ گلیور پاکیزگی کے رسوں سے بندھا



ہوا تھا اور وہ باہشتی تھی جو اپنی کمان سے ننھے تیر برسا رہی تھی۔ پھر ایک عجیب کایا پلٹ عمل میں آئی۔ پاکیزگی کے وہ رے جن سے میرا بند بند بندا ہوا تھا ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ ان کے ٹوٹتے ہی گلیوں سے لگا لگا سکتا ہی چلا گیا اور باہشتی پھیلنے لگی، پھیلتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ میں باہشتیہ میں بدل کر رہ گیا۔ اور وہ گلیوں بن کر سارے جہاز پر چھا گئی۔

وہ بھرے بھرے جسم کی ٹین ایجر لڑکی تھی۔ چہرے پر بلا کی شگفتہ شوخی تھی، تازگی تھی، چستی تھی۔ آنکھوں میں لگاوت تھی۔ وہ لڑکی ایئر ہوسٹس تھی۔ اس نے سکرٹ پہن رکھی تھی۔ سکرٹ کے اوپر کی قیض مردانہ تھی اور بہت ہی مختصر تھی۔

### گوریاں

ظاہر تھا کہ وہ میم ہے۔ لباس اور انداز میں میم ہی میم رچی بسی تھی۔ بلا کی گوری تھی لیکن اس کا گورا پن میموں سے ہٹ کر تھا۔ مجھے میم کا گورا پن بالکل پسند نہیں۔ پتہ نہیں کیوں۔ خاتون سراسر گوری ہو تو جتنی گوری ہوگی اتنے ہی جسم کے مسامات ڈھیلے ہوں گے۔ پنڈے کو کس کر رکھنے والی طنابوں میں پکڑ نہیں ہوگی۔ اسی وجہ سے میموں کے جسم پھس پھسے ہوتے ہیں۔ وہ گوری ہونے کے باوجود پھسپھی نہیں تھی۔

میں اسی کی جانب دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ میں بھول گیا کہ کہاں سے آیا ہوں، کہاں جا رہا ہوں۔

دفعتا میں چونکا۔ مجھے یاد آیا کہ میں توجج کرنے کے بعد وطن لوٹ رہا ہوں۔

### عرب میم

ارے میں گھبرا گیا۔ یہ پی آئی اے کا جہاز تو نہیں۔ ایئر ہوسٹسز، سٹیورڈز، سب کے سب غیر ملکی تھے۔ صاحب اور میمیں۔ میری بکنگ تو پی آئی اے میں ہوئی تھی۔ شاید میں غلطی سے کسی اور جہاز میں بیٹھ گیا ہوں۔

پھر میری نگاہ اپنے ہمراہیوں پر پڑی۔ ہائیں یہ تو سب کے سب حاجی ہیں۔ میرے اللہ کیا ہم اتنے سارے لوگ غلط جہاز پر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔

”کیا یہ پی آئی اے کا جہاز ہے؟“ میں نے پہلو میں بیٹھے ہوئے ہمراہی سے



پوچھا۔ وہ مسکرایا، بولا ”نہیں“

”تو پھر“ میں نے گھبرا کر پوچھا ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ”یہ طیارہ سعودی ایئرویز کا ہے۔ پی آئی اے کے پاس کوئی اپنا طیارہ نہ تھا، رش زیادہ تھا اس لیے انہوں نے سعودی ایئر لائنز کے چار ایک طیارے چارٹر کر رکھے ہیں۔“

”اوہ“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”لیکن طیارے کا سٹاف تو یورپین دکھتا ہے۔“

”اونہوں“ وہ تسبیح چلاتے ہوئے بولے ”عرب۔ عرب۔“

”عرب؟“ میں نے حیرت سے دہرایا اور پھر ان جانے میں سوچے سمجھے بنا میرے منہ سے وہ بات نکل گئی جو میں بڑی کوشش سے دبائے بیٹھا تھا۔ ”مگر یہ ایئر ہوسٹس“

ہمراہی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ”لا حول ولا قوۃ“ کہہ کر وہ مجھ سے پرے ہٹ گیا۔ دیر تک میں کھیانہ اور شرمندہ ہو کر چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دل ہی دل میں اپنے آپ پر نفرین بھیجتا رہا کہ میں ایسے فاسد خیالات میں کیوں الجھ گیا۔ دیر تک میں توبہ کرتا رہا لیکن توبہ کرتے ہوئے بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ سارا جہاز اس عرب ہوسٹس سے بھرا ہوا ہے۔

خیر اور شر

پھر مجھے خیال آیا کہ میں اسے کسی فاسد خیال سے تو نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں صرف مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس میں ہوس کا عنصر نہ تھا۔

ایک روز میں نے قدرت سے پوچھا ”یہ جو اللہ والے لوگ ہوتے ہیں، یہ عورت سے کیوں گھبراتے ہیں۔“

”زیادہ تر بزرگ تو عورتوں سے ملتے ہی نہیں۔ ان کے دربار میں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ وہ بولے۔

”سر راہ چلتے ہوئے کوئی عورت نظر آ جائے تو وہ گھبرا کر سر جھکا لیتے ہیں۔ ان



کی اس گھبراہٹ میں خوف کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ عورت سے ڈرتے کیوں ہیں؟“  
 ”شاید وہ اپنے آپ سے ڈرتے ہیں۔“ قدرت نے کہا۔  
 ”لیکن وہ تو اپنے آپ پر قابو پا چکے ہوتے ہیں، اپنی میں کو فنا کر چکے ہوتے ہیں۔“

”اپنے آپ پر جتنا زیادہ قابو پا لو اتنا ہی بے قابو ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔“  
 ”آپ کا مطلب ہے شر کا عنصر کبھی پورے طور پر فنا نہیں ہوتا؟“  
 ”شر کا عنصر پورے طور پر فنا ہو جائے تو نیکی کا وجود ہی نہ رہے۔ چراغ کے جلنے کے لیے پس منظر میں اندھیرا ضروری ہے۔“

”میں نہیں سمجھا۔ مجھے ان جملوں سے کتاب اور دانشوری کی بو آتی ہے۔“  
 ”انسان میں جوں جوں نیکی کی صلاحیت بڑھتی ہے توں توں ساتھ ساتھ شرکی ترغیب بڑھتی ہے۔ شرکی ترغیب نہ بڑھے تو نیکی کی صلاحیت بڑھ نہیں سکتی۔“  
 ”سیدھی بات کیوں نہیں کرتے آپ۔“

قدرت میری طرف دیکھنے لگے۔  
 ”کہ تمام قوت کا منبع شر ہے۔ نیکی میں قوت کا عنصر نہیں۔ اللہ کے بندوں کا کام ٹرانسفارمر جیسا ہے۔ شرکی قوت کا رخ نیکی کی طرف موڑ دو۔“  
 ”شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں۔“ قدرت نے جواب دیا۔

”آپ اپنے بیان میں شاید کی کلی کیوں ٹانگ دیتے ہیں۔“  
 وہ مسکرائے ”اس لیے کہ علم کل صرف اللہ کی ذات ہے۔“  
 ”وہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ان اللہ والوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو عورت کے چیلنج کو قبول کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ میل جول سے نہیں گھبراتے۔ عورت سے قوت مستعار لیتے ہیں اور پھر اسے اللہ کی طرف لگا دیتے ہیں۔“  
 ”کیا مطلب“ وہ بولے۔

”کتنی ہیرا پھیری ہے کہ کوئلے جنس سے مستعار لو اور ان پر روٹی پکاؤ اللہ کی۔“ قدرت قہقہہ مار کر ہنسے۔  
 ”آپ کا بھی تو یہی و طیرہ ہے۔“

”میں“ وہ چونکے۔ ”میں نہ تم میں نہ تیرہ میں“ میری بات چھوڑیے۔“



”میں ایک ایسے درویش کو جانتا ہوں جنہوں نے زندگی بھر شادی نہ کی۔ ان کا یہ دستور تھا کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے ہیرا منڈی جاتے، کسی کو بک کرتے۔ عالم برہنگی میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھ جاتے۔ جب خواہش اپنی شدت کی انتہا پر جا پہنچتی تو وہ اللہ کی طرف دھیان موڑ لیتے جسمانی خواہش ختم ہو کر قلب میں ڈھل جاتی پھر وہ الحمد للہ کا ورد کرتے ہوئے چوبارے سے اتر آتے۔“

”یہ تیرے پر اسرار بندے۔“ قدرت مسکرائے۔

### وہ خاموشی یہ خاموشی

میں نے طیارے میں بیٹھے ہوئے زائرین کی طرف دیکھا وہ سب خاموش تھے۔ اس روز جب ہم طیارے میں بیٹھ کر کراچی سے جدہ جا رہے تھے اس روز بھی طیارے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

وہ خاموشی اس خاموشی سے کس قدر مختلف تھی۔ اس خاموشی میں امید تھی۔ تقدس تھا۔ اس خاموشی میں اضطراب تھا۔ ہوس تھی۔ وہ خاموش اللہ کے حضور میں حاضری دینے کے شوق سے بھری ہوئی تھی۔ اس خاموشی میں کچھ پانے کی تمنا تھی، اس خاموشی میں پالینے کا زعم تھا۔

ان کے چہروں پر خوشی کی سرخی تھی کہ کب کراچی پہنچیں، حاجیوں کی گاڑی میں بیٹھیں۔ گاڑی ہر سٹیشن پر رکے۔ پلیٹ فارم پر ہجوم ہو، لوگ ان کی زیارت کے لیے بے تاب ہوں۔ عوام ان کی طرف مسرت سے دیکھیں، ان کے ہاتھ چومیں، بلائیں لیں، تقدس بھری نگاہیں انہیں گھیرے رکھیں۔ گردنیں پھولوں سے لد جائیں، منہ زبانی اظہارِ عجز کے باوجود وہ تقدس کے تحت پر بیٹھ جائیں، مور و محلیں حرکت میں آجائیں۔

جہاز چلتا رہا، چلتا رہا۔

ایئر ہوسٹس چھائی رہی، چھائی رہی۔

زائرؤں کے دل دھڑکتے رہے دھڑکتے رہے حتیٰ کہ کپتان کی انگریز نما آواز گونجی۔ پیٹیاں باندھ لو، سگریٹ بجا دو، ہم کراچی ایئرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔

زائرین کی باچھیں کھل گئیں۔

بیک، لوٹے، کمبل، ٹوکریاں بازوؤں تلے لٹکنے لگے۔ الحمد للہ الحمد للہ الحمد للہ کی



سرگوشیاں گونجیں۔

جہاز رک گیا۔ جہاز سے اتر کر ہمیں قاتلوں سے بنے ہوئے ایک وسیع احاطے میں لے جایا گیا۔ لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہو رہا تھا۔ ”یہاں اپنے سامان کا انتظار فرمائیں۔“

منوجی مہاراج

جوں ہی زائرین نے کراچی ایئرپورٹ کے اس احاطے میں قدم رکھا۔ دفعتاً ایک کایا پلٹ عمل میں آئی۔

حج پر روانہ ہونے کے وقت جب ہم نے کراچی کو خیرباد کہا تھا تو زائرین نے اپنے اپنے عمدے، سماجی مقام، اپنی اپنی حیثیت، ذات پات سب امتیازات تمنغے، طرے اور سندیں اتار پھینکے تھے اور سب نے زائر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

پندرہ بیس دن سر زمین حجاز پر کوئی صاحب نہ تھا، کوئی سرمایہ دار نہ تھا، کوئی سید نہ تھا، کوئی آقا نہ تھا۔ وہاں صرف اللہ تھا اور اس کا رسول تھا اور باقی بندے ہی بندے۔ وہاں مفلس و محتاج و غنی سب ایک تھے۔

واپسی پر کراچی ایئرپورٹ پر قدم رکھتے ہی گویا منوجی مہاراج نے اپنا منتر پھونکا اور حاجیوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔

کسی نے چھاتی پر اتنا بڑا تمنغہ لگا لیا اور چھاتی تن گئی۔ کسی نے گردن پر وہی پرانا کلف لگا لیا اور گردن اکڑ گئی۔ کوئی صاحب بن کر انگریزی اکنٹ (Accent) میں سبحان اللہ، سبحان اللہ کرنے لگا۔ کوئی سید بن کر واڑھی میں خلال کرنے لگا۔ کسی کو دفعتاً یاد آ گیا کہ ارے میں تو کلرک ہوں اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ کوئی تن کر وی آئی پی بن گیا۔

اس کایا پلٹ کے بعد احاطے میں گلیور اور بالشتیے تھے، برہمن تھے، شودر تھے، حاکم تھے، محکوم تھے، نہ کوئی زائر تھا نہ حاجی۔

دھند لگا

احاطے میں پہنچ کر میں یوں ڈھیر ہو کر گر پڑا۔ جیسے غبارے سے پھونک نکل جائے تو وہ چھپھڑا بن کر رہ جاتا ہے۔



گذشتہ بیس دن سرزمین حجاز پر اپنے نمائشی عجز کے باوجود میں ایڑیاں اٹھا کر چلتا پھرتا رہا تھا۔ کیوں نہ ایڑیاں اٹھا کر چلتا، میں سعودی حکومت کے خصوصی مہمان کا ساتھی تھا۔ میرے لیے پاش ہوٹلوں میں کمرہ ریزرو تھا۔ وردی میں ملبوس بیرے میرے ارد گرد لیس سرسیر سر کرتے پھرتے تھے۔

پھر مسجد نبویؐ میں میں حضور اعلیٰؐ کے ایک ادنیٰ غلام کی معیت میں داخل ہوتا تھا۔ یہ حیثیت کوئی معمولی حیثیت نہ تھی۔ پھر جدہ میں مجھے سفیر صاحب سے ہاتھ ملانے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

کراچی پہنچ کر دفعتاً اپنی اوقات یاد آگئی۔ گرد و پیش پر ایک دھند لگا چھا گیا۔

## روشنی کی کرن

پھر اس دھند لکے میں ایک کرن سی چمکی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کرن نے ایک متبسم دل کش شکل اختیار کر لی اور وہ میرے رو برو کھڑی ہو گئی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ بڑے خلوص سے مسکرائی۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”کہئے تو میں آپ کو گھر پہنچا دوں۔ نہیں نہیں تکلیف کی بات نہیں، مجھے دلی راحت ہوگی۔“

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ذہن میں دھند کے انہار لگے ہوئے تھے۔ زبان کسی شیلاٹ کی طرح خلاء میں ٹنگی ہوئی تھی۔ احساسات شل ہو رہے تھے۔

پھر ایک گلابی ہاتھ میری طرف بڑھا۔ اچھا اچھا، خدا حافظ۔ اس دوستانہ مگر رنگین ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ایک تبسم چمکا اور وہ چلی گئی۔ میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ گو زندگی بھر میری تمنا رہی کہ کوئی خوبصورت خاتون مجھ سے بات کرے، ہاتھ ملانے۔ لیکن اگر کبھی یہ واقعہ عمل میں آ جائے تو میرے پسینے چھوٹ جایا کرتے ہیں۔

سوتا جاگتا

پھر ایک اتنی لمبی کالی سیاہ کار احاطے کے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ دو



باوردی افراد لپکے۔ ایک نے دروازہ کھولا۔ دوسرے نے فرشی سلام کیا اور وہی خاتون کار میں سوار ہو گئیں اور کار آواز پیدا کیے بغیر روانہ ہو گئی۔  
”ارے“ میں چونک کر بیدار ہو گیا۔

اس وقت میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں سوتا جاگتا ابو الحسن تھا جو ایک ساعت قبل الٹی بنا ہوتا دوسری ساعت ابو الحسن۔

”ارے“ میں نے سوچا ”اس اتنی لمبی سیاہ کار والی نے تو مجھ سے ہاتھ ملایا تھا‘ میرا شکریہ ادا کیا۔“ میں نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا، وہ لمس پھر سے جاگنے لگا۔ ”یا اللہ میں کون ہوں۔ ضرور میں کوئی بڑا آدمی ہوں ورنہ وہ محترمہ میرا شکریہ ادا کیوں کرتی۔ مجھ سے ہاتھ کیوں ملاتی۔ ہاں ہاں میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔“  
ارے، دفعتاً ”مجھے خیال آیا“ یہ وہ محترمہ خاتون تو نہیں تھی جسے میں جدہ کے سفیر کے گھر سے کراچی ساتھ لایا تھا۔“

سفر کے دوران میں نے اس خاتون کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ اگر وہ ایئر ہوٹل سفر کے دوران میں مجھے بائیس نہ بنا دیتی اور خود Sphinx بن کر میری منوں پر نہ چھا جاتی تو یقیناً ”میں اس خاتون کے وجود سے بے نیاز نہ ہوتا۔“

”کھودیا کھودیا“ میں نے سوچا ”اور کچھ نہیں تو اسے کہہ کر اپنا سامان ہی چھڑا لیتا۔“ ”کیو“ میں بیٹھنے کے عذاب سے بچ جاتا۔ کسٹم کے افسروں کی رعونت سے جان چھوٹ جاتی۔ کھودیا کھودیا۔“

سونا ہی سونا

پھر میں اپنی باری کے انتظار میں سامان سامنے رکھے زمین پر بیٹھا تھا۔ بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا۔

پھر کسٹم کا ایک افسر مجھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

”یہ آپ کا سامان ہے؟“

”جی“

”کیا کیا ہے اس میں؟“

”سامان ہے۔“



”سونا لائے ہو؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے سوچے سمجھے بنا کہہ دیا۔

وہ مسکرایا۔ ”کتنا ہے؟“

”ارے یہ میں نے کیا کہہ دیا۔“ میں گھبرا گیا۔

افسر رازدارانہ انداز سے بولا۔ ”مجھ سے کہہ دیجئے آپس کی بات ہے۔“

”جی“ میں نے کہا۔

”کتنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت ہے۔“ میں نے کہا۔

”کتنے تولے؟“

”تولوں ماشوں میں نہیں۔“

”تو پھر؟“

”اتنا سونا لایا ہوں کہ حد و حساب نہیں۔“

”سامان میں ہے؟“

”اونسوں۔۔۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کہاں ہے؟“

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”یہاں۔“ سونا دو ٹا کوئی نہ تھا لیکن اب بات کو

نبھانا جو تھا۔

ہیشٹ

عین اس وقت لاؤڈ سپیکروں سے اعلان ہوا۔ ممتاز مفتی اگر آگئے ہوں تو  
معلومات کے خیمے میں آجائیں۔

ایک ساعت کے لیے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا، مجھے بھلا کون جانتا ہے  
یہاں۔ کسی کو میرے آنے کی اطلاع بھی تو نہیں۔

کوئی پھر سے اعلان دہرا رہا تھا۔

ارے واقعی میرا نام پکارا جا رہا ہے۔ میری گردن اکڑ گئی۔ کشم کا افسر سٹوکر  
یا لٹیا بن گیا۔ گلیور نے اس کی طرف تسخربھری نگاہ سے دیکھا۔ ”دیکھا ہم وہ سونا لانے







## جتنوں دی کھوتی

کراچی پہنچے ہی وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ بجلی کا کرنٹ جس نے مجھے بلب کی طرح روشن کر رکھا تھا کٹ گیا۔ بیس دن اس جذبہ سے سرشار ماحول نے میری جبلت کی کڑوی گولی پر شکر کا جو کونٹنگ کر رکھا تھا وہ اتر گیا۔ منع اترنے کے بعد نیچے کا ہسپتال اتر آیا۔ پھر وہی کراچی تھی وہی میں تھا۔ مور کے پر اترنے کے بعد کالا کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔

### کوے اور ہنس راج

اس روز پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ میرا وطن کالے کوؤں کی آماجگاہ ہے۔ سب کائیں کائیں کر رہے تھے۔ سب میں میں کی رٹ لگا رہے تھے۔ اگر آپ یک دم "تو" سے "میں" پر گر جائیں تو ذہن کو ایک دم دھچکا ضرور لگتا ہے۔ اس دھچکے سے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے میں نے وہی طریقہ کار اپنا لیا جو چوہا ہلی کی آمد پر اپناتا ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بے شک گرد و پیش کوؤں سے بھرا ہے، بے شک بسھی "میں میں" کی تسبیح کر رہے ہیں لیکن میں کو انہیں ہوں، میں تو حاجی ہوں جو نوازا گیا ہے، جس کی تمام آلائشیں داخل چکی ہیں، جو قابل تعظیم ہیں۔

"لوگو! آؤ، دیکھو یہ تمہارے سامنے کون کھڑا ہے۔ اس کی عظمت کو تسلیم کرو، اس کے مرتبے کو پہچانو، اس کے ہاتھ چومو۔ یہ وہ ہاتھ ہیں جنہیں سبز جھنگے کو تھامنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان میں خانہ خدا کی دیواروں کے لمس کی خوشبو باقی ہے۔ یہ ہاتھ آنکھوں سے لگاؤ۔"

پھر جو میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو وہاں کوے نہیں تھے بلکہ کیرے کھوڑے ریگ رہے تھے اور ان کے درمیان میں یوں کھڑا تھا جیسے ہنس راج ہو۔



منکر

قیصر جس کے پاس میں ٹھہرا تھا میری عظمت تسلیم کرنے سے قطعی منکر تھا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ میں کون تھا کہاں سے آیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں وہی ممتاز مفتی ہوں جو بیس روز پہلے بازار میں کھڑا اس کے ساتھ چاٹ کھا رہا تھا۔ اسے یہ شعور ہی نہ تھا کہ میں مکہ مدینہ سے آیا ہوں۔ وہ میرے ساتھ ایسا سلوک کر رہا تھا۔ جیسے میں سر زمین حجاز سے نہیں بلکہ چھو کی ملیاں سے ہو کر آیا تھا۔ البتہ اس کی بیگم جے کی نگاہوں میں عقیدت اور احترام کی جھلک ضرور تھی اور ان کی بیٹی ارم تو جذبے کی شدت سے بے حال ہو رہی تھی۔

”اچھا تو انکل آپ نے خانہ خدا کے پھیرے لیے تھے؟“

”آپ نے سنگ اسود کو چوما تھا؟“

”آپ نے مسجد نبویؐ میں سبز چنگے کو بوسہ دیا تھا؟“

وہ سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔ اور ہر مثبت جواب پر خوشی سے گویا پاگل ہو جاتی۔ ہنستی تالی بجاتی۔ آنکھوں میں شرارے پھوٹتے۔ پھر قیصر کوئی عمومی بات کہہ کر سارا مزا کر کر اکر دیتا چلو یا ر چل کر چاٹ کھائیں۔ اسے اتنا شعور نہیں تھا کہ معزز لوگ بازار میں کھڑے ہو کر چاٹ نہیں کھایا کرتے۔

قیصر کے رویے نے میرا کراچی میں رکنا دو بھر کر دیا۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً ”گھر چلا جاؤں۔ لیکن اگر گھر والوں نے بھی مجھ سے یہی سلوک کیا تو۔“

حاجی سیشل

اخبار میں یہ خبر پڑھ کر کہ اسی روز کراچی سے ایک حاجی سیشل ٹرین چل رہی ہے۔ میرا حاجی چاہا کہ میں ہوائی جہاز کی بجائے ریل گاڑی سے اسلام آباد جاؤں۔ مجھے کئی بار حاجی سیشل ٹرین دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ گاڑی میں نورانی شکلوں والے بوڑھے بیٹھے تسبیح میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر عجیب سی روشنی ہوتی ہے۔ انداز میں بے پایاں سکون اور ٹھہراؤ ہوتا ہے۔

یہ سیشل ٹرین ہر بڑے شیشن پر رکتی ہے۔ ہر بڑے شیشن کے پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ وہ عقیدت بھرے اضطراب بھرے شوق سے حاجی کا انتظار کر



رہے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار ہوتے ہیں۔ ہونٹوں پر سبحان اللہ ہوتا ہے۔ دل اسلامی جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔

جب گاڑی پلیٹ فارم پر رکتی ہے تو اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونجتی ہے۔ پھر لوگ ہار باہوں پر لٹکائے ڈبوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ڈبوں کی کھڑکیوں سے نورانی چہرے جھانکتے ہیں۔ لوگ حاجیوں کے ہاتھ چومتے ہیں۔ ان کی بلائیں لیتے ہیں۔ ان کے روبرو سر جھکا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی لفظ جو ان کے منہ سے نکلے اسے یوں دل کی ڈبیا میں رکھ لیتے ہیں جیسے وہ موتی ہو۔

پیشل ٹرین میں سفر کرنے والے حاجیوں کو کھانے پینے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بیشتر سٹیشنوں پر لوگ دیکھیں دیکھیں لپے منتظر ہوتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ حاجیوں کی خدمت کریں۔ جنہیں خود حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوتی وہ ان کی زیارت کو نیم حاضری سمجھتے ہیں۔

میراجی چاہتا تھا کہ میں صبح پیشل میں سفر کروں۔ لوگ میرے ہاتھ چومیں۔ میرے منہ سے نکلے ہوئے لفظ کو موتی سمجھ کر رکھ لیں۔ میری بلائیں لیں، میری آؤ بھگت کریں۔ لیکن مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ قیصر کو کہتا۔

## جذبے کی راب

جو کہہ دیتا تو قیصر قہقہہ مار کر ہنس پڑتا اور مجھے شرمساری ہوتی۔ قیصر جذبہ کو قابل تحسین چیز نہیں سمجھتا۔ وہ ایک عملی آدمی ہے اس کا کہنا ہے کہ مسلمان کو جذبہ لے ڈوبا ہے۔ جذبہ عمل، کام اور جدوجہد کے راستے میں ایک عظیم رکاوٹ ہے۔ قیصر کے خیال کے مطابق سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ وہ کام جو تمہیں سونپا گیا ہے۔ اسے دل لگا کر کرو، جان مار کر کرو، خوش اسلوبی شوق اور اہتمام سے کرو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیانت سے کرو۔

میں نے ڈرتے ڈرتے قیصر سے کہا۔ ”میں نے کہا چلو یار سٹیشن پر چل کر حج پیشل کو دیکھیں۔“

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”حج پیشل تو گاڑھے جذبہ کی راب ہوتی ہے۔ اس میں ڈوب جاؤ تو کسی کام کے نہیں رہتے۔ لوگ اپنے جذبے کی راب سے حاجیوں کو



لت ہت کر دیتے ہیں۔ ان میں عظمت کا ایک جھوٹا احساس جگا دیتے ہیں، انہیں بندے سے بت بنا دیتے ہیں، ان کی انا کو پھر سے استوار کر دیتے ہیں۔ نہیں ہم اسٹیشن پر نہیں جائیں گے۔“

اس کے بعد میراجی چاہتا تھا کہ ابھی طیارے پر سوار ہو کر گھر جا پہنچوں۔ قبصر کی رفاقت میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

جیسے ویسے لوٹے

جب ٹکٹ کنفرم کرانے کے لیے ہم پی آئی اے کے دفتر پہنچے تو وہاں چند ایک دوست مل گئے۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا۔

”اچھا تو حاجی صاحب تشریف لے آئے۔“ ایک بولا۔

دوسرا کہنے لگا۔ ”نہیں ان پر تہمت نہ لگاؤ۔ یہ تو غالباً“ دوہنی گئے تھے۔ حج پر گئے ہوتے تو چہرے پر یہ ہوس تہمت ہوتی۔“

”ہوس تو نہیں“ تیسرے نے کہا ”رندی ہے“ وہی پرانا رندانہ انداز ہے۔“

”جیسے ویسے ہی لوٹ آئے“ ایک نے قہقہہ مارا۔ ”جسموں دی کھوتی اوتھے آن کھوتی۔“ ابن انشاء ان میں پیش پیش تھے۔ بولے۔ ”مفتی جی وہ آپ کی اتنی لمبی داڑھی کیا ہوئی، ہم نے تو سنا تھا کہ مفتی جی بالکل بدل گئے ہیں، داڑھی رکھ لی ہے، تہجد پڑھتے ہیں، ولایت سے نوازے جانے کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے، ہم تو ڈر گئے تھے لیکن شکر ہے اللہ کا کہ جیسے تھے ویسے ہی لوٹ آئے، بچپن میں کوئی نیک عمل کیے ہوں گے جن کے صلے میں خطرہ ٹل گیا۔“

میں نے کراچی سے روانگی کی خبر کسی کو نہ دی تھی لیکن جب میرا طیارہ اسلام آباد پہنچا اور میں باہر نکلا تو پیرزادہ راجہ نور محمد وانی آغا سبھی وہاں موجود تھے، انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ میری گردن ہاروں سے لد گئی۔ پیرزادہ نے ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ کا نعرہ لگایا اور پھر اپنا کیمرا نکال کر میری تصویریں کھینچنے لگا۔ اس اہتمام پر خوشی کی ایک لہر دل میں دوڑ گئی۔ دل بلیوں اچھلا لیکن مجھے محسوس ہونے لگا کہ بات نہیں بنی، اہتمام تو تھا، پھولوں کے ہار بھی تھے، مسکراہٹوں بھرا خیر مقدم بھی تھا لیکن وہ تقدیس بھرا احترام نہ تھا۔ میں نے کئی بار بہانے بہانے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن کسی نے اسے نہ چوما۔ کوئی سینے



پر ہاتھ باندھ کر میرے روبرو کھڑا نہ ہوا۔ کسی نے میری بات کو موتی سمجھ کر نہ اٹھایا، کسی نے سبحان اللہ سبحان اللہ نہ کہا۔ مجھے شک پڑنے لگا کہ وہ جانتے ہیں کہ میں جیسا گیا تھا ویسا واپس آ گیا ہوں۔ مجھے محسوس ہونے لگا جیسے وہ درپردہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔

وحید پیرزادہ نے وہی ابن انشاء والی بات دہرائی، بولا ”آپ نے داڑھی کیوں منڈوا دی، اسے رہنے دیتے کیا حرج تھا۔“

”کون سی داڑھی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو آپ نے سر زمین حجاز پر رکھی تھی۔ شہاب صاحب کہتے تھے، آپ

نے داڑھی رکھ لی ہے، چہرہ نورانی ہو گیا ہے انہوں نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا۔“

”ہم تو سمجھے تھے کہ ایک دوست ہاتھ سے گیا لیکن الحمد للہ کہ کوئی خطرہ

نہیں۔“ راجہ نے کہا۔

جب میں گھر پہنچا تو اقبال بولی۔ ”آگے، چلو اچھا ہوا جیسے گئے تھے ویسے ہی آ

گئے۔“

اقبال کٹر قسم کی مسلمان خاتون ہے وہ جذبے کے اظہار کو اچھا نہیں سمجھتی۔

اس کے نزدیک دنیا داری کو دیانت سے بھانا اسلام کا سب سے بڑا مطالبہ ہے۔“

وہی ممتاز مفتی

میرا خیال تھا کہ میری آمد کی خبر سن کر محلے والے آئیں گے، لیکن کوئی بھی نہ

آیا انہیں علم ہی نہ تھا کہ میں حج پر گیا ہوا تھا۔

محلے والوں، گھر والوں اور دوستوں کی سرد مہری کی وجہ سے میرا دل بیٹھ گیا۔

اور وہ حاجی جسے میں بڑی امید اور امنگ سے اپنے ساتھ لایا تھا، عزیزوں کی سرد مہری کی

وجہ سے سک سک کر دم توڑ گیا، اس کا یہ انجام دیکھ کر میں نے انتقاماً ”اسی پرانے

بوسیدہ غلیظ ممتاز مفتی کو نکالا اور اپنے آپ پر طاری کر لیا۔

وہ شیشے ہائے سے کشی  
کہ مصلحت اسی میں تھی



جنہیں وہیں پڑے پڑے  
وہیں کی خاک کھا گئی

پھر ان کو دھو رہا ہوں میں  
یہ کیا بنا رہا ہوں میں

نہیں نہیں

ہاں کبھی کبھار۔ اکیلے میں، جب زندگی اک اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے تو ایک کالا بے ڈھب کوٹھا سا ابھرتا ہے اور وہ آکر چاروں طرف سے مجھے گھیر لیتا ہے۔ پھر وہ میرے گرد گھومتا ہے، گھومے جاتا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے کہہ رہا ہو۔ ”آؤ“ ایک بار پھر آکر میرے گرد گھومو۔ ایک بار پھر میرے گرد پھیرے لو۔ کب آؤ گے ہم انتظار کر رہے ہیں۔“

”نہیں نہیں میں چیخ کر اٹھ بھاگتا ہوں، میں نہیں آؤں گا، میں پھیرے نہیں لوں گا۔“

”مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے پھر حاضر ہو کر پھیرے لیے تو میں کبھی واپس نہیں آؤں گا بلکہ وہیں ابد تک یوں گھومتا رہوں گا جیسے خلا کا سیارہ ہو۔“

”نہیں نہیں میں پھر نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا، میں لذت پرست نہیں بنوں گا۔“

”کالے کوٹھے کے گرد پھیرے لیتا“ سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں، کوئی نشہ نہیں، کوئی کیف نہیں۔



## تعارف

(۱)

ممتاز مفتی ایوان ادب کا سربر آوردہ رکن ہے۔ اس نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ وہ تلخ و شیریں سے دو چار ہوا ہے۔ مختلف النوع تجربات کے الاؤ سے گزرا ہے۔ اس نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو افسانہ اور ناول کے واسطے سے قارئین تک پہنچایا ہے۔ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں اس کا ایک غالب تصور ہے۔ باغی اور بت شکن کا تصور، ایک ایسا لکھنے والا جس نے زندگی کے چرے پر پڑے دبیز پردوں کو چاک کر کے اصلیت کی مسلسل تلاش کی ہے۔ معاشرتی رویوں پر چڑھے منافقت کے لبادوں کو تار تار کیا ہے، کبھی طنز و مزاح کے ہتھیار سے اور کبھی متضاد واقعات، خیالات اور محسوسات کو فن کارانہ سیاق و سباق مہیا کر کے۔

بظاہر یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے مگر ہے امر واقعہ۔ ممتاز جذباتی و فکری سنج پر جتنا باغی ہے، اظہار کے پیرائے میں وہ اتنا ہی روایت کا پاسدار ہے۔ اس کی نثر میں ہمارے بلند پایہ نثر نگاروں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کے نعروں کے آہنگ کے پیچھے تو اتنا روایت جھلکتی ہے۔ اس کی تحریروں میں ایک ایسی لے ہے جو اپنی باطنی قوت کے ذریعے قاری کے رد عمل کے اتار چڑھاؤ کو متعین کرتی ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کا صنایع ہے اور واقعات و خیالات کو جوڑ اور گوندھ کر نامیاتی کل تیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ



باریک ترین جزئیات ہیئت و قیام کا جزو لاینک بن جاتی ہیں، اس کے ہاں استعاروں اور تشبیہوں کی نوعیت زیادہ تر بھری ہے۔ یہی وجہ ہے وہ زندگی کی کمافی صرف بیان نہیں کرتا بلکہ اس کی تصویریں بھی دکھاتا ہے۔ ان میں رنگ بھرتا ہے۔ کہیں گہرا کہیں ہلکا۔ اس کے رنگوں میں قوس و قزح کی سی دل کشی اور جامعیت ہے۔

رپورٹاژ ”لبیک“ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ممتاز کی صناعی پہلے کی طرح اب بھی تابناک ہے۔ نثر میں زور ہے، لے کا زیر و بم ہے، مشاہدہ کی ہمہ گیریت ہے، ہیئت گری کا شعف برابر قائم ہے۔ جزری کا رجحان بھی جاری ہے مگر فن کے اس جادو کے پیچھے کار فرما نقطہ نظر میں زبردست تبدیلی آچکی ہے۔ میں سب سے پہلے اس تبدیلی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ اس کا تعلق ایک اہم فکری مسئلہ سے ہے۔

زندگی ایک جھمیلا ہے۔ بھول بھلیاں۔ کوئی ایک گلی کا اسیر، کوئی دو سری گلی میں گم۔ سب کو راستے کی تلاش ہے۔ باہر نکلنے کا راستہ۔ ایسے مقام کی جستجو جہاں پر کھڑے ہو کر زندگی کے اسرار کا مکمل مشاہدہ کیا جاسکے مگر سب راستے مسدود لگتے ہیں۔ مطالعہ، مشاہدے اور تجربے کی بنا پر برسوں بعد آدمی کو ایک ہیوٹی نظر آتا ہے اور وہ اس تک پہنچنے کے لیے ایک راہ وضع کرتا ہے۔ چلتے چلتے ہیوٹی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی راہ بھی گم۔ برسوں کی ریاضت سے ادراک کے دائرے میں آنے والی حقیقت واہمہ میں بدل جاتی ہے۔ تاریکی ہی تاریکی! اور پھر گھپ اندھیرے میں روشنی کا کوندا۔ از سر نو تلاش کا سفر!! کیا معلوم اس کا نتیجہ بھی مختلف نہ ہو۔ شاید زندگی واہموں کا دھارا ہے۔ جو بالاخر موت کے ساکت سمندر میں جاگرتا ہے۔

مگر ممتاز مفتی کا انداز نظر منفی کبھی نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ مثبت باتوں اور رویوں پر زور دیتا رہا ہے۔ وہ آنکھوں کی پلکوں اور تخیل کی انگلیوں سے ہمیشہ حقیقت کا متلاشی رہا ہے، تلاش اور رجائیت سے اس کی افتاد طبع کا صحیح سراغ ملتا ہے۔ اس لیے جب ایسے شخص کا استوار کیا ہوا حقیقت کا مینار گرتا ہے تو وہ مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک اور مینار کھڑا کرتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ممتاز مفتی حقیقت کے مینار کو منہدم کر کے نور کا مینار استوار کرنے میں مصروف ہے۔ ”لبیک“ اسی تخریب و تعمیر کا رپورٹاژ ہے۔ ممتاز کے لہجہ میں



بیک وقت احساس شکست بھی ہے اور احساس فتح مندی بھی، ناسیلمیا اور فیٹسی کا دلچسپ امتزاج!

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز مفتی کا دو سرا سفر کب شروع ہوا؟ مگر ایک قاری کی حیثیت سے مجھے سب سے پہلے اس وقت جھٹکا لگا جب میری نظر سے وہ مضمون گزرا جو اس نے چند برس قبل شہاب کے افسانوں کے مجموعہ "ماں جی" کی تعارفیہ تقریب کے موقع پر پڑھا تھا۔ اور پھر میں نے اپنی یادداشت کو ٹولا۔ قیاس ہے کہ اس میں یہ تبدیلی ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ شروع ہوئی۔

زیر نظر رپورٹاژ کے ایک حصہ میں ممتاز نے ان مصنفین کا ذکر کیا ہے جن کے زیر اثر اس کی طبیعت میں بغاوت کا جذبہ پروان چڑھا اور اس نے ہر روایتی ڈھانچے کو بشمول مذہب کے، شک کی نظر سے دیکھا۔ مگر یہ ذکر سرسری ہے۔ رپورٹاژ اصل میں معرفت کے اس دروازے سے متعلق ہے جو اس کے دوسرے سفر کا نقطہ آغاز ہے۔ اس سفر میں اسے کیا ہاتھ لگا؟ میں چند نکات کی شکل میں درج کرتا ہوں:

موجودات کی کثرت محض وحدت کا پردہ ہے۔

وحدت حقیقت ہے اور کثرت بھول بھلیاں۔

وحدت تک رسائی وجدان کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ عقل صرف بھول

بھلیوں میں کھو کر رہ جاتی ہے۔

معروف اور معلوم کا احاطہ قابل یقین حد تک تنگ ہے۔ نہ معلوم اور

پر اسرار حقیقت وسیع و عریض ہے۔

اسرار کا پتہ چلانا ہر کس و ناکس کے اختیار میں نہیں۔ اس سلسلے میں نور کا

سب سے بڑا مینار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

اس نور سے اخذ فیض کرنے والے لوگ معدودے چند ہیں جو دنیا میں ہمیشہ

موجود رہتے ہیں۔

ان میں مراتب کا ایک سلسلہ ہے اور ان میں سے ہر ایک کے پاس حسب

مرتبہ ابلاغ کا ایک واسطہ ہے۔ یہ واسطہ تصوفانہ ریاضت کا ثمر ہے۔ چنیدہ لوگوں کا یہ

گروہ خدا سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے ان کا باطن زمانوں پر محیط

حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ مستقبل کے طراز ان کی نظر میں ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کا



ایک الوہی رول ہے جس کے باعث وہ عصری واقعات کے بہاؤ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے جاہل، بے خبر اور اندھے عوام الناس میں ان کے طرف کے مطابق روشنی اور فیض بانٹتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب انہیں لوگوں میں سے ایک ہے۔

رپورٹاژ میں شہاب کی شبیہ بار بار ابھاری گئی ہے۔ وہ ربانی بے نیازی کا مجسمہ ہے مگر حال کی کیفیت میں اسرار کے بوجھ تلے شیشے کی طرح تڑخ جاتا ہے، اپنے آپ کو چھپاتا پھرتا ہے۔ صرف دو شخص دانائے راز ہیں، ممتاز مفتی اور ڈاکٹر عفت! مندرجہ بالا نکات بڑی حد تک اس تصور حیات کی نفی کرتے ہیں جس کی ترسیل ممتاز نے اپنے فن کے ذریعے گذشتہ تقریباً "تیس برسوں سے کی ہے۔ یہ علیحدہ موضوع ہے اور نہایت دلچسپ۔ میں اس سے قطع نظر کر کے سردست ممتاز کے نسبتاً "نئے زاویہ نگاہ کے مضمرات پر توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔

سترھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی تک۔ یہ زمانہ انسانی تاریخ کا وہ حصہ ہے جس میں زیادہ تر سائنس پر تکیہ کیا گیا ہے۔ مایوسیوں اور محرومیوں کے باوجود مجموعی طور پر رجائیت اور اعتماد کی فضا برابر قائم رہی ہے، یہ بجائے اور اس فضا میں خوف اور عدم تحفظ کے گھنے بادل بھی اٹھ آئے ہیں، موت کے سائے بھی در آئے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تعمیر و تخریب کا کائناتی ابدی تنویر کھل نہ ہوتی۔ مگر تخریب کے عمل کو تخلیق کے عمل کے خلاف بطور دلیل کے نہیں برتا جاسکتا۔ انسان نے عقل و خرد کے سرچشموں سے فیض یاب ہو کر کائنات میں جاری و ساری تخلیقی اصول سے حیرت انگیز ہم آہنگی حاصل کر لی ہے اور وہ کائنات کی وسعتوں میں پھیل رہا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ علم کی روشنی سے سب کچھ منور ہو گیا ہے یا ہو جائے گا۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سائنس کا علم جتنا وسیع ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اسے اپنی کم مائیگی کی احساس ہوتا ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ کائنات روز بروز انسان کی توقعات سے زیادہ وسیع نکلتی ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ کائنات ایک ناختم ہونے والے تخلیقی عمل سے گزر رہی ہے۔ جب تک سائنس دان پرانے روپوں سے واقف ہوتا ہے۔ نئے روپ دو گئے ہو جاتے ہیں۔ اقبال تو خود انسان کو اس تخلیقی عمل میں حصہ دار بتاتا ہے۔



جدید سائنس کی دریافتوں کا دائرہ کتنا محدود ہے اس کو بیان کرنے کے لیے میں  
کو نسل کے خوبصورت جملے کا سہارا لیتا ہوں:

"Modern Scientists are peeping toms at the keyhole  
of eternity"

وجدان کو عقل کا ہر اول دستہ کہا جانا چاہیے نہ کہ اس کا نعم البدل!  
وجدان کے مسخر علاقوں پر جب تک خرد کے خیمے نصب نہ ہوں۔ مبہم اور معاشرتی  
طور پر غیر متعلق رہتے ہیں۔ عقل کی نفی کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہم اپنے آپ  
کو وجدان کے فیض کا نااہل بنا لیں اور زندگی کو 'کم از کم اپنے لیے' انفرادی اور  
اجتماعی سطح پر منجمد کر دیں۔ حرکت اور تبدیلی سے منہ موڑ لیں اور یوں تاریخی  
طاقتوں سے منقطع ہو کر زندگی کے دائم رواں دواں قافلے سے جدا ہو جائیں۔ ایسی  
جدائی کا عذاب ہم نے طویل عرصے تک جھیلا ہے۔ یہ واقعہ بے سبب نہیں کہ ہجر و  
فراق کا موضوع ہمارے ادب میں اتنا حاوی رہا ہے۔ دل چاہتا ہے اب وصل کی  
باتیں ہوں۔ وصل کے پسند نہیں؟ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہم نے اس کے لیے  
حسرت زیادہ پائی اور کوشش کم کی ہے اور

لیس الانسان الا ما سعى!

جب سے نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کیا ہے 'خدا کی تلاش مشرق و  
مغرب میں تیز ہو گئی ہے۔ اس ضمن میں تمام علمی کاوشوں کا نتیجہ غالباً "یہ ہے کہ  
خدا کی تلاش کا موثر ترین ذریعہ کائنات میں جاری و ساری تخلیقی اصول سے ہم  
آہنگی ہے تاکہ تخلیق کا عمل زیادہ بھرپور ہو سکے اور موت کے راستے مسدود کیے جا  
سکیں۔ یہ فعل اجتماعی نوعیت کا ہے اور اس کے لیے فرد کے پیرا نارمل  
(Paranormal) تجربات اور محسوسات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات تو  
قابل فہم ہے کہ افراد اپنے شعور یا اپنی بصیرت کی وسعت یا تنگدستی کی بنا پر کم مرتبہ  
یا بلند مرتبہ ہوتے ہیں۔ مگر ان کو پر اسرار محسوسات کے حوالے سے درجوں میں  
تقسیم کرنا اور زندگی کی پوری ڈگر کو ان کا مرہون منت قرار دینا کہاں تک صحت  
مندروید ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر یہ کوئی اہم بات نہیں، میری سمجھ میں تو  
چھوٹے چھوٹے معاملے نہیں آتے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسانیت کا معتد بہ حصہ



اس رویے کو سمجھنے سے قاصر ہے، کم از کم تعلیم یافتہ اور روشن خیال انسانیت کا معتد بہ حصہ۔

مجھے خدشہ ہے کہ اس کی خواہشات اور ارادوں کے برعکس اس معاملے میں ممتاز مفتی کا انداز فکر ایسے اداروں کے لیے باعث تقویت ہے جن کا کردار ہمیشہ سے عوام کے لیے گمراہ کن رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آخری تجزیے میں اس انداز فکر کے ڈانڈے (Priesthood) کے اس تصور سے جا ملتے ہیں جو اسلام کی روح کے منافی ہے اور جس کے خلاف اسلامی مفکرین نے مسلسل جہاد کیا ہے۔ اس جملہ معترضہ کے بعد "لبیک" کے ایک منفرد پہلو کا ذکر کرتا ہوں۔

ممتاز مفتی نے جس خوبصورتی سے اللہ اور رسولؐ کی افسانوی تشکیل پیش کی ہے اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ گو ممتاز نے مقامات مقدسہ سے متعلق تفصیلات اور عبادات کی جزئیات رپورٹاژ میں سمودی ہیں تاہم اس کا ارتکاز اس داخلی تجربہ پر ہے جس میں سے تمام زائرین گزرتے ہیں۔ ایک تو پورے اجتماع کے اعتقاد کی خارجی تصویر ہے، دوسرے اس تعلق خاطر کی تصویر ہے جو زائرین حسب توفیق اللہ اور رسولؐ سے ایمانی اور جذباتی سطح پر محسوس کرتے ہیں، اس تجربے میں سینکڑوں درجے ہیں اور ممتاز نے بڑی چابکدستی سے ان کا نقشہ کھینچا ہے۔ روضہ نبویؐ اور حرم شریف کو رپورٹاژ میں تخلیقی پیکر کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو باہمی کشش سے ایک دوسرے کی طرف حرکت کر کے اس نقطہ ساکت (Still point) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس کے ارد گرد دلوں کی دھڑکنوں اور زمانوں کے سمٹتے، پھلتے دائرے ہیں۔ ان دائروں کے اندر مختلف تاریخی ادوار ہیں اور مختلف رنگ و نسل کے لوگ ایک ہی نوع کے تجربے سے گزرتے ہوئے اسلامی یگانگت اور مساوات کی دہلیز پر نظر آتے ہیں۔ ممتاز نے داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے تجربے اور مشاہدے کا ایک جہاں پیدا کیا ہے۔ جس میں سانس لیتے ہوئے عجیب سرشاری کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔

جذب و ایمان کے ان دائروں کے باہر زندگی کا حقیقی رنگ بھی نظر آتا ہے۔ حرص و لالچ کے بازار، نفس و نفسی کا عالم، نفس پرستی کے مناظر اور سب سے بڑھ کر مغربی تہذیب کے اثرات جن سے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی مقدس



سرزمین کی رعنائی اور اصلیت مسخ ہو گئی ہے۔

گو مجھے "لبیک" میں مضمون بعض فکری مباحث سے شدید اختلاف ہے تاہم فنی نقطہ نظر سے اس رپورٹاژ کی اس تاثر سے انکار کرنا کفر ہو گا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے حج کے بارے میں اس سے زیادہ بامعنی، فکر انگیز اور فن کارانہ رپورٹاژ اردو میں نہیں لکھا گیا۔ اس صنف کی ذیل میں ہمارے ہاں جو قلیل ائمہ ہے ممتاز مفتی نے اس میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

نذیر احمد



(۲)

”لبیک“ -- ممتاز مفتی کا رپورٹاژ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی اشاعت کی داستان تو آپ قاسم محمود کی زبانی سنیں گے۔ میں تو ایک مشتاق اور منتظر قاری کی طرح اس کی قسطیں سیارہ ڈائجسٹ میں پڑھتا رہا ہوں۔ پھر جب اس کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو مجھے اس کا مسودہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس لیے کہ مفتی صاحب نے مجھے اس کا دیباچہ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ سرتابی کی مجال نہیں تھی ورنہ مجھے اب تک علم نہیں کہ اس کام کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا گیا۔

مفتی صاحب کا یہ رپورٹاژ پیچیدہ، تہہ در تہہ اور پردہ در پردہ معانی کی ایک ایسی اوڈیسی ہے جس کی مثال کم از کم میرے سامنے نہیں ہے۔ ویسے معلوم نہیں کیوں مفتی صاحب کو حجابات، پردوں اور تہوں سے اتنی دلچسپی ہے۔ آپ جانتے ہیں ان کے ایک مجموعے کا نام ”پہاڑ کے چھلکے“ ہے۔

پہلے ممتاز مفتی اپنے قلم کی تیز نوک سے نفس انسانی کے پہاڑ سے چھلکا چھلکا اتار کر اس کا درون دیکھنے کے شوق میں جھلتا تھے۔ اب ان کے شغف میں ذرا سی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور آج کل وہ روح انسانی پر سے مرئی اور غیر مرئی پردے اتار کر پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے راز کو فاش کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

کرید، تلاش، جستجو، مجھوب کو عریاں کرنے کی خواہش، چھپے ہوئے کو فاش کرنے کی آرزو، پوشیدہ کو ظاہر میں لانے کی تمنا مفتی صاحب کی فطرت میں یوں موجود ہے جیسے پانی میں نمی -- یہ تحقیق اور جستجو یوں تو شاید ہر انسان کی سرشت کا حصہ ہے کہ میرے خیال میں زندگی کا بنیادی جوہر یہی ہے، لیکن بعض لوگوں کے ضمیر میں یہ عنصر معمول سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو تین محفوظ



سمتوں کی جانب سفر کرنے کی بجائے چوتھی سمت کی طرف جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے ہی سرپھرے لوگوں میں ایک ممتاز مفتی ہیں جو چوتھی سمت کے سفر میں اپنے پیروں کے ٹکڑے لہولہان کر رہے ہیں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مفتی صاحب اچھا بھلا افسانہ لکھتے لکھتے اب قلمی شعبہ بازی پر اتر آئے ہیں۔ چونکہ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا اس لیے انہوں نے لوگوں کو من گھڑت قصے اور مافوق الفطرت کہانیاں سنانی شروع کر دی ہیں۔ کچھ اصحاب تو یہ بھی کہتے ہیں کہ بڑھاپے میں مفتی صاحب اب تخلیقی طور پر بانجھ ہو چکے ہیں، اب وہ محض اپنی تخلیقی حس کی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ ان چھ میگوئیوں کا آغاز اس وقت ہوا جب ”سوریا“ میں مفتی صاحب کا ایک مضمون ”میں اور میرے اللہ میاں“ شائع ہوا۔ ذاتی طور پر مجھے ان آراء سے اختلاف ہے۔ میں تخلیقی حاصل کی کسی ٹھوس اور جامد شکل کا قائل نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ مفتی صاحب جس راہ پر پہلے چل رہے تھے اسی پر گامزن ہیں۔ جس مشغلے میں وہ اب تک مشغول رہے ہیں اسی میں منہمک ہیں۔ انہیں تو شروع ہی سے پیاز سے چھلکے اتارنے کا شوق ہے اور وہ اب تک چھلکے اتارتے جا رہے ہیں، اگر کوئی فرق پڑا ہے تو محض اتنا کہ پہلے ان کے ہاتھ میں سرخ رنگ کا پیاز تھا، اب سفید رنگ کا ہے۔

ممتاز مفتی کا یہ رپورٹاژ پڑھ کر جانے مجھے قرآن پاک کی وہ تمثیل کیوں بار بار یاد آئی جس میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کے ایک عجوبہ سفر کا بیان رقم ہوا ہے۔ یہ داستان مجھے یوں بڑی مرغوب ہے کہ اس میں علم، تخیل اور عجز کے عناصر اس طرح باہم آمیز ہیں کہ عقلیں گنگ اور شعور شل ہو جاتے ہیں۔ ایسا اسرار، ایسی پردہ داری، ایسا حسن اور ایسا اعجاز۔۔۔۔۔ اس سفر کے دو مسافروں میں سے ایک جانتا ہے کہ اسے بتانے والے نے گزرے ہوئے اور آنے والے لمحوں کے اسرار سے آگاہی بخش رکھی ہے۔ وہ علم رکھتا ہے اور متین ہے۔۔۔۔۔ دوسرا نہیں جانتا اس لیے اس کے حصے میں تخیل آتا ہے۔ تخیل پے در پے سوالوں، معلوم کرنے اور جاننے کی شدید آرزو کو جنم دیتا ہے۔ خضرؑ کی متانت اور خموشی اور موسیٰؑ کا تخیل اور اضطراب جب اپنے انجام کو پہنچتے ہیں تو عجز و جود میں آتا ہے۔ عجز



اللہ کو بہت پسند ہے چنانچہ وہ بندے کو سکھانے کے لیے اسے بڑے چکر دیتا ہے۔ بندہ جو سوچتا ہے، جو کرتا ہے، جو کرنا چاہتا ہے، جس کے ارادے باندھتا ہے، وہ اسے زیر و زبر کر کے ایسی گھمن گھیری میں ڈالتا ہے کہ بندے کے سامنے عجز کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا۔ حضرت علیؑ نے کہا تھا:

”مجھے اپنے عزائم کی ناکامی سے اپنے رب کا عرفان حاصل ہوا ہے“

اس رپورتاژ میں بھی مجھے یوں لگا جیسے قدرت اللہ شہاب جانتے ہیں اور چپ ہیں۔ ممتاز مفتی استفسار کرتے ہیں اور مضطرب ہیں، جاننے اور معلوم کرنے کی خواہش انہیں ہرپل آتش زیر پا رکھتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ جا بجا اکھڑ جاتے ہیں۔ صبر و ضبط کا دامن ان کی گرفت سے بار بار نکل جاتا ہے اور وہ گلہ گزاری سے لے کر چاک دامانی تک اتر آتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر کبھی تو مجھے شہاب صاحب پر ترس آتا ہے کہ مفتی صاحب کی رفاقت نے انہیں کس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے اور کبھی ممتاز مفتی صاحب پر رحم آتا ہے کہ شہاب صاحب نے انہیں کیوں اس آتش وارفہ سے آشنا کر دیا جو انسان کے مکمل وجود کو خاکستر کر دینے پر قادر ہے۔ پھر کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے شہاب کو متوازن رکھنے کے لیے توازن دینے والے نے ممتاز مفتی کو ساتھ نتھی کر دیا ہے کہ کہیں شہاب صاحب بالکل ریزہ ریزہ نہ ہو جائیں کہیں ان کا وجود تحلیل نہ ہو جائے۔ پھر کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب جیسے مضطرب، متجسس اور چھلکے اتارنے کے شوقین کو قدرت اللہ شہاب صاحب کی ہر اہی اس لیے دی گئی ہے کہ انہیں علم، تحمل، عمق اور عجز کے معنی سمجھ میں آجائیں۔

اس کتاب میں قدرت اللہ شہاب کی تصویر ایک غیر معمولی انسان کی تصویر کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہے جن لوگوں نے شہاب صاحب کو دیکھا ہے، اور ہمارے ملک کے لاکھوں لوگوں نے انہیں دیکھا ہے، ان کے لیے یقیناً یہ تصویر اجنبی ہو گی۔ شہاب صاحب یہاں کسی سالک، کھلی آنکھوں والے اور روشن ضمیر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ ایک پرانے آئی۔ سی۔ ایس، ایک مقدر سابق سی۔ ایس۔ پی پاکستان کی بیورو کرسی کے ایک نہایت اہم اور فعال شخص کے بارے میں مفتی صاحب جو کچھ بیان کرتے ہیں اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یوں لگتا ہے



جیسے مفتی صاحب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان کا غیر معمولی انسان کے طور پر ایج بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسے ان کی نامعلوم نوازشات کا بدلہ چکانے کی سعی کر رہے ہوں۔ شہاب کو وہ بنا کر پیش کر رہے ہیں جو وہ نہیں ہیں یا نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔ مفتی صاحب کے بیانات پر بھلا کسے شک نہیں گزرے گا لیکن میں سوچتا ہوں کہ اس بات کا بھلا کسے پتہ کہ کون کیا ہے؟ اندر اور باہر کے راز کون جانتا ہے؟ کوٹ پتلون کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ خرقہ و عبا و قبا کے عقب میں کون مستور ہے۔ کے معلوم؟ ————— شہاب صاحب کے سلسلے میں مفتی صاحب جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ عجیب سی، غیر معمولی سی لیکن اس کی تردید کے لیے میرے اور آپ کے پاس کیا ہے۔ کیا صرف یہ کہ قدرت اللہ شہاب ”صاحب“ آدمی رہے ہیں۔

حکومت کے اہم اور معتمد کارندے تھے۔ انہیں کئی حکومتوں میں کلیدی عہدے حاصل رہے ہیں۔ انہیں حکومت کے کئی سربراہوں کا اعتماد میسر رہا ہے۔ کیا یہ ثبوت، یہ دلائل کافی ہیں کہ ان کے سہارے شہاب صاحب کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کی تردید کی جاسکے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ انسان، بلکہ انسان ہی کو لیں، اس کائنات کی ہر شے جو کچھ نظر آتی یا محسوس ہوتی ہے، اس کے سوا بھی بہت کچھ ہو سکتی ہے، اور ہوتی ہے۔

ویسے ان چار یاروں کی ٹولی ہے بھی بڑی طرفہ۔ مختلف مزاجوں، جدا جدا طبیعتوں والے ان چہار درویشوں کو میں نے جتنا دیکھا ہے، وہ میرے لیے حیران ہونے کا خاصا سامان رکھتا ہے۔ شہاب صاحب، اشفاق احمد، ابن انشا اور ممتاز مفتی۔ یہ منڈلی بڑی عجیب ہے دیکھیں تو چاروں میں کوئی قدر مشترک نہیں، مگر چاروں کی مثال مربع شکل کے ان چار کونوں کی ہے جو ایک دوسرے سے الگ الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے کو یوں تھامے ہوئے بھی ہیں کہ اسی تھام سے ان کا وجود قائم ہے۔ شہاب صاحب کے بارے میں ان کے تینوں دوستوں سے میں نے جو کچھ سنا اور پوچھا ہے وہ اپنی جگہ کمال کی چیز ہے۔ ان میں ہر ایک ان کے سلسلے میں الگ رائے رکھتا ہے۔ اشفاق احمد ویسے تو قائل ہیں کہ شہاب صاحب ایک پراسرار شخصیت ہیں اور اپنا آپ کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ وہ ان کے چند پوشیدہ:



پہلوؤں اور او جمل حصوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ وہ دوستی کے ناطے سے اپنے کچھ مشاہدات بھی بیان کرتے ہیں جو اتفاقاً ان کی نگہ کی زد میں آ گئے ہیں لیکن ان کے رویے میں ایک ٹھہراؤ، لا تعلق اور بے پروائی ہے۔ غالباً انہوں نے شہاب صاحب کی شخصیت کے ظاہر اور پوشیدہ پہلوؤں کے بارے میں ذہنی سمجھوتہ کر لیا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ شہاب صاحب کے پر توکی حدت سے بچے ہوئے ہیں ورنہ ان کا حشر بھی ممکن ہے مفتی صاحب جیسا ہوتا۔ ممتاز مفتی نے شہاب صاحب کو بے حد قریب سے دیکھا ہے۔ شاید اتفاقاً انہیں اس کا موقع زیادہ ملا ہے۔ وہ ان کے چشم دید گواہ ہیں۔ انہوں نے شہاب صاحب کے ایسے روپ آنکھوں سے دیکھے ہیں جو دوسروں پر ظاہر نہیں۔ لیکن اس دیدہ بازی میں ممتاز مفتی مارے گئے۔ وہ شہاب کی گہرائی، عمق اور اسرار کو سمجھنے کی کوشش میں مبتلا ہیں، وہ چھپے ہوئے کو چھو کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں بے نقاب دیکھنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے وہ بیک وقت اضطراب اور جھلاہٹ کا شکار ہیں۔ وہ پیاز سے چھلکا اتارنا چاہتے ہیں مگر غالباً یہ پیاز ان کے بس کی بات نہیں۔۔۔۔۔۔ پھر ابن انشا ہیں۔ شہاب صاحب کے بہت ہی قریبی دوست۔۔۔۔۔۔ رازدار اور غمگسار۔۔۔۔۔۔ ان سے ایک بار میں نے شہاب صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بڑی بے نیازی سے کہا:

”شہاب صاحب سے ہمارے دوستی اور وضع کی ہے، اشفاق اور ممتاز مفتی کی طرح مجھے ان کی شخصیت کے اس گوشے سے کوئی دلچسپی نہیں جس کے یہ دونوں عاشق ہیں۔ میں تو شہاب صاحب کو ایک خوبصورت اور مکمل انسان سمجھتا ہوں۔ میرے لیے یہی کافی ہے یوں بھی ان کے روحانی مراتب اور کمال کا محکمہ الگ ہے۔ اس سے ہمیں کچھ تعلق نہیں یا یوں کہئے کہ اس میں ہمیں درک نہیں۔ ممتاز مفتی کی طرح ہم ان مسائل کے غواص نہیں، ہونا بھی نہیں چاہتے، کپڑے بھگونا نہیں چاہتے۔ ساحل پر رہنا پسند کرتے ہیں، کئی بار قوی شبہ ہوا کہ شہاب صاحب جو کچھ نظر آتے ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ ضرور ہیں لیکن تحقیق و تجسس کی تکلیف کبھی گوارا نہیں کی۔“

میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ ابن انشا کا شہاب صاحب سے بالکل اور وضع



کا تعلق ہے۔ مگر اشفاق احمد اور مفتی صاحب ان کے رمز شناس ہونے کے باوجود عجیب رویہ رکھتے ہیں۔ اشفاق احمد تو اس لیے شہاب صاحب سے آنکھیں چراتے ہیں کہ کہیں ان کی شخصیت میں چھپے ہوئے آتش سوزاں کی کوئی آوارہ چنگاری ان کے خرمن کو بھی نہ پھونک ڈالے۔ ایک روز میں نے کہا:

”آپ تصوف‘ ماورائے نفیات اور مابعد اللیعات میں اتنی دلچسپی بھی لیتے ہیں‘ اور بے تحاشا پڑھتے بھی ہیں مگر آپ کے بقول آپ کا یہ شوق صرف اکیڈمک سطح تک ہی ہے۔ ذرا اس میدان میں اتر کر بھی دیکھیے۔ اتنی جرات نہیں۔ یا میں کم از کم فی الحال یہ جرات نہیں کر سکتا‘ میری مثال سینٹ آگسٹین کے اس قول کی سی ہے کہ

”God make me pious but not today”

ویسے اشفاق احمد‘ شہاب صاحب کے اثر سے زیادہ دیر تک بچ نہ سکیں گے وہ ایک روز اس سمت کا سفر اختیار کریں گے یا انہیں کرایا جائے گا۔ ویسے فی الحال میں دیکھتا ہوں کہ اشفاق احمد کی مثال اس بچے کی سی ہے جو بکری کے مہینے کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسے چنگیاں مارتے دیکھ کر اس پر فریفتہ ہوتا ہے لیکن اس کے قریب جانے کی‘ اسے چھونے کی جرات نہیں کرتا۔

یہ کتاب انہوں نے واقعات اور غیر معمولی مشاہدات سے بھری پڑی ہے۔ ایسے واقعات اور مشاہدات جو عقل کی گرفت میں نہیں آتے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ سائنس اور علم کے زیر اثر دماغوں کے لیے یہ باتیں ناقابل یقین ہوں گی حالانکہ یوں بھی سوچا جا سکتا ہے کہ آخر ہونا کیا اور انہونا کیا ہے \_\_\_\_\_ کے پتا؟ \_\_\_\_\_ کیا ہے اور کیا نہیں

\_\_\_\_\_ ہے اس کی دلیل کس کے پاس ہے؟ جو یہاں ہے وہ کہاں نہیں ہے اور جو یہاں نہیں وہ کہاں ہے؟ اس کا علم کسے میرے ہے؟

راولپنڈی کا مجذوب‘ چنیوٹ کا ایڈووکیٹ‘ مدینہ منورہ کی حمیدہ بیگم اور

بدر کا شہید۔ یہ سب لوگ ہیں۔ کیوں ہیں \_\_\_\_\_ ان سوالوں کا

جواب کس کے پاس ہے۔ ہمارے علم کی حدوں سے اگر ان کا تعلق نہیں قائم ہوتا

تو کیا ہمارے علم کی حدیں آخری حدیں ہیں۔ کیا ان حدوں سے آگے اور حدیں



نہیں ہو سکتیں۔ کیا ایک افق سے آگے اور افق نہیں ہو سکتے۔ میرا خیال ہے ہو سکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں۔ موسیٰ اور خضرؑ کی داستان ذرا پھر پڑھ کر دیکھیے، شاید عجز کی خوشبو ہمیں بھی چھو جائے۔

ویسے ذاتی طور پر سوچتا ہوں کہ ممتاز مفتی نے یہ رپورٹ لکھ کر اچھا نہیں کیا۔ انہوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے۔ جو کچھ ان کے محسوسات کی گرفت میں آیا ہے۔ جو کچھ انہیں بتایا گیا ہے۔ جو امانت انہیں سونپی گئی ہے۔ جس راز میں انہیں شریک کیا گیا ہے اسے یوں فاش بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ انہوں نے دیدار اور وصال کی واردات سینے میں رکھنے کی بجائے چوک میں لا کر سجادی ہے۔ ایسی باتیں جو چھپ چھپ کر کرنے والی تھی، جسے سرگوشی میں بتاتے ہوئے بھی ڈرنا چاہیے تھا، وہ انہوں نے چار کھونٹ نشر کر دی ہیں۔ اب ”نکلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں“ والی صورت پیش آئے تو کسی کا کیا قصور لیکن یہ قصور کا مسئلہ بھی خوب ہے۔ قصور کس کا ہے اور کس کا نہیں ہے؟

میں سوچتا ہوں کہ شاید جس کی تشہیر ہوئی ہے، وہ خود اپنی تشہیر کروانا چاہتا ہو۔ شاید وہ پردے میں رہتے رہتے اب تنگ آ گیا ہو۔ ورنہ مفتی صاحب کی کیا مجال کہ اس راز کو یوں افشا کرتے۔ یہ تو محض آلہ کار بن گئے۔ شاید اس لیے کہ وہ اور بہت کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ احسن الماقرین بھی تو ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ اس کتاب کی اشاعت سے مفتی صاحب کو ڈھیروں گالیاں پڑیں۔ ان پر فتوے لگیں۔ اس کتاب کو Ban کرنے کی سفارش کی جائے۔ ان میں سے کچھ بھی ہو یا سب کچھ ہو۔ مجھے ذرا تعجب نہ ہو گا کہ وہ ایسے تماشے خود ہی کرتا ہے اور خود ہی دیکھتا ہے، پتا نہیں اسے تماشے اتنے کیوں مرغوب ہیں۔ یہ جہان اس کا سارا کاروبار یہ ساری کائنات اور اس کی ہادہ تماشای تو ہے۔ دلچسپ، دلکش، خوف ناک، عقل کی بنیادیں ہلا دینے والا تماشہ۔ اور سب سے بڑے تماشے تو وہ ان کے بناتا ہے، جنہیں وہ بہت عزیز رکھتا ہے، نبیوں کے باپ سے کہتا ہے کہ ہونے والے نبی کے گلے پر چھری چلا دے۔ وہ چلاتا ہے تو اسے پچا بھی لیتا ہے۔ اپنی ایک جھلک کا ہلکا سا عکس دکھا کر موسیٰ کو پہاڑ بلاتا ہے اور اس کے سر پر نبوت کی گھنڑی رکھ دیتا ہے۔ موسیٰ لاکھ ہاتھ جوڑتے ہیں۔ واسطے دیتے ہیں۔ فریاد کرتے ہیں۔ مجھے



نبوت کی حاجت نہیں۔ میرے بھائی کو نبی بنا دے۔ مگر گنہروی انہی کے سر پر نکادی جاتی ہے۔ اپنے سب سے محبوب اور عزیز رسول کو طائف کے بھرے بازاروں میں لہولہان کرا دیتا ہے۔ دیکھا آپ نے کیسا تماشا گر ہے۔ مفتی صاحب پر افشائے راز کی تہمت بھی لگائی جائے تو کیونکر۔۔ مفتی صاحب کی کیا بساط کہ ایسی جرات کر سکتے۔

”لبیک“ ایک بے مثل کتاب ہے۔ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی انوکھی اور نادر کتاب ہے۔ یوں بھی کہ اسے ایک بے مثل انسان نے لکھا ہے۔ یہ انسان بھی انوکھا اور نادر ہے۔ یہ کتاب باہر سے اندر کی جانب سفر کی رو دا ہے۔ یہ حاضر کے زوج غائب کی تصویر ہے۔ یہ ظاہر کے ہمزاد باطن کی کہانی ہے۔ یہ ساتویں سمت کے سفر کی داستان ہے۔ جہاں زمان و مکان کی حدود اٹھ جاتی ہیں۔ یہ وقت اور زمانے کی کسی اور ہی Dimension کا قصہ ہے۔ یہ عشق اور سرمستی، محبت اور وصال کی حکایت ہے۔ وہ لوگ جو مائیکرو و ملی میٹر والے پیمانے، ٹیسٹ ٹیوبیں، مہذب شیشے اور ایئر ٹائٹ ترازو لے کر ہر شے کو جانچتے، پرکھتے اور سمجھتے ہیں انہیں ”فی الحال“ اس کتاب سے کچھ حاصل نہیں ہو گا کہ عالم موجود کے ساتھ ایک عالم مثال بھی ہے اور عالم مثال میں چیزیں عقل اور آلوں سے نہیں عشق ماڈر وجدان سے دیکھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ یہ اس دنیا کی کہانی ہے جہاں دل اور دماغ کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں۔ جہاں عقل اور خرد اور فکر و فلسفہ کے پر جلتے ہیں۔ ہاں جن کے باطن میں محبت کی کوئی ہلکی سی بھی چنگاری ہے جو دل اور دماغ کے آسیب سے کسی قدر بچے ہوئے ہیں جو محض علم کے اسیر نہیں ہیں ان کے لیے اس کتاب میں بہت کچھ ہے۔

ذوالفقار احمد تابش



# مشنق بک کارنر

الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور